ماہنامہ
حنا
عید نمبر
اکتوبر 2013

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامیات

انشاء نامہ

مکمل ناول

ناولٹ

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماھنامہ حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

قارئین کرام! اکتوبر 2013ء کا شمارہ بطور عیدالاضحیٰ نمبر پیش ہے۔

میری اور ادارہ حنا کی جناب سے آپ سب کو عیدالاضحیٰ مبارک ہو، یہ عید اس عظیم قربانی کی یاد میں منائی جاتی ہے، جو ابوالانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے راہ خدا میں پیش کی، یہ قربانی ہمیں اللہ کے راستے میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کا درس دیتی ہے، اللہ تعالیٰ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ عمل اس قدر پسند آیا کہ تمام مسلمانوں کے لئے اسے ایک مستقل سنت بنا دیا، خلوص ہر عمل کی کامیابی کی بنیادی شرط ہے، اپنی ذات سے ہٹ کر خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کیے گئے عمل ہی بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو قربان کیے گئے جانور کے گوشت اور خون کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ قربان کرنے والے کا خلوص ہی ہے جو بارگاہ الٰہی میں مقبول ٹھہرتا ہے، ایثار و قربانی کا یہ جذبہ ہی ہے جو ہمیں حقیقی خوشی عطا کرتا ہے، ہمارے ملک میں لاکھوں افراد ایسے ہیں جو آپ کی مدد کے منتظر ہیں، عیدالاضحیٰ کی خوشیوں میں انہیں ضرور یاد رکھیے گا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے دلوں کو ایثار و قربانی کے جذبوں سے منور کر دے اور ہم عیدالاضحیٰ کا تہوار اس کے اصل مفہوم کے ساتھ منا سکیں (آمین)۔

پشاور میں چرچ پر خودکش حملے کے اندوہناک سانحے میں بے گناہ جانوں کے زیاں پر پوری قوم غم زدہ ہے سارے ملک میں سوگ کا سماں ہے، سانحہ پشاور پر ذہن میں چند سوالات جنم لیتے ہیں، امن دشمن کون ہیں؟ ناحق خون بہانے کا یہ سلسلہ کب رکے گا؟ بے گناہوں کا خون بہانے والے یہ درندے کیا چاہتے ہیں؟ دنیا بھر میں پاکستان کو جو بدنام کیا جا رہا ہے اس میں کن طاقتوں کے مفادات ہیں؟ کیا یہ سانحہ طالبان کے ساتھ شروع ہونے والے مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کی کوشش تو نہیں؟ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی جان و مال کے تحفظ کا حکم رسول پاکؐ نے دیا ہے، جس کے لئے ہم سب پابند ہیں، سانحہ پشاور پر مسیحی برادری کے دکھ میں ہم سب برابر کے شریک ہیں، یہ ہم سب کا دکھ ہے۔

اس شمارے میں:۔ ایک دن حنا کے نام میں ملئے مصباح نوشین سے، سعدیہ عابد اور طیبہ ہاشمی کے مکمل ناول، سندس جبیں کا ناولٹ، سمیرا گل، ثمینہ شیخ، قرۃ العین رائے، رافعہ اعجاز، فرح طاہر قریشی اور کنول ریاض کے افسانے، اُم مریم اور فوزیہ غزل کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار محمود

حمد باری تعالیٰ

قریب ہے رگ جاں سے مگر دکھا نہ سکا
وہ دل میں آیا، سمجھ میں مگر سما نہ سکا

گناہ کا بوجھ ہے سر پر گرا ہوں سجدے میں
پڑا وہ بار مرے سر پہ کہ میں اٹھا نہ سکا

سمجھ میں آ نہیں سکتی حقیقت معبود
بشر تو اپنی بھی ہستی کا راز پا نہ سکا

بنائے سینکڑوں معبود یوں تو انساں نے
وہ برگ و غنچہ یا مور و مگس بنا نہ سکا

بشر کو تو نے نوازا، یہ فضل ہے تیرا
سروش منزل سدرہ سے آگے جا نہ سکا

ہے پھول سجدے میں، حالت سے اس کی تو واقف
بہائے اشک مگر حال دل سنا نہ سکا

تنویر پھول

نعت رسول مقبول ﷺ

مہکتے چمن ہو، رسولؐ امیں ہو
سینے میں جن کے قرآن مبیں ہو

ابر کرم بھی ہو، بحر سخا بھی ہو
مہربان رب کا فضل مبیں ہو

فراست و حکمت میں ثانی نہیں ہے
کوئی بشر چاہے کتنا ذہیں ہو

ہو راحت جاں بھی پیام اماں بھی
دل کی تمنا ہو، دل کے قریں ہو

رسولؐ خدا ہیں، یہ پہچان ان کی
باتوں پہ جن کی سب کو یقیں ہو

سجے میں گر کر قیامت کے دن بھی
سب کو بخشش کا طالب نذیر مبیں ہو

محمد زبیر

سید اختر ناز

آپ کی نشست

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چارزانو بھی بیٹھتے تھے اور ان کا کہنا ہے کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بائیں کروٹ پر ایک تکیہ کا سہارا لگائے ہوئے بیٹھے دیکھا ہے۔

(شمائل ترمذی)

حضرت حنظلہ بن حذیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چارزانو بیٹھے ہوئے دیکھا، ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھے ہوئے، (دایاں پاؤں بائیں پر)

(الادب المفرد)

انداز رفتار

حضرت حسن ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلنے کے لئے قدم اٹھاتے تو قوت سے پاؤں اکھڑتا تھا اور قدم اس طرح رکھتے کہ آگے جھک پڑتا اور تواضع کے ساتھ قدم بڑھا کر چلتے، چلنے میں ایسا معلوم ہوتا گویا کسی بلندی سے پستی میں اتر رہے ہیں، جب کسی کروٹ کی طرف کی چیز کو دیکھنا چاہتے تو پورے پھر کر دیکھتے، (یعنی کن انکھیوں سے دیکھنے کی عادت نہ تھی) نگاہ نیچی رکھتے، آسمان کی طرف نگاہ کرنے کی بہ نسبت زمین کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ زیادہ رہتی، عموماً عادت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گوشۂ چشم سے دیکھنے کی تھی (مطلب یہ کہ غایت حیا سے پورا سر اٹھا کر نگاہ بھر کر نہ دیکھتے) اپنے اصحاب کو چلنے میں آگے کر دیتے، جس سے ملتے تو پہلے سلام فرماتے۔

(نشر الطیب)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ جب بلندی پر چڑھتے تو تکبیر کہتے اور جب نیچے وادیوں میں اترتے تو تسبیح کہتے۔

(زاد المعاد)

تبسم

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہنسنا صرف تبسم ہوتا تھا۔

(شمائل ترمذی)

بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محض تبسم ہی فرماتے، کسی ہنسی کی بات پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف مسکرا ہی دیتے۔

(زاد المعاد)

عبداللہ بنؓ حارث کہتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ تبسم کرنے والا نہیں دیکھا۔

(شمائل ترمذی)

حضرت جریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے دیکھتے تو تبسم فرماتے، (یعنی خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے ملتے تھے)

(شمائل ترمذی)

آپ کا گریہ

ہنسنے کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رونا بھی ایسا ہی تھا کہ جس میں آواز پیدا نہ ہوتی، گریہ کے وقت اتنا ضرور ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور آنسو بہہ جاتے اور سینہ سے رونے کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دیتی، کبھی امت پر رحمت کے باعث رو دیتے، کبھی امت پر نرمی اور خطرات کے باعث، کبھی اللہ تعالیٰ کی خشیت کی وجہ سے اور کبھی کلام اللہ سنتے سنتے رو پڑتے، یہ آخری رونا محبت واشتیاق اور اللہ تعالیٰ کے جلال وخشیت کی وجہ سے ہوتا۔

(زاد المعاد)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزاح مبارک

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجالس میں گو وقار، سنجیدگی اور متانت کی فضا ہر وقت قائم رہتی، یہاں تک کہ خود صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین فرماتے ہیں کہ۔

''ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت بابرکت میں ایسے باادب و باتمکین ہو کر بیٹھتے کہ گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ ادنیٰ سی حرکت سے اڑ جائیں گے، مگر پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوش طبعی کی جھلک ان متبرک صحبتوں کو خوشگوار بناتی رہتی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر ایک طرف نبی مرسل کی حیثیت سے احترام رسالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے وعظ و تلقین میں مصروف رہتے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسری طرف صحابہ کرامؓ کے ساتھ بے تکلف دوست اور ایک خوش مزاج ساتھی کی حیثیت سے بھی میل جول رکھتے، اگر زیادہ اوقات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس ایک دینی درسگاہ اور تعلیمی ادارہ بنی رہتی تو کچھ دیر کے لئے خوش طبع مہذب دوستوں کی بیٹھک بھی بن جاتی، جس میں ظرافت کی باتیں بھی ہوتیں، گھر بار کے روزانہ کے قصے بھی بیان ہوتے، غرض بے تکلفی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہؓ سے اور صحابہؓ آپس میں گفتگو کرتے، اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظرافت کس طرح کی تھی، اس تشریح کی یوں ضرورت ہے کہ بہت سے کاموں میں ہمارے غلط عمل سے ہمارے نظریات بدل چکے ہیں، تخیل کہاں سے کہاں چلا گیا ہے، ہر معاملہ میں اعتدال کھو بیٹھے ہیں، اگر ہم سنجیدہ اور متین بنتے ہیں تو اتنے کہ خوش طبعی اور ظرافت ہم سے کوسوں دور رہتی ہے اور اگر خوش طبع بنتے ہیں، تو اس قدر کہ تہذیب ہم سے کوسوں دور رہتی ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل سے ہمیں ایک خاص معیار اپنے سامنے رکھنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظرافت کی تعریف آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہی کی زبان مبارک سے سن لیجئے، صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا یہ ہاں بے شک، مگر میرا مزاح سراسر سچائی اور حق ہے۔''

(شمائل ترمذی)

اس کے مقابلے میں ہمارا آج کل کا مذاق وہ ہے، جس میں جھوٹ، غیبت، بہتان، طعن و تشنیع اور بے جا مبالغوں سے پورا پورا کام لیا گیا ہو۔

اب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظرافت کے چند واقعات قلمبند ہیں کہ جن کے تحت ہم ظرافت کا صحیح تخیل قائم کر سکیں۔

اسی طرح اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بچوں کے ساتھ محبت میں بھی صرف

وہ واقعات ہی بیان ہیں، جن سے ہمیں یہ اندازہ ہو سکے گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بچوں کے ساتھ محبت کا کیا طریقہ تھا۔

ایک شخص نے خدمت اقدسؐ میں حاضر ہو کر سواری کے لئے درخواست کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"تم کو سواری کے لئے اونٹنی کا بچہ دوں گا۔"

وہ شخص حیران ہوا کیونکہ اونٹنی کا بچہ سواری کا کام کب دے سکتا ہے، عرض کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اونٹنی کے بچے کا کیا کروں گا؟"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو۔"

(شمائل نبویؐ)

ایک مرتبہ ایک بڑھیا خدمت اقدس میں حاضر ہوئی اور عرض کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے لئے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو جنت نصیب کرے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی۔"

یہ فرما کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تشریف لے گئے اور بڑھیا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ سنتے ہی زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جب سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بوڑھی عورتیں جنت میں نہیں جائیں گی، یہ بڑھیا رو رہی ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اس سے کہہ دو کہ بوڑھی عورتیں جنت میں جائیں گی، مگر جوان ہو کر۔"

(شمائل نبویؐ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک دیہاتی زاہر نامی دوست تھے، جو اکثر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدیے بھیجا کرتے تھے، ایک روز بازار میں وہ اپنی کوئی چیز بیچ رہے تھے، اتفاق سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ادھر سے گزرے، ان کو دیکھا تو بطور خوش طبعی چپکے سے پیچھے سے جا کر ان کو گود میں اٹھا لیا اور بطور ظرافت آواز لگائی کہ "اس غلام کو کون خریدتا ہے؟"

زاہرؓ نے کہا۔

"مجھے چھوڑ دو، کون ہے؟"

مڑ کر دیکھا تو سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔

حضرت زاہرؓ نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھ جیسے غلام کو جو خریدے گا نقصان اٹھائے گا۔"

(شمائل نبویؐ)

بچوں سے خوش طبعی

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچوں پر بہت شفقت فرماتے، ان سے محبت کرتے، ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ان کو پیار کرتے اور ان کے حق میں دعائے خیر فرماتے، بچے قریب آتے

تو ان کو گود میں لیتے، بڑی محبت سے ان کو کھلاتے، کبھی بچے کے سامنے اپنی زبان مبارک نکالتے، بچہ خوش ہوتا اور بہلتا، کبھی لیٹے ہوتے، تو اپنے قدموں کے تلووں پر بچے کو بٹھا لیتے اور کبھی سینۂ اطہر پر بچے کو بٹھا لیتے۔

اگر کئی بچے ایک جگہ جمع ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو ایک قطار میں کھڑا کر دیتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دونوں بازوؤں کو پھیلا کر بیٹھ جاتے اور فرماتے۔

"بھئی تم سب دوڑ کر ہمارے پاس آؤ جو بچہ سب سے پہلے ہم کو چھو لے گا، ہم اس کو یہ اور یہ دیں گے۔"

بچے بھاگ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے، کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیٹ پر گرتا، کوئی سینۂ اطہر پر، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو سینۂ مبارک سے لگاتے اور پیار کرتے۔

(خصائل نبویؐ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بچوں کے قریب سے ہو کر گزرتے تو ان کو خود السلام علیکم فرماتے اور ان کے سر پر ہاتھ رکھتے اور چھوٹے بچوں کو گود میں اٹھا لیتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کی ماں کو دیکھتے کہ اپنے بچے سے پیار کر رہی ہے تو بہت متاثر ہوتے، کبھی ماؤں کی بچوں سے محبت کا ذکر آتا تو فرماتے۔

"اللہ تعالیٰ جس شخص کو اولاد دے اور وہ اس سے محبت کرے اور اس کا حق بجا لائے تو وہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا۔"

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر سے تشریف لاتے تو راستے میں جو بچے ملتے، انہیں نہایت شفقت سے اپنے آگے یا پیچھے سواری پر بٹھا لیتے تھے۔

بچے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑی محبت کرتے تھے، جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا لپک کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچ گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایک کو گود میں اٹھاتے، پیار کرتے اور کوئی کھانے کی چیز عنایت فرماتے، کبھی کھجوریں، کبھی تازہ پھل اور کبھی کوئی اور چیز۔

نماز کے وقت مقتدی عورتوں میں سے کسی کا بچہ روتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز مختصر کر دیتے تاکہ بچے کی ماں بے چین نہ ہو۔

(خصائل نبویؐ)

اشعار سے دلچسپی

حضرت شرید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سواری پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے بیٹھا تھا، اس وقت میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امیہ کے سو شعر سنائے، ہر شعر پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے تھے کہ اور سناؤ۔

آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"اس کا اسلام لے آنا بہت قریب تھا۔"

(شمائل ترمذی)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حسانؓ بن ثابت کے لئے مسجد میں منبر رکھا کرتے تھے تاکہ اس پر کھڑے ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مفاخرہ کریں، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف میں فخریہ اشعار پڑھیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے

مدافعت کریں، یعنی کفار کے الزامات، کا جواب دیں۔"

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بھی دعا فرماتے تھے کہ "حق تعالیٰ جل شانہ، روح القدس سے حسان ؓ کی امداد فرمائے، جب تک وہ دین کی امداد کرتے ہیں۔"

(شمائل ترمذی)

خواب پوچھنے کا معمول

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت طیبہ تھی کہ صبح کی نماز کے بعد چار زانو بیٹھ جاتے اور لوگوں سے ان کے خواب پوچھتے جس نے خواب دیکھا تھا، وہ کہتا، خواب سننے سے پہلے یہ الفاظ ارشاد فرماتے۔

خیر تلقاہ وشر توقاہ خیر لنا وشر لا عدآئنا والحمدللہ رب العلمین۔

ترجمہ:۔ خیر کا سامنا کرو اور شر سے بچو اور (یہ خواب) ہمارے واسطے بہتر ہو اور ہمارے دشمنوں کے لئے شر ہو اور تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔

بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ معمول ترک فرما دیا تھا۔

(زاد المعاد، شمائل ترمذی)

سیدھے اور الٹے ہاتھ سے کام لینا

علاوہ ایسے کاموں کے جن میں غلاظت کی صفائی کو دخل ہوتا اور ہاتھ میں نجاست لگنے کا خوف ہوتا مثلاً ناک صاف کرنا، آبدست لینا، جوتا اٹھانا وغیرہ وغیرہ، باقی تمام کام داہنے ہاتھ سے انجام دینا پسند فرماتے تھے، اسی طرح جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کو کوئی چیز دیتے تو سیدھے ہاتھ سے دیتے اور اگر کوئی چیز لیتے تو سیدھے ہاتھ سے لیتے۔

(زاد المعاد، شمائل ترمذی)

پیغام پر سلام کا جواب

جب کسی کا سلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچتا تو سلام پہنچانے والے کے ساتھ سلام لانے والے کو بھی سلام کا جواب دیتے اور اس طرح فرماتے۔

علیک وعلی فلان سلام۔

(شمائل ترمذی)

خط لکھوانے کا انداز

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت طیبہ خط لکھوانے کے متعلق یہ تھی کہ بسم اللہ کے بعد مرسل کا نام لکھواتے اور پھر مرسل لیہ کا نام لکھواتے، اس کے بعد خط کا مضمون لکھواتے۔

تفریح

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باغات کی تفریح کو پسند فرماتے اور کبھی کبھی تفریح کے لئے باغات میں تشریف لے جاتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمولات سفر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر کے لئے خود روانہ ہوتے یا کسی اور کو روانہ فرماتے، تو جمعرات کے روز کو روانگی کے لئے مناسب خیال فرماتے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر میں سواری کو زیادہ تر تیز رفتاری سے چلانا پسند فرماتے اور جب دیکھتے کہ راستہ لمبا ہے تو رفتار اور تیز کر دیتے۔

☆☆☆

ابن انشاء

میں اپنے سے آگے والے آدمی کے ہاتھوں تنگ ہوں۔

میں جس قطار میں بھی کھڑا ہوں، یہ صاحب مجھ سے آگے ہوتے ہیں، میں بھاگم بھاگ ریلوے اسٹیشن پر پہنچتا ہوں، مجھے کوئٹہ کی گاڑی پکڑنی ہے، پانچ منٹ باقی ہیں، کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص مجھ سے پہلے کھڑا بکنگ کلرک سے ہم کلام ہے اور اس نے اپنی کہنیاں کھڑکی کے چھجے پر جما رکھی ہیں، اس شخص کو ہفتہ بھر بعد لاڑکانہ جانا ہے اور یہ معلوم کرنا ہے کہ راستے میں کہاں گاڑی بدلی جائے گی، صبح سے آدھی رات تک وہاں کون کون سی ٹرینیں جاتی ہیں، ان میں کیا کیا درجے ہوتے ہیں، ہر درجے کا کیا کرایہ ہوتا ہے، آیا گرمیوں کی چھٹیوں میں کوئی رعایت ملتی ہے، پوری بارات جانی ہو تو کتنے کا ٹکٹ بنتا ہے، اس دوران میں دوسری کھڑکی کی لائن برابر کھسک رہی ہے، لوگ ٹکٹ لے رہے ہیں، جا رہے ہیں، میں تنگ آ کر اس کھڑکی کا رخ کرتا ہوں، چھ آدمیوں کے بعد میری باری آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے یہاں تو صرف پلیٹ فارم ٹکٹ ملتے ہیں، اتنے میں گاڑی نکل جاتی ہے۔

☆☆☆

جب میں ڈاک خانے جاتا ہوں تو کاؤنٹر پر پہلے سے ایک شخص بہت سے لفافے اور کئی پیکٹ لئے کھڑا ہوتا ہے اور سب کی منزلیں مختلف ہوتی ہیں، سب کا وزن الگ الگ کرانا ہوتا ہے، ان میں ایک پیکٹ جزائر غرب الہند کے کسی جزیرے کو جانا ہے، کلرک کو اٹھنا پڑتا ہے، یہ دیکھنے کیلئے کہ غرب الہند کہاں واقع ہے، پھر وہ کتاب دیکھتا ہے پھر بڑے ڈاک خانے فون کرتا ہے، وہ لوگ اسے انتظار کرنے اور ہولڈ آن کرنے کو کہتے ہیں، دوسری کھڑکی پر جاتا ہوں تو وہاں ایک شخص ہے جس کے پاس پچاس کا نوٹ ہے، لفافے وہ لے چکا ہے اور اتنے کا کھلا کلرک کے پاس نہیں ہے، سینما میں بھی یہی شخص میرے آگے کھڑا ہوتا ہے، اس شو کا آخری ٹکٹ لینے کے لئے، اس کے بعد بکنگ کلرک کلوز کی تختی لگا دیتا ہے۔

☆☆☆

ابھی پرسوں میں بنک گیا، پیسے نکلوانے تھے، وہاں کسی دفتر کا سپرنٹنڈنٹ مجھ سے پہلے موجود تھا، وہ سارے دفتر کے لوگوں کے چیک لے آیا تھا کہ ایک ساتھ کیش ہو جائیں، ہر ایک کو وقت نہ ضائع کرنا پڑے، پیسے لینے کے بعد اس

نے سب کے پراویڈنٹ فنڈوں میں ان کی رقمیں جمع کرائیں، سب کا حساب الگ الگ بنایا پھر دو تین نئے اکاؤنٹ کھولے، اتنے میں ایک بج گیا، کلرک کہنے لگا۔

"صاحب! اب آپ کل نو بجے آئیے۔"

☆☆☆

یہی ماجرا دکاندار کے ہاں پیش آتا ہے، سڑک پر گاڑی لے کر نکلے تو اپنے سے آگے والا مزے مزے سے سیٹی بجاتا پندرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلاتا ہے اور سڑک کو خالی بھی نہیں کرتا، ایلفنسٹن اسٹریٹ پر مجھے گاڑی پارک کرنی ہوتی ہے، سب جگہیں بھری پڑی ہیں، کوئی خالی نہیں ہے، بس ایک جگہ خالی ہے، اس میں یہ شخص مجھ سے ایک منٹ پہلے اپنی گاڑی گھسا دیتا ہے اور مجھے پھر چکر کاٹ کر آنا پڑتا ہے، اس دوران میں اس کی بیوی سامنے کی دکان سے کچھ خرید کر آ رہی ہوتی ہے، میں اس کی گاڑی کے پیچھے اپنی گاڑی کھڑی کرتا ہوں کہ یہ نکلے تو میں جگہ لوں، میرے رکنے سے راستہ رک جاتا ہے، پیچھے کاروں کی ایک لمبی قطار لگ جاتی ہے، وہ شخص اپنی گاڑی اسٹارٹ کرتا ہے، میری جان میں جان آتی ہے لیکن پھر انجن بند کر دیتا ہے، اس کی بیوی یہ چیز لوٹا کر بڑے سائز میں دوسری چیز لے گی، مجھے پھر دو گلیوں کا چکر کاٹ کر آنا پڑتا ہے، اس دوران میں اس کی جگہ کوئی دوسری کار لے چکی ہوتی ہے۔

☆☆☆

مجھے ٹیلی فون کرنا ہے، میں ٹیلی فون بوتھ کے باہر ادھر سے ادھر چکر کاٹتا ہوں، کوئی صاحبہ فون کر رہی ہیں، خدا حافظ کہہ رہی ہیں، "اچھا تو اور کیا حال ہے بھئی، اس بار کوئی پکچر دیکھی؟ کون کون ہے اس میں؟ کہانی کیا ہے؟ تمہاری پھوپھی کے بیٹے کا کیا احوال ہے؟ وہ ولایت گیا کہ نہیں؟ پڑوس سے قسیم کو بھی بلا دو، اس سے بھی بات کر لوں۔" خدا خدا کر کے وہ نکلتی ہیں اور میں اندر داخل ہوتا ہوں، سکہ اس میں ڈالتا ہوں، اب نمبر یاد نہیں آ رہا 610244 ہے یا 610422 ہے، ڈائری دیکھنے کو پل بھر کے لئے باہر نکلتا ہوں، ایک اور صاحبہ خاصی توندیل میرے کندھے سے کندھا چھوتی اندر گھس جاتی ہیں، ان کے پاس ایک لمبی فہرست ہے ٹیلی فون نمبروں کی اور سکوں کا انبار ہے جسے وہ تختے پر لگا دیتی ہیں، کل پکنک ہے ان کو سب سہیلیوں کو یاد دہانی کرانی ہے نا۔

☆☆☆

یہی ریستوران میں ہوتا ہے، مجھے بھوک لگی ہے اور دو بجے دفتر واپس پہنچنا ہے، کوئی میز خالی نہیں ہے، ایک صاحب ہیں جو کھانا کھا چکے ہیں، اب آئس کریم منگوائی ہے، میری آنکھیں ان کے چمچے کے ساتھ ساتھ پیالی پر آتی ہیں، منہ تک جاتی ہیں، اب ختم ہوئی کہ ہوئی، چار چمچے اور ہوں گے، میں گھڑی دیکھتا ہوں، آخر وہ اپنا چمچہ خالی پلیٹ پر رکھتا ہے، ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے، بیرے کو بلاتا ہے، اس کے کان میں کچھ کہتا ہے، میں اپنے ایک پاؤں کا بوجھ دوسرے پاؤں پر منتقل کرتا ہوں، اتنے میں بیرا نمودار ہوتا ہے اور ایک اور ٹی پاٹ اس کی میز پر رکھ دیتا ہے، یہ صاحب شام کو اخبار نکالتے ہیں اور معمے پر نشان لگانا شروع کر دیتے ہیں کہ اتنے میں چائے ٹھنڈی ہو لے۔

☆☆☆

ڈاکٹر کے ہاں وہ مجھ سے پہلے سے موجود ہوتا ہے اور مجھے پورا ایک گھنٹہ اس کی خاطر وہاں بیٹھنا اور چھ ماہ پرانے رسالے پڑھنے پڑتے ہیں، ہوائی جہاز کے اندر رات بھر کے سفر کے بعد ادھر صبح ہوئی اور شخص نے اپنا شیونگ کے سامان کا بیگ سنبھالا اور جہاز کے واحد غسل خانے میں داخل ہو گیا، میں اس وقت تک باہر کھڑا رہتا ہوں جب تک یہ شخص اپنی تازہ شیو پر ہاتھ پھیرتا برآمد نہیں ہو جاتا، اتنے میں جہاز زمین پر اترنے کو ہوتا ہے، ایر ہوسٹس کہتی ہے۔

"صاحب! اپنی سیٹ پر آئیے، بیلٹ باندھیے۔" میں دانت کچکچا کر رہ جاتا ہوں،

☆☆☆

اور تو اور جب یہ شخص مجھ سے پیچھے ہو تب بھی میں اس سے آگے نہیں نکل سکتا، کل عبدالغفور اینڈ سنز کے ہاں سیل لگی ہوئی تھی، اس شخص نے میرے پیچھے کھڑے کھڑے سیلز مین کو آواز دی کہ بھیا وہ قمیض میرے لئے رکھ لو، یہ میرے سائز کی اور میرے پسندیدہ رنگ اور ڈیزائن کی آخری قمیض تھی، لفٹ میں بھی یہ چھپاک سے مجھ سے پہلے داخل ہو جاتا ہے اور لفٹ والا مجھے روک دیتا ہے کہ "صاحب! گنتی پوری ہو گئی۔" میں ناچار سیڑھیوں سے بھاگم بھاگ اترتا ہوں اور آخری ٹیکسی کو آواز دیتا ہوں، میں اس سے پانچ قدم پر ہوتا ہوں کہ وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندر گھس جاتا ہے۔

☆☆☆

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے، میری حسرت یہ ہے کہ کبھی ایسی قطار میں کھڑا ہوں جس میں مجھ سے آگے کوئی نہ ہو، ڈاک خانے میں، لفٹ میں، ریلوے کے ٹکٹ گھر پر سب کوئی اور شخص آئے جس کو جلدی ہو اور جسے دو بجے واپس دفتر جانا ہو تو اسے کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے آئس کریم منگاؤں پھر کافی کا آرڈر دوں پھر شام کا اخبار کھول بیٹھوں، اے کاش۔

☆☆☆

قاری کا مصنف سے دلی وجذباتی تعلق ہوتا ہے، ایسا تعلق جو ان کے دلوں کو جکڑے رکھتا ہے، ہماری قارئین بھی مصنفین سے ایسی ہی دلی وابستگی رکھتی ہیں اور وہ مصنفین کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں کہ ان کی ذاتی زندگی، خیالات، احساسات وہ جاننا چاہتی ہیں کہ کیا مصنفین بھی عام لوگوں کی طرح ہوتے ہیں یا ان کے شب وروز میں کچھ انوکھا ہے ہم نے قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک سلسلہ شروع کیا ہے "ایک دن حنا کے نام" جس میں ہر ماہ ایک مصنفہ اپنے ایک دن کا احوال لکھیں گی کہ صبح آنکھ کھلنے سے لے کر رات نیند کو خوش آمدید کہنے تک وہ کون کون سی مصروفیات ہے لکھنے کے علاوہ جو وہ انجام دیتی ہے، امید ہے آپ کو یہ سلسلہ پسند آئے گا۔

فوزیہ شفیق

اس ماہ کی مہمان مصباح نوشین

"اُف، فوزیہ یہ کیا پوچھ لیا آپ نے، میرے روز وشب بالکل ویسے ہی مصروف ترین جیسے کسی بھی ہاؤس وائف کے ہو سکتے ہیں، بس ذرا ان میں دو عدد شرارتی بچوں اور ایک عدد نخریلے اور لاڈلے میاں جانی کا اضافہ کر لیں، صبح کا آغاز چار بجے ہی ہو جاتا ہے نماز فجر کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ میں تھوڑا بہت لکھ بھی لیتی ہوں کیونکہ پھر سارا دن لکھنے کے لئے وقت نکالنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے اور کہانیاں میرے ذہن میں چکراتی پھرتی ہیں، کردار دہائیاں دیتے ہیں اور میں بس بے بسی سے طفل تسلیاں دیتے انہیں یا شاید خود کو سمجھاتی رہتی ہوں، میڈ گھر کا سارا کام کرتی ہے اگر وہ کسی وجہ سے نہ آئے تو پھر صفائی ستھرائی کا کام میں خود کرتی ہوں بے حد پھرتیلی ہوں لپک جھپک سارا کام ایک گھنٹے میں کر لیتی ہوں، پھر میرے بچے اٹھ جاتے ہیں ساتھ ہی میاں جانی نہا کر ناشتہ کا انتظار کرنے لگتے ہیں، میں فوراً کچن میں ناشتہ بنانے لگتی ہوں، بل دار پراٹھے جو ہمیشہ خستہ بھی ہوتے ہیں، دہی، سالن یا انڈہ اور میٹھی لسی کے ساتھ انہیں ناشتہ کرواتی ہوں، ہم عموماً ناشتہ ایک ساتھ ہی کرتے ہیں، چائے کی بے حد شوقین ہوں تیز پتی والی دودھ پتی بے حد شوق سے پیتی ہوں، اس کے بعد کچن کی صفائی میڈ کی ذمہ داری میں بچوں کو نہلا کر صاف ستھرا کر کے فیڈر پکڑا دیتی ہوں، ڈاکٹر حذیفہ بے حد نخریلے اور شرارتی واقعہ ہوئے ہیں تو

اسوہ صاحبہ بھی کسی سے کم نہیں ہیں، روزانہ انہیں نئی فراک چاہیے ہوتی ہے اسے کپڑے چینج کروانا بے حد صبر آزما اور مشکل کام ہے اپنے پاپا کی بے حد لاڈلی ہے سو میں اکثر یہ بھاری ذمہ داری ان پر عائد کرتی ہوں (بھئی اسوہ کو منانے کی) سو وہ باپ بیٹی جانے کیا کیا لالچ ایک دوسرے کو دے کر راز و نیاز کرتے ہوئے ایک دوسرے کی بات مانتے ہیں مجھے نہیں معلوم میں تو بس اسوہ کو تیار دیکھ کر خوش ہوتی ہوں، پھر اس کی فرنچ ناٹ بناتی ہوں اس کے بال لمبے کر رہی ہوں ناں تو وہ صرف پونیاں بنوانے پر اکتفا نہیں کرتیں محترمہ، انہیں تو اسٹائل بھی چاہیے ہوتا ہے بالوں کا، پھر ساتھ ہی ساتھ انہیں کہانی بھی سنانا پڑتی ہے ٹام اینڈ جیری والی کہانی اسے بے حد پسند ہے اور ہر وقت میرے کان کھاتی ہے کہ مما بلی والی کہانی سناؤ، دکھی بات پر ایسے افسردہ تاثرات اور چہ چہ کی آوازیں نکالتے اظہار افسوس کرتی ہے کہ ہنسی آ جاتی ہے، ڈاکٹر حذیفہ (یہ میں نہیں کہہ رہی بلکہ انہوں نے ایک سال پہلے اپنا پروفیشن خود ہی چوز کر لیا تھا) صرف سوا دو سال کے ہیں مگر آٹھ نو سالہ بچوں کو پیٹ لینے کے ساتھ پھر انہیں ڈرٹی بے بی کا خطاب بھی دے ڈالتے ہیں، میں جب بھی فارغ ہوں اگر لکھنے کے لئے بیٹھوں تو حذیفہ اور اسوہ کو لکھائی پڑھائی کا کام یاد آ جاتا ہے، سو کبھی میری پنسل ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو کبھی فائل اسوہ صاحبہ کے اور میں روتی بسورتی بس ناراض ہونے کی دھمکیاں ہی دیتی رہ جاتی ہوں، نو سے بارہ بجے تک ہی بچوں سے چھینا جھپٹی کا حال رہتا ہے، پھر دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتی ہوں، میرے ہزبینڈ کو ہر کھانے میں اہتمام چاہیے ہوتا ہے سو کھانا ہمیشہ دل لگا کر پکاتی ہوں ساتھ ہی ساتھ کچن بھی صاف کر لیتی ہوں تب تک میاں جانی گھر آ جاتے ہیں بچے ان کے اردگرد منڈلاتے ہیں اور میں مطمئن سے انداز میں اپنا کام نمٹاتی رہتی ہوں۔

دوپہر کا کھانا بھی ہم اکٹھے کھاتے ہیں میں کھانے پینے کے معاملے میں خاصی چور ہوں سو میرے ہزبینڈ کڑی نگرانی رکھتے ہیں میرے کھانے پینے کی، لازمی اپنے ساتھ بٹھا کر زبردستی کھلاتے ہیں، دوپہر کے بعد میں زبردستی بچوں کو سلانے کی کوشش کرتی ہوں اور میری اس کوشش میں میرے ہزبینڈ بھرپور ساتھ دیتے ہیں، بمشکل تمام انہیں سلا کر میں کچھ دیر یا تو ریسٹ کر لیتی ہوں یا پھر لکھنے بیٹھ جاتی ہوں۔

ایک بات اور ہم میاں بیوی بہت باتیں کرتے ہیں اور پھر وہ اکثر کہتے ہیں۔

”تم کتنا بولتی ہو۔“ ہاہاہا خیر میرے پاس ہمیشہ ہی انہیں سنانے کے لئے کوئی نہ کوئی قصہ موجود رہتا ہے اور خود وہ تب مجھ سے باتیں کرتے ہیں جب میرا لکھنے کا موڈ ہو اور میں اس وقت زیادہ باتیں کرتی ہوں جب ان کے سونے کا ارادہ ہوتا ہے یعنی ہم ایک دوسرے کو اپنا پسندیدہ کام اتنی با آسانی کرنے نہیں دیا کرتے جناب، سہ پہر سے شام یا تو جیٹھ کے گھر چلی جاتی ہوں یا مونا کے گھر، ویسے کم کم ہی کہیں جانا ہوتا ہے میرا کیونکہ میں کسی کے گھر جا کر گپیں ہانکنے سے بہتر کچھ نہ کچھ لکھنا یا پڑھنا پسند کرتی ہوں یوں سمجھ لیجئے کہ گھر کے اور بچوں کے کئی ذمہ داری کے بعد میرا سارا کا سارا وقت صرف اور صرف لکھنے پڑھنے کے لئے وقف ہے اس کے ساتھ ساتھ دوستوں کے لئے بھی وقت نکالنا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں ہے یہ میرے دوست بھی اعتراف کریں گے۔

اور آج کل تو میرے پاس سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہے، اپنی دوسری کتاب کی تیاری اور پانچ عدد رسالوں میں لکھنے کے ساتھ ساتھ مجھ سے چھٹے رسالے میں لکھوانے کی خواہش اف جو میں باوجود کوشش کے پوری نہیں کر پا رہی۔

تین سال کے طویل عرصے کے بعد میں نے لکھنا شروع کیا اور ایک سال سے باقاعدہ شائع بھی ہو رہی ہوں اور ایک سال میں بارہ ناولز شائع ہونے کا ریکارڈ بھی ما بدولت کے پاس موجود ہے، میں نے تقریباً ہر پرچے میں لکھا ہے چاند نگر آف پبلیکیشنز کے چاروں پرچوں میں الحمدللہ لکھ رہی ہوں، لیکن حنا کے قارئین سے بے تحاشا محبت اپنائیت اور اپنا پن ملا ہے فوزیہ آپی کا نرم لہجہ، محبت سے بھرپور اور عزت دینے والا ہوتا ہے، ہر ماہ باقاعدگی کے ساتھ حنا بھیجتی ہیں اور محبت سے اصرار کر کے لکھواتی ہیں۔

قارئین، میرے روز و شب خاصے بور رنگ سے ہیں مگر اتنے بھی نہیں جتنے شاید میں نے لکھ دیئے ہیں کبھی فرصت ملی تو پھر اپنی زندگی کی حسین رنگوں سے مزین تصویر سے پردہ اٹھا کر آپ کو محظوظ کروائیں گے فی الحال تو فوزیہ آپی کا کہا ٹالا نہیں گیا کیونکہ ان کی ہر بات میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی ہے اور وہ بضد رہتی ہیں کہ میں درخواست کرتی ہوں عاجزی کے ساتھ تم حکم نہ سمجھا کرو، یار زندہ صحبت باقی، اللہ حافظ۔

☆☆☆

فوزیہ غزل

تیسویں قسط کا خلاصہ

شہریار کے رویہ والفاظ سے ہرٹ ہو چکنے کے باوجود سعیہ اپنے رشتے کو داؤ پر نہیں لگانا چاہتی، ایک ایڈ کی شوٹنگ کے سلسلہ میں شہریار یونٹ کے ساتھ سعیہ کو بھی دوبئی لے آتا تو لوکیشن پہ ماڈل اور شہریار کی بے تکلفی سے ڈپریسڈ اچانک طوفانی موسم میں چلتی وہ گہری کھائی میں جا گرتی ہے۔

حجاب اور اسلام میں عورت کی مظلومیت، ماریا فاطمہ سے بحث کرتی ہے اور پردہ کا اصل فلسفہ و مقصد جان کر قائل ہو جاتی ہے بہت حد تک اسلامی نقطہ نظر سے وہاج اپنے گزشتہ رویے پہ اریبہ سے معافی مانگنے نکلتا ہے مگر تیز ڈرائیونگ کے باعث اس کی گاڑی سے ایک لڑکی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

حادثے کا شکار ہونے والی لڑکی صبا ہے جس کے سسرالی معذور لڑکی کا رشتہ لینے سے انکار کر کے واپس چلے جاتے ہیں، وہاج صبا کے اس نقصان کا ذمہ دار خود کو سمجھتے ہوئے شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

اکتیسویں قسط

یاد ہے ہم تجھے دل مانتے تھے
اپنے سینے میں مچلتا ہوا ضدی بچہ
تیرے ہر ناز کو انگلی سے پکڑ کر اکثر
نت نئے خوابوں کے بازار میں لے آتے تھے
کبھی روتے ہوئے ہنس پڑنا
کبھی اور کبھی ہنستے ہوئے رو پڑنا
پہلی پہلی محبت کا نشہ اور خمار
دیر تلک رکھتا تھا مدہوش ہمیں
ہم تجھے بھگوان سمجھتے تھے مگر
کفر سے ڈر جاتے تھے
تیرے چھن جانے کا ڈر ٹھیک سے
رکھتا تھا مسلمان ہمیں
تیرے بھولے ہوئے رستوں پر
لئے پھرتا ہے ایمان ہمیں
اور مجھے یاد ہے
ہم تجھے ایمان کہا کرتے تھے

کبھی کبھی انسان کا دل چاہتا ہے اسے دور کی تو کیا قریب کی بھی کوئی چیز دکھائی نہ دے، نہ دیکھنے میں جو سکون ہے بعض دفعہ دیکھنے میں اس سے بڑا دکھ چھپا ہوتا ہے، جویریہ بہت دیر تک یونہی ساکت کھڑی رہی تھی چہرہ یوں تپ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تمانچہ دے مارا ہو وہ "لمحہ تضحیک" جھیلنا آسان نہ تھا، کوئی معذرت، وضاحت نہ تھی، شرمندگی اور خجالت تھی تو اسے بے بسی اور مجبوری کی انتہا نے خاموشی میں لپیٹ دیا تھا، جویریہ مڑنے لگی تھی۔

"اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی تو نہ تھا کہاں سے لاتے اتنے روپے ہم؟" اریبہ نے بہت دیر بعد بھرائی آواز میں کہا تو وہ رک گئی مگر پلٹ کر اس کی سمت دیکھ نہیں سکی یقیناً ان لمحوں میں وہ بہت دلگرفتہ تھی، اس کا دل کٹ کر رہ گیا تھا، مگر بے بسی سی بے بسی تھی کہ احتجاج لعن طعن یا برا بھلا کہنے کا حوصلہ نہ تھا، اب وہ قسمت کو کیا کوستی جس کے ساتھ ان کی دوستی بہت عرصہ ہوا ٹوٹ چکی تھی، وہ اریبہ کی طرف دیکھے بغیر بھی بتا سکتی تھی کہ وہ بری طرح رو رہی ہے، اس نے محبت کی تھی ایسے شخص سے جو اسے ضرورت کی طرح استعمال کرتا رہا اور جب محسوس کیا کہ وہ ضرورت سے کم استعداد، حوصلہ اور کمزوری دکھانے لگی ہے تو اسے استعمال شدہ ٹشو پیپر کی طرح اپنی زندگی سے دور پھینک دیا، اس کا مان، غرور چھین کے اس کے نسوانی پندار کو زخمی کر کے اسے اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا اور زندگی میں پہلی دفعہ اس کے بے حد دکھے دل سے بددعا نکلی تھی۔

"خدا کرے وہاج حسن تم زندگی میں کبھی سکھ نہ پاؤ، جس طرح خوشیوں کو چھین کر آنسوؤں، آہوں، سسکیوں کو ہمارا مقدر بنا دیا میری معصوم بہن کو رسوائی کی صلیب پہ چڑھا دیا خدا کرے اس کا صبر و ضبط

تمہیں لے ڈوبے تم ہمیشہ بے سکون رہو، خوشی کو ترسو، رسوائی، ذلت کا عذاب سہو جیسے ہم سہہ رہے ہیں۔"

"آپی ڈاکٹر کو بلائیں امی کا تنفس بگڑ رہا ہے۔" ربیعہ بھاگتی ہوئی آئی اور ساکت کھڑی اریبہ کو جھنجھوڑا اور وہ دونوں جیسے ایکدم سے موجودہ صورت حال میں لوٹ آئی تھیں۔

ڈاکٹرز اور نرس اس کی ماں کو طبی ٹریٹمنٹ دے رہے تھے، اریبہ نے سارے روپے ڈاکٹر کے سامنے ڈھیر کر دیے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب جتنا روپیہ لگے، لگائیں مگر میری ماں کو ٹھیک ہونا چاہیے۔"

"اللہ سے ضد کوئی نہیں لگا سکتا ہم بشر صرف کوشش کرتے ہیں ہر ممکن حد اور وسائل تک شفا دینا صرف اللہ کا کام ہے۔" معمر اور ہمدرد صورت ڈاکٹر نے رسان سے کہا۔

ان کی ماں کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا تھا، وہ بڑے اضطرابی انداز میں ہاسپٹل کے طویل کوریڈور میں ٹہل رہی تھی جویریہ اور ربیعہ دیوار کے ساتھ آرام دہ نشستوں پہ بیٹھی دعائیں مانگ رہی تھیں، بہت سے لوگ تھے کسی نہ کسی عزیز پیارے کے ہمراہ آئے بیٹھے پریشانی، فکرمندی سے بھرے چہرے لئے مگر اریبہ اس کی آنکھوں، چہرے پر کرب اور اذیت تھی جیسے وہ خود زیست و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو، ہیڈ نرس نے اس خوبصورت اداس لڑکی کو پکارا۔

"بیٹا خود کو سنبھالو اور دعا کرو۔"

"میری امی کیسی ہیں؟" وہ بے طرح تڑپ کر بولی۔

"ٹریٹمنٹ دے رہے ہیں تاہم کچھ کہا نہیں جا سکتا، تم دعا کرو۔"

"دعا میری دعائیں تو عرصہ ہوا قبولیت تک جانے والا رستہ بھول چکی ہیں اور مجھے وہ ہنر آتا نہیں جو دعا میں اثر لے آئے۔" وہ گم سی بولی۔

"بیٹی دعا کو راستہ کبھی نہیں بھولتا یہ صرف ہم انسانوں کے گناہ ہیں جو در قبولیت کھلوا نہیں پاتے۔"

"اور میرے گناہ تو بخشنے کے قابل بھی نہیں میں کس بھروسے پہ مانگوں۔" اس نے اذیت ناک سوچ میں ڈوبتے ہوئے ایمرجنسی کے وارڈ روم کی طرف دیکھا یہاں تقدیر جانے کیا رقم کرنے والی تھی، اس نے نا چاہتے ہوئے بھی آخری بار رابطہ کیا اپنی دیار غیر میں مقیم بہنیں، پھپھو زاہدہ، خالہ رشیدہ سب کو امی کی انتہائی ناگفتہ بہ حالت کا بتایا کوئی آتا یا نہ آتا اس نے اپنا فرض ادا کیا تھا۔

کچھ اندازہ نہیں تھا ہاسپٹل کے طویل کاریڈور میں انتہائی درد و اذیت سہتے کتنا وقت، کتنے گھنٹے گزرے وقت کا احساس بے معنی ہو کر رہ گیا تھا بس اتنا دیکھا کہ اسٹریچر پر لیٹا بے حس و حرکت وجود ایمرجنسی سے باہر لایا جا رہا تھا، اریبہ کی سانسیں جیسے رکنے لگیں۔

"آئم سوری بیٹی ہم نے بہت کوشش کی مگر اللہ کی مرضی یہی تھی۔" معمر اور ہمدرد صورت ڈاکٹر ذرا سا رکا اور آگے بڑھ گیا۔

اپنی زندگی، محبت، عزت کو داؤ پر لگا کر ماں کی زندگی خریدنے نکلنے والی لڑکی اپنے سامنے لیٹے مردہ وجود کو دیکھتی صرف یہ سوچ رہی تھی کہ اگر سب لٹا کر یہ ہونا تھا تو تقدیر نے اسے رسوائی کا بار اٹھانے پر کیوں مجبور کیا، کاش وہ بیتے وقت کو موڑنے کی اہلیت رکھتی تو یہ وقت اپنی زندگی سے نکال پھینکتی، ایک غلطی

پوری زندگی میں ایک گناہ، ضمیر کی چبھن پچھتاوے کے ناگ اور ماں کی موت وہ ہولے ہولے کانپنے لگی، آنکھیں اندھیروں میں ڈوبتی جا رہی تھیں، ایک طویل اور نا ختم ہونے والی سزا میں گھرتی وہ نیچے گر گئی۔

زندگی کا پہیہ کسی کے جانے سے رکتا نہیں صرف جانے والا جاتا ہے دنیا کے کام اور وقت اسی رفتار سے چلتے ہیں اور نڈھال، شکستہ ذہن ہونے کے باوجود انسانوں کو وقت کا ساتھ دینا پڑتا ہے، کہ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا بے شک اس کی روح زخموں سے چور تھی، دل پر زخموں کے پہاڑ تھے، وجود قبرستان لوگوں کی دنیا میں۔ سب بدل چکا تھا رشتے دار دنیا دکھاوے کے لئے پہلے تین دن آتے رہے، بہنوں نے فون پر افسوس کر لیا وہاج صرف جنازے میں شامل ہو سکا، خالہ لوگ بھی دو دن چند گھنٹوں کے لئے آئے پھر بس، پھپھو نے مکان کی ملکیت میں اپنا حصہ لینے کے لئے دعویٰ کر ڈالا تھا، دکھ افسوس کوئی احساس نہ تھا انہیں اتنا برا رہیہ اور اس قدر جلد انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا، زندگی کے کسی موڑ پر رشتے اتنی ڈراؤنی اور بھیانک صورت بھی بنا لیتے ہیں، اس حقیقت کی اذیت کو وہ ساکت سی دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ایک نسوانی چیخ تھی جو بارش کی ٹپاٹپ اور آندھی کے شور میں شہریار کو سنائی دی۔

''سعیہ۔'' اس کا وجدان بری طرح سے چلایا، وہ بری طرح چونکا مڑا مگر تیز بارش کی بوچھاڑ اور ہوا کے جھکڑوں کے باعث آنکھیں پوری نہ کھل رہی تھیں، اپنے وجود کا سیدھا کھڑا ہونا ناممکن دکھائی دے رہا تھا اسے سعیہ کیوں نظر نہ آ پائی۔

''کہیں ٹھوکر کھا کے گر تو نہیں پڑی، یہاں تو چہار اطراف کھائیاں بھی ہیں، یا اللہ خیر رکھنا اس پاگل لڑکی کو کچھ نہ ہو۔''

دل کی تمام تر شدتوں سے دعا کرتا وہ ہاتھ میں تھامے سفری بیگ سے ٹارچ نکالنے لگا اور اس کی روشنی اپنے سامنے اردگرد ڈالنے لگا۔

''ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسے بری طرح ڈانٹا تھا، ڈپریسڈ تو ویسے ہر وقت رہتی ہے جانے کس کیفیت میں بے دھیانی سے چلی ہو گی۔'' خود کو کوستا وہ بغور اردگرد دیکھ رہا تھا۔

''سعیہ۔'' اس کے لب با آواز بلند پکارا مگر جواب ندارد، پریشانی کچھ سوا ہوئی۔

''اگر اسے کچھ ہو گیا تو......'' شہریار کو جیسے کچھ ہوا وہ اس وقت سعیہ سے محسوس ہونے والی ضد، غصہ سب بھولے صرف اسے زندہ سلامت دیکھنے کا خواہش مند تھا۔

''میں خوش رہنا چاہتی ہوں بے شک آپ میرے بن کے نہ رہیں مگر زندگی لمحہ لمحہ مجھ پر یوں تنگ تو نہ کریں۔''

بے بسی و شکستگی کا اظہار کرتا بھرایا لہجہ شہریار کے اعصاب جھنجھوڑ گیا جانے کیا چیز تھی کہ اس کے ساتھ کو خواب، رشتے کا سمجھنے کے باوجود وہ اس لڑکی سے نفرت نہیں کر پا رہا تھا، لاکھ کوشش کرتا کہ اپنی بے ریا اور سچی محبت کو پامال کر کے اک ''کھوٹ زدہ دل'' اور دھوکہ آمیز ذہن لے کر اپنی زندگی خراب کرنے والی اس لڑکی سے بدلہ لے، مگر دل میں امڈتی محبت، توجہ نرمی جو اس نازک و کومل سراپا سے وابستہ تھی اسے غلط کرنے نہ دیتی، اس وقت بھی وہ ہر چیز و غصہ بھلائے صرف اس کی خیر خواہی کا طلبگار تھا اور خود سے الجھتا روشنی درختوں، سڑک کھائیوں میں ڈالتا بڑھ رہا تھا جب اسے ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔

''سعیہ۔'' وہ ایک بار پھر پوری قوت سے پکارا تھا اور نیچے گہری کھائی میں جاتی ایک درخت کے تنے سے اٹکی وہ اپنے منجمد احساسات کو خوف، دہشت، اعصابی دباؤ کے باعث خود کو مفلوج محسوس کر رہی تھی اس نے بے ساختہ پکارا تھا۔

''شہری۔''

شہریار نے آواز کی سمت کا اندازہ لگاتے ہوئے ٹارچ کی روشنی اسی سمت پھینکی، وہ دوہری ہوئی شاخ کی مانند قدرے نیچے نشیبی کھائی کے اردگرد لگے درختوں، جھاڑ جھنکاڑ میں اٹکی یقیناً تکلیف کے عالم میں تھی اس کا اورنج کلر کا دوپٹہ کانٹوں میں الجھا لہرا رہا تھا شہریار کے تمام حواس ایکدم سے الرٹ ہوئے تھے وہ کچھ تیزی سے قدرے محتاط انداز میں نیچے کی طرف قدم بڑھانے لگا یہ بھی شکر تھا کہ سہارے کے لئے اردگرد جھاڑیاں پتھر تھے ورنہ سعیہ جیسی چھٹانک بھر لڑکی کا سرمہ بن جاتا گر کے، تھوڑی دیر بعد وہ اس تک پہنچ چکا تھا۔

''سعیہ۔'' اس کے جھکے چہرے کو ذرا سا اوپر کرتے تھے، وہ پکارا۔

''سعیہ تم ٹھیک تو ہو نا۔'' شہریار اسے چھوتے ہوئے بے یقینی سے کہا۔

''شہری پلیز، مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے، مجھے چھڑائیں ادھر سے۔'' سرتاپا بھیگی تیز بارش اور ہواؤں کے شور سے خوفزدہ وہ کپکپا رہی تھی، اس کے ملنے کی خوشی اور حالت کا ابتری دونوں کیفیات ایک ساتھ وارد ہوئی تھیں شہریار نے کانٹے دار جھاڑی میں الجھے اس کے دوپٹے اور کپڑوں کو آہستگی سے چھڑایا پھر بھی چرر چرر کی آواز کے ساتھ کئی جگہ سے وہ پھٹ گئے، سعیہ کے بازوؤں، پیٹ، ٹانگوں کے ساتھ چہرے پر بھی خراشوں اور کھرنڈ کے نشان پڑ چکے تھے مگر ان سب سے زیادہ تشکر آمیز بات یہی تھی کہ وہ دونوں کسی بڑے نقصان سے بچ چکے تھے اور ٹھیک ٹھاک تھے اسے اونچے راستے پر لاتے ہوئے قدرے ہموار زمین پہ کھڑا کر کے شہریار نے لمحہ بھر بجلی کی چمک سرد ہواؤں کے شور اور بارش کی تیزی کے ساتھ اس کے بدن کو لرزتے پایا تو اپنی جیکٹ اتار کر اس کے شانوں پر ڈالی پھر اپنے دائیں بازو کو اس کے شانوں پر دراز کرتے ہوئے اسے سہارا دے کر قدم ہوٹل کی جانب بڑھانے لگا وہ ہوٹل کے قریب ہی شوٹنگ کر رہے تھے سو فاصلہ اتنا نہیں تھا مگر سعیہ کی وجہ سے وہ کچھ دیر میں پہنچا جب وہ کمرے میں جانے لگے تو ان کا پورا یونٹ ہوٹل لابی میں پریشان ملا، وہ سب ان کے نہ پہنچنے پر تعجب و پریشانی میں گھرے منتظر تھے، شہریار نے مختصراً انہیں وجہ بتائی اور سعیہ کو لئے اپنے روم میں پہنچا۔

''تم بہت بھیگی ہوئی ہو میرا خیال ہے پہلے چینج کر لو۔'' نرم نگاہ اور قدرے سنجیدہ لہجہ، سعیہ کا دل بھر آیا کیا تھا جو اپنی انا کو بالائے طاق رکھ کر وہ اسے حوصلہ دینے کی سعی کرتا وہ بہت بوجھل دل کے ساتھ کپڑے لے کر واش روم میں گئی جاتے سے شہریار کا بھی ٹراؤزر شرٹ نکال کر اس کے قریب رکھا اور آہستگی سے بولی۔

''آپ بھی چینج کر لیں، زیادہ دیر بھیگے کپڑوں میں رہنے تو ٹھنڈ لگ جائے گی۔''

''رہنے دو یہ دکھاوا اگر تمہیں میری اتنی فکر ہوتی تو یوں منہ اٹھا کر سب کے بیچ سے چل نہ پڑتیں۔'' ترش لہجہ جس نے سعیہ کے وجود میں اذیت سی بھر دی، کیا وہ اسے بتا سکتی تھی کہ وہ کن جذبات کے تحت اٹھ کر چل پڑی تھی۔

''اگر مجھے یہ فکر نہ ہوتی کہ یوں اچانک تمہارے غائب ہو جانے پر میرے یونٹ کے لوگ کیا باتیں کریں گے تو ہرگز بھی تمہارے پیچھے نہ آتا۔'' وہ بھنایا ہوا بولا۔

ایک بار پہلے بھی تو وہ اسی ایڈونچر کے ہاتھوں خوار ہوا تھا اور گزرتے لمحات بے پہلے والا واقعہ یاد دلا کر اسے کچھ اور بھی تلخ کر دیا، سعیہ تحیر بے یقینی اور شدید دکھ کے ملے جلے تاثرات لئے اسے دیکھ رہی تھی، ابھی چند منٹ پہلے کیسا مہربان بنا تھا یہ شخص کہ اسے اپنے تمام خود ساختہ خول ٹوٹتے محسوس ہوئے تھے، وہ کتنا شانت ہوئی تھی یہ سوچ کر کہ اس کی زندگی اور وجود کو اہم گردانتا شہریار اسے تلاشتا آ پہنچا تھا، مگر اس پروا کے پیچھے ایسی سلگتی کیفیت چھپی ہے، یہ حقیقت تسلیم کرتے ہوئے اسے ایک بار پھر شدید دکھ ہوا اور وہ پتا نہیں کب، کیسے اس بے مہر اور سنگدل شخص کی اتنی پروا کرنے لگی تھی کہ اس کا کسی کے ساتھ ہنسنا بولنا برا لگا دل کو، وہ اسے اپنے ایڈ کی ماڈل کے ساتھ فرینک دیکھ کر کیسے کلس کر رہ گئی تھی، اسے اپنی دوستوں کے کمنٹس یاد آئے۔

''تم بہت خوش قسمت ہو تمہیں ایسا شاندار شخص ملا۔''

''کیا تھا جو اتنے شاندار بندے کے دل میں اللہ تھوڑی سی محبت اور نرمی بھی ڈال دیتا۔''

وہ اپنی قسمت اپنے خدا سے ایک بار پھر شاکی ہونے لگی، اس کا دل چاہا تھا وہ یہیں بیٹھی اسی پل دھاڑیں مار مار کر روئے، مگر خود پر قابو پایا اس بے مہر شخص کے سامنے کمزور نہ پڑنے کا عہد کرتی شاور کے نیچے پانی کے ساتھ بے تحاشا آنسو بہاتی رہی۔

☆☆☆

مشکل ترمحل وقوع، بلندی اور انتہائی دشوار گزار راستہ شدید موسمی اثرات کے باعث انہیں ہوٹل تک پہنچنے کے لئے زبردست جدوجہد کرنا پڑی، مگر یہاں پہنچ کر ان کی ساری سفری کوفت دور ہو چکی تھی، پہاڑوں کے سبزہ زاروں اور وادیوں میں دنیا بھر سے آئے سیاح رنگ برنگے خیموں میلہ لگائے ہوئے تھے، بھیڑ بکریاں گائیں یاک کے علاوہ جنگلی جانور، برفانی چیتا، مارموٹ اور مختلف رنگوں کے خوبصورت پرندے عام تھے، جبکہ گائیڈ معلومات دے رہا تھا۔

''ہوشے پاکستان کا وہ خوبصورت ترین خطہ ہے جسے دیکھنے کے بعد کسی بھی ملک کے باشندے بار بار آنے کی خواہش کرتے ہیں، ہوشے کی اس سحر انگیز خاصیت کی وجہ صرف ''مشہ بروم'' پہاڑ جس کا مطلب برف پوش پہاڑ کا ہے، یہ پہاڑ دنیا کے چار نہایت مشہور ٹریکس کا نقطہ آغاز ہے جن میں مشہ بروم بیس کیمپ، نغمہ ویلی ٹریک، کے سکس بیس کیمپ، کے سیون بیس کیمپ اور گونڈو گورو پاس سے کنکورڈیا یعنی کے ٹو بیس کیمپ ٹریک شامل ہیں یہ وہ خوابناک نام ہیں جو دنیا بھر میں پہاڑوں کے شائقین کے لئے متبرک سمجھے جاتے ہیں۔''

''ویسے سیاحوں اور کوہ نوردوں کی اکثریت تحقیقات، مصوری اور تفریح کے لئے اس علاقے کا انتخاب کرتی ہے اور جولائی جیسے گرم مہینے میں بھی یہاں صبح و شام گرم کپڑوں کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔''

ان تمام باتوں سے قطع نظر ماریا پاکستان کے اس پسماندہ اور غریب ترین علاقے میں بنیادی سہولیات کی غیر دستیابی، تعلیم و ہنر سے بہرہ باشندے اور زمینی موسمی غیر موزوں زرعی حالات کے باوجود یہاں کے ''میزبانوں'' کو سراہتی رہی جو انتہائی مہمان نواز، شائستہ ملنسار اور خوش خلق تھے، مشرقی ہمالیہ

کے پہاڑوں میں واقع دنیا کا سب سے بڑا چائے کا باغ بھی دیکھا۔

یہ نجی باغ 1859ء میں بنا اور آج 1677 ایکٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے اس کے ساٹھ فیصد رقبہ پر چائے کے پودے اُگے ہیں تو باقی رقبہ حیوانات، نباتات اور کارکنوں کی رہائش کے لئے مخصوص ہے (Makaibari) ماکائی باری ایک منفرد تفریحی مقام بھی تھا سیاحوں کے لئے رہائش و سیر و تفریح کا معقول انتظام تھا، موسم نہایت خوشگوار جیسے تپتے صحرا سے ایکدم ائرکنڈیشنڈ کمرے میں آ گئے ہوں انہوں نے بہ چشم خود دیکھا کہ رس دار اور تازہ سبز پتے کیونکر چائے کے سیاہ، سبز اور سفید گندل دانوں میں تبدیل ہوتے ہیں، ان سب نے چائے کی پتیاں توڑ کر ٹوکری میں ڈالنے اور چائے کا پودا لگانے کا شوق بھی پورا کیا بلکہ ان مناظر کی تصویر کشی بھی کی، کچھ مہم جو سیاح گائے، بھینس کا دودھ نکال رہے تھے، یہاں ہمالیائی پرندے چتکبرا، ابوقرن اور سلطان پھد کی بھی دیکھے، بغیر کھادوں کے اُگائی جانے والی سبزیاں بھی اور خوشبو سے مہکی چائے بھی پی۔

ٹورسٹ گائیڈ کے مطابق اسی باغ میں دنیا کی مہنگی ترین چائے مسکیٹل (Muscatel) بھی اگائی جاتی ہے اس کی ایک کلوگرام پتی عالمی مارکیٹ میں 55 تا 60 ہزار روپے میں فروخت ہوتی ہے۔

یہیں سے واپسی پر عدیل اور راحیل کا کالز اور ٹیکسٹ میسج موصول ہوئے جن میں صبا کے ساتھ گزرنے والے حادثہ کی اطلاع نے ان کے حواسوں پر بجلی سی گرا دی، وہ فوراً سے پیشتر واپسی کے لئے سفر بہ بعید ہو گئے، ان کی پریشانی کے سبب یہ قافلہ واپس اسلام آباد کوچ کے لئے تیار ہو گیا، وہ دونوں تو اپنے گروپ سے علیحدہ روانہ ہو گئے، سیدھے لاہور اور باقی لوگ اگلے دن گئے تاہم جاتے جاتے بھی وہ بالاکوٹ، شنوگران سے گزرے تو خوابوں، خیالوں اور طلسماتی دنیا کی سیر کراتی پاکستان کی خوبصورت ترین جھیل سیف الملوک بھی دیکھی، وہ رات بھر یہیں ٹھہرے، سطح سمندر سے دس ہزار پانچ سو اٹھہتر فٹ بلندی پر واقع اس جھیل کو دیکھ کر بے اختیار منہ سے سبحان اللہ نکلتا ہے، ماریا نے قریبی پہاڑی پر چڑھ کر جھیل کو دیکھا تو اردگرد بہنے والے ٹھنڈے اور شفاف پانی کے چشمے دلکش اور خوبصورت پھولوں، دریاؤں، جھیلوں، حسین قدرتی مناظر نے طلسم سا طاری کر دیا۔

''ایسا لگتا ہے خدا نے جنت زمین پر اتار دی۔'' وہ بے اختیار کہتی ان یادگار لمحات اور مناظر کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرنے لگی جبکہ مقامی لوگ انہیں پہاڑوں پر چڑھنے کے اصول بتا رہے تھے کہ سیدھا اوپر نہیں بلکہ زگ زیگ چلیں اور چڑھائی چڑھتے ہوئے اگر اپنے ہاتھوں سے کولہوں کی ہڈیوں کو سہارا دیں اور لمبی سانسیں لیں تو نسبتاً آسانی ہوتی ہے اور اپنے ساتھ خشک خوبانی ضرور رکھیں کیونکہ آکسیجن کی کمی ہے جلد تھکن طاری ہو جاتی ہے جبکہ خشک خوبانی اس کا بہترین علاج ہے، لیکن ساتھی سٹوڈنٹس کے طوفان بدتمیزی میں یہاں وہاں سنتا کون؟ اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دھن میں وہ تھوڑی دور پہنچ کر ہانپنے لگے تھے، خدا خدا کر کے جھیل کے درشن ہوئے تو کھانا کھا کر تھوڑا استانے کے بعد سب چہل پہل اور فوٹو گرافی کرنے لگے، یہاں ایسے مقامی لوگ بھی تھے جو جھیل سے منسلک شہزادے اور پریوں کی رومانی داستانیں سنانے کے پیسے لے رہے تھے اور سب سے مشہور قصہ سیف نامی شہزادے حسین پری بدیع الجمال کی اس جھیل پہ ملاقات کا تھا جسے اکثر لوگ اور سیاح ذوق و شوق سے سن رہے تھے۔

اپنی آخری پڑاؤ پہ مڑتے ہوئے انہوں نے اسلام آباد سے 160 کلو میٹر فاصلہ پر واقع کھیوڑہ نمک کی کان بھی دیکھی جو لاہور سے 260 کلو میٹر دور ہے۔

نمک کی اس کان کو جنوبی ایشیا کی قدیم ترین اور دوسری بڑی کان کہا جاتا ہے جب سکندر اعظم 322 ق م میں اس علاقہ میں آیا تو اس کے گھوڑے یہاں کے پتھر چاٹتے ہوئے دیکھے گئے، ایک فوجی نے اسے چاٹا تو نمکین پایا، یوں یہ کان دریافت ہوئی، زیر زمین ایک سو دس مربع کلو میٹر رقبہ پہ پھیلی انیس منزلیں رکھنے والی اس کان میں کچھ عمارات بھی تھیں، ایک کینٹین یہاں کھانے پینے کی معیاری اشیاء دستیاب تھیں، نمک کی ایک مسجد جو بجلی کے قمقموں سے روشن تھی، ڈاکخانہ، کلینک اور نمک کے تالاب جس میں کوئی چیز نہیں ڈوبتی، اس بات کی تصدیق کرنے کے لئے پانی کی بوتلیں اور ڈبے انہوں نے بھی پھینکے، زیر زمین سرنگ کو ایک مرکزی راہ پہ یستوران کی شکل بھی دے دی گئی تھی۔

اسی علاقے میں انہوں نے کٹاس راج کے شاندار آثار بھی دیکھے جسے یونیسکو نے عالمی ورثہ کا درجہ بھی دے رکھا ہے، یہ ہندو دیوتا شیوا کا مندر ہے اس خطے کو دیکھتے ہوئے پتا چل رہا تا کہ پاکستان متنوع ثقافتوں، تہذیبوں اور مذاہب کے ماننے والوں کا وطن ہے سکھوں، ہندوؤں، انگریزوں اور بدھوں کے اثرات نقوش، تعمیرات اور رسوم و روج میں ان کی تہذیب کا عکس نمایاں نظر آرہا تھا، کٹاس میں اس وقت سات مندر اور ایک بدھ اسٹوپا کے آثار موجود تھے، ماریا بہت دلچسپی غور اور شوق سے ٹورسٹ گائیڈ کے ہمراہ گھومتی اس نقطہ کے متعلق معلومات لے رہی تھی۔

اس کے تحقیقی و سیاحتی شوق کے پیش نظر گائیڈ تفصیلی بتا رہا تھا کہ کٹاس کا لفظ دراصل سنسکرت کے کٹا کشا سے ماخوذ ہے جس کا مطلب برستی ہوئی آنکھیں ہیں کہتے ہیں کہ مندر کے ساتھ موجود تالاب دراصل شیوا کے آنسو ہیں جو اس نے اپنی بیوی کی موت پر بہائے تھے، ان آنسوؤں سے دو تالاب وجود میں آگئے کٹاس اور نینی تال، روایتی طور پر یہاں مہا شیوا رتری کا تہوار بھی منایا جاتا ہے، جس کا مطلب ہے ''شیوا کی رات'' شیوا کو ہندو دھرم کے ماننے والے فنا کرنے اور دوبارہ پیدا کرنے والا دیوتا سمجھتے ہیں، ہندو عقیدے کے مطابق یہ تہوار تین وجود کی بنا پر منایا جاتا ہے، ایک سدا دیوتا جس کی کوئی شکل نہیں وہ آدھی رات کے وقت نمودار ہوا اور دوسرے اس نے پاروتی سے شادی کی تھی جو انسانی روح کے دیوتا سے ملنے کی علامت ہے، تیسرے شیوا دیوتا نے ایک مہلک زہر پی کر حلق میں روک لیا تھا، زہر کا ایک قطرہ بھی اگر اس کے پیٹ، جو کائنات کی علامت ہے، تک پہنچ جاتا تو دنیا ختم ہو جاتی اس لئے ہندو مہا شیوراتری کی رات کو دنیا کو بچانے کے لئے شیوا دیوتا کا شکریہ ادا کرنے کے طور پر منایا جاتا ہے۔

یہ یاتری رات بھر جاگ کر شیوا کی پوجا کرتے بھوکے رہتے ہیں اور یہاں موجود تالاب میں نہاتے ہیں، ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وہ ایسے لگن سے کریں تو گناہوں سے پاک ہو جاتے ہیں۔

پاکستانی تہذیب و ثقافت کے ساتھ مسلمانوں کا طرز معاشرت، حسن سلوک اسلامی تعلیمات اور وحدانیت پر مداومت و استقامت دیکھ کر ماریا کا پختہ ارادہ تھا کہ لاہور جاتے ہی وہ سب سے پہلے قرآن کے چینی و انگلش ترجمہ پڑھنے کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے درس کا بھی پروگرام اٹینڈ کرے گی اور بذات خود دیکھے گی کہ اسلامی تعلیمات کا اصل کیا ہے، لوگ اسے کیسے لیتے، پہنچاتے اور ماننے کا اہتمام کرتے ہیں پھر توریت، انجیل اور زبور، بائبل سے قرآن کا موازنہ کرنا اس کا سب سے اہم کام تھا جسے

سچائی پر کھنے کا وہ آخری حربہ مانتی تھی اور یہ کام اب اسے جلد انجام دینا تھا، کیونکہ ان کا وقت تھوڑا تھا، یہاں stay کا۔

☆☆☆

ان کی گاڑی گھر کی طرف جانے والے راستوں پر رواں دواں تھی، گھر سے فاصلہ جتنا کم ہو رہا تھا ذہنی انتشار اتنا بڑھتا جا رہا تھا، سیل فون کان سے لگائے وہ مما پپا سے رابطے میں تھے اور جیسے ہی وہ گھر پہنچے تو خود پہ قابو پانے کی تمام کوششیں جیسے رائیگاں ہو گئیں، صبا ان کی پیاری اور لاڈلی بہن اپنے بیڈ روم کے وسط میں آرام دہ بیڈ پر کراؤن سے ٹیک لگائے ساکت بیٹھی تھی، خاموش بالکل جامد دونوں بھائیوں کے قدم بوجھل انداز میں آگے بڑھ رہے تھے، بیتتے لمحات کا اضطراب بے چینی جیسے مزید بڑھ گئی، صبا کے بالکل سامنے آ کر دونوں نے اسے دیکھا ایک نے سر پر اور دوسرے نے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا، صبا کے پتھر وجود میں بہت آہستگی سے حرکت ہوئی تھی، اپنی بند پلکیں کھولتے ہوئے اس نے دیکھا تھا۔

جان چھڑکنے، خیال رکھنے، ہر خوشی کا احساس کرنے والے بھائی سامنے تھے اس کی ویران آنکھوں میں گہری اذیت، تکلیف اور بے بسی کا شدید ترین احساس جاگا تھا، عجب اضطراری انداز میں اس نے دونوں کے ہاتھ تھامے اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی عدیل نے ضبط سے لب بھینچے سرخ آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھا اور راحیل اس کی آنکھوں سے گرم گرم پانی لکلا تھا۔

کتنے بے بس تھے وہ اس وقت، بہن کی یہ حالت دیکھنے کی سکت نہ تھی، کتنا درد اٹھتا محسوس ہوا تھا اس لمحے دل میں وہاج حسن جو صبا کی خیریت دریافت کرنے آیا تھا جیسے دروازے کے بیچوں بیچ پتھر کا ہو گیا، لاؤنج میں متفکر پریشان بیٹھے عفنان علی خان، شائستہ بیگم، حیدر صاحب، نزہت بیگم اور ڈاکٹر اندر صبا اور اس کی دلگیر فکلی بھائیوں کا اضطراب۔

''کیا اس سب کا ذمے دار میں ہوں؟'' اس نے نگاہوں میں جمے منظر کو لے کر خود سے سوال کیا۔

''اگر ان لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کی لاڈلی نازوں پلی بیٹی کی اس حالت کا ذمہ دار میں ہوں تو......شاید ہی مجھے اگلا سانس بھی نہ لینے دیں۔''

اس نے ایک جھر جھری سی لی اور آنکھوں میں عجیب پچھتاوے کا احساس جاگا تھا ست نیم جاں قدموں سے چلتا وہ واپس پلٹا تھا اور لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا، صبا کی جان بچانے کے حوالہ سے وہ اس امیر کبیر فیملی میں معتبر اور اپنائیت والا مقام حاصل کر چکا تھا سب لوگ اسے خصوصی پروٹوکول دیتے تھے وہ گھر ہی کے فرد کی مانند بے دھڑک آ کر سب کے بیچ بیٹھ جاتا روزانہ شام کو اس کی ماں اور کوئی نہ کوئی بہن بھی صبا کا پتا لینے آتیں، حیدر صاحب اور نزہت بیگم ان سب کے رویے و خلوص کے مداح ہو چکے تھے، ایسا وقت کہ جب اپنے ان کی بیٹی کو اپاہج جان کر ٹھکرا کر چلتے بنے وہاج کی فیملی کا صبا کے ساتھ خصوصی نرم برتاؤ دلجوئی اور حوصلہ دینا وہ متاثر ہونے کے ساتھ بہت کچھ بدلتا محسوس کر رہی تھیں۔

عدیل اور راحیل خود ڈاکٹرز سے صبا کا کیس ڈسکس کر رہے تھے، اپنے ہاتھوں سے سوپ پلاتے، کھانا کھلاتے، چٹکلے سناتے مگر مسکراہٹ کی ہلکی سی رمق بھی اس کے چہرے پر نہ جاگتی، مروت برتتا انداز سنجیدہ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی رہتی، وہ کمزور ہو رہی تھی بے حد ذہنی جسمانی اور روحانی طور پر اس کی سوچ کے سب زاویے منتشر تھے، دیکھنے بولنے کے سب انداز بیگانے تھے اور خود کو زندہ محسوس کر کے

جینے کی خواہش وجستجو رکھنے والی رمق ناپید تھی، جان چھڑکنے والے بھائیوں کے لئے بہن کو اس کیفیت میں دیکھنا قابل قبول نہ تھا اور اس کا مستقل یوں رہنا مسئلے کا حل بھی نہ تھا مگر وہ چاہ کر بھی کچھ نہ کر پا رہے تھے۔

''مما وہ یوں کیوں ری ایکٹ کر رہی ہے، چپ گم صم بلائیں تو متوجہ نہیں ہوتی بات کریں تو گفتگو میں حصہ نہیں لیتی، سوال پوچھیں تو جواب نہیں دیتی۔'' نٹ کھٹ سا راحیل با قاعدہ روہانسا ہو پڑا۔

ڈاکٹر نزہت نے ہاتھ کی پشت سے بھیگی آنکھوں کو رگڑا تھا اور بولی تھیں۔

''وہ ایک لڑکی ہے راحیل اور لڑکی کے لئے اس کی سیلف ریسپکٹ کیا معنی رکھتی ہے، تم سمجھ نہیں سکتے، عین شادی سے دو دن پہلے یہ حادثہ اور اس کے بعد بدلتی صورتحال تمہاری پھپھو کا رویہ پھر اپنی مستقل معذوری کا احساس صبا کے لئے یقیناً یہ سب فیس کرنا آسان نہ تھا، اس کے لئے یہ بات کسی بھی طرح سے معمولی نہیں ہے کہ اس حادثے سے وہ اعتماد کھو بیٹھی ہے اس کے رشتے میں تناؤ پہلے جیسے نہیں رہے یہ حقیقت اس کی تمام حسیات اور کیفیات پر حاوی ہے۔'' ڈاکٹر نزہت کا لہجہ بیٹی کے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔

''لیکن مما ہمیں اسے زندگی کی طرف لانے کی کوشش کرنی چاہیے، وہ اپنے ہی گھر میں اپنے خونی رشتوں کے بیچ یوں گھٹ گھٹ کر کب تک جیتی رہے گی، ہم کب تک اسے بستر پر پڑا دیکھتے رہیں گے، آخر کب تک؟''

''میں نے صرف پاکستان نہیں بیرون ملک سے آئی ڈاکٹرز کی ٹیم سے خود صبا کا کیس ڈسکس کیا ہے میں ایک ماں ہی نہیں ڈاکٹر بھی ہوں، تم کیا سمجھتے ہو کہ بیٹی کا مسئلہ ہے اور میں خاموش بیٹھی ہوں نہیں میری جان یہ میری لاڈلی کی زندگی کا مسئلہ ہے اور میں اس پہ ہر ممکن حد تک سعی کر رہی ہوں مگر حقیقت یہی ہے کہ صبا کے لئے حالات پہلے جیسے کرنے میں وقت درکار ہے، وہ جس کیفیت میں ہے یہ فزیکلی، مینٹلی، سائیکی ٹینشن کا ایک فیز ہے، اس میں زور زبردستی سے کچھ نہیں کیا جا سکتا، نہ اس فیز سے فوری طور پر نکالنا ممکن ہے اسے، وہ اپنی اس کیفیت سے خود باہر آئے گی جب وہ دیکھے گی کہ مجھے کوئی ناکارہ بے کار وجود سمجھ کر نظر انداز نہیں کرتا، سب مجھے اہمیت دیتے ہیں، مفید سمجھتے ہیں، اسے اپنی کوشش سے باہر آنا ہے اس کیفیت سے اسے زبردستی یا تیزی سے ہم نکالنے کی کوشش کریں گے تو بے کار اور فضول ہو گی۔''

''مما سعیہ آپی کو اس وقت یہاں ہونا چاہیے تھا، وہ صبا سے بہت کلوز ہیں بہتر طور پر اس صورتحال کو ہینڈل کر سکیں شاید۔'' عدیل بولا۔

''سعیہ کا یہاں ہونا واقعی صبا کے لئے مفید اور اہم ثابت ہو سکتا ہے مگر سعیہ کو یہ سب بتایا نہیں گیا ہے کیونکہ وہ دوبئی میں ہے اور شہریار کے اس سے آپسی معاملات کچھ مس انڈر سٹینڈ ہیں شادی کے بعد وہ لوگ پہلی بار کہیں اکٹھے ٹریول پر نکلے ہیں، تو ہو سکتا ہے ان کے معاملات درست ہو جائیں، اسی جذبہ خیر سگالی سے میں نے خود شائستہ کو منع کیا تھا کہ سعیہ یا شہریار کو کچھ نہ بتائے اکیلی آئے۔''

''اور سعیہ آپی نے خود سے contact نہیں کیا۔''

''کیا ہے کئی دفعہ صبا کا موبائل آف رہتا ہے وہ گھریلو سیٹ پر بات کرتی ہے، اسے شادی کے لیٹ ہونے کا بتایا گیا ہے اصل صورتحال کا کچھ نہیں پتا اسے۔''

''تو پھر مما کیا کریں ایسے، زندگی اس کے لئے پہلے جیسی نہیں رہی وہ موت کو شکست دے آئی ہے

مگر زندگی سے ہار رہی ہے اور ہمیں اسے ہارنے نہیں دینا، اگر آج وہ ہمت ہارتے کمزور پڑ گئی تو اس کا کھویا اعتماد کبھی واپس نہیں آ سکے گا، ہمیں اپنے طرز عمل اور رویے سے اس کی will power مضبوط بنانا ہے اس کا self confidence واپس لانا ہے۔'' عدیل کا مدہم لہجہ اضطرابیت لئے ہوئے تھا، نزہت کی آنکھوں کے کنارے بڑی خاموشی سے بھیگے تھے اور وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی اٹھی تھیں، ڈاکٹر اور سائیکاٹرسٹ کیتھرین ڈیوڈ نے صبا کو دیکھ کر کہا ہے، کہ ''اس کا ذہن غیر متوجہ کیفیت میں ہے جبکہ توجہ ہی شعور کو واضح اور روشن بناتی ہے۔'' تم نے دیکھا نہیں اس کا ذہن مہمک نہیں وہ اپنے ماحول، اردگرد رشتے، تعلقات ہر احساس سے عاری اور لاتعلق نظر آتی ہے، اس کا عصبی و اندرونی نظام ہی postural adjustment سے طاقت توجہ کے عمل بہتر اور واضح بنا سکتا ہے اور اس کے لئے صبر کی ضرورت ہے۔''

عدیل اور راحیل نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے متفکر انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

☆☆☆

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ وقت کو گزر جانا ہے وقت اور لحات کو قیام میسر نہیں مگر زندگی میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو گزر جانے کے باوجود ہمارے اندر سانس لے رہی ہوتی ہیں، کچھ رشتے وقت کی طرح ہماری مٹھی سے پھسل جاتے ہیں اور ہمیں خبر تک نہیں ہوتی، رشتے بھی تو کچے دھاگے کی طرح ہوتے ہیں، ذرا سی بے رخی اور لحوں کی تپش سے پگھل کر ٹوٹ جاتے ہیں، اس کے صرف خونی نہیں ذاتی نہیں، دنیاوی نہیں، دلی رشتے ٹوٹے تھے، ہر رشتے تعلقات کے پگھلنے میں محبت کا رشتہ بھی داؤ پر لگ گیا کچھ اتنی اچانک اور جلد کہ کب کیوں، کیسے جیسے الفاظ و سوال انہونی کے تحیر و اذیت میں گم ہو کر رہ گئے، اس نے سنا تھا کہ جب کسی آدمی کو اپنی بساط سے زیادہ دنیا مل جاتی ہے تو لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ برا ہو جاتا ہے، آج اس کا مظاہرہ خود دیکھا تھا بلکہ یہ تجربہ اس کی اپنی ذات کے ساتھ برتا گیا تھا اور زندگی کا نقصان یہ نہیں تھا جو اسے ذاتی دکھ سے رلا گیا بلکہ نقصان تو وہ تھا جو کسی کی نظر سے گرا گیا اور اس نقصان کے بعد باقی سب نقصان اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئے تھے، یہاں تک اپنے کردار و عمل کا چھن جانا بھی کبھی وہ دولت، محبت سے زیادہ عزت کو ترجیح دیا کرتی تھی اور یہ سوچا کرتی تھی کہ کردار ہی وہ عکس ہے جس کے آئینے میں شیطان اور رحمان مل سکتا ہے اور اس میں بال برابر فرق ہے اگر یہ فرق ثابت قدمی سے طے کر لیا جائے تو جنت آخرت میں اور بادشاہت دنیا میں مل جائے، اگر وہ آنکھیں بند کر کے ایک منٹ بھی یہ سوچتی کہ اس سے کردار اور عمل چھن جائے تو کیا ہو گا جو اس کی شخصیت کا مضبوط حوالہ بن سکے۔

اریبہ اشفاق کو لگتا تھا اس کے وجود میں زلزلے برپا ہو گئے ہیں، وہ ایک جھرجھری لے کر خود کو اس سوچ سے دور رکھنے کی کوشش جھٹکتی، مگر یہ تب کی بات تھی جب وہ اریبہ اشفاق تھی اب کی نہیں جب وہ ''مایا'' کے نام سے شوبز جوائن کر چکی تھی اور خان انڈسٹریز کے سب سے بڑے پراجیکٹ ساؤتھ ایشین کلچر ایونٹ ود کلچر و ماڈلنگ ایگزیبیشن میں اس کی فرسٹ انٹری بڑے زبردست طریقہ سے ہونا تھی سعود غوری کی کمپنی کے ایڈ کی شوٹنگ اور ماڈلنگ ایگزیبیشن کے لئے اس کی تیاری و ریہرسل زور و شور سے جاری تھی فی الحال اس کا نام انٹری ویوز اور کام سب صیغہ راز میں تھا، سوائے چند ایک کے کسی کو معلوم نہ تھا کہ ایک بے حد خوبصورت حسین ترین ملکوتی حسن اور شاہانہ خدوخال کی مالک کوئی لڑکی نیو انٹری کے طور پر شوبز اور

میڈیا پہ چھانے جارہی تھی۔

☆☆☆

شائستہ بیگم اور شہریار نے کچھ حیرت کچھ خوشی کے ملے جلے تاثرات اور پذیرائی و حوصلہ افزائی کے الفاظ لئے اس کے فیصلہ کو سراہا تھا، جویریہ، ربیعہ نے نم آنکھوں، دکھے دلوں سے اس کی کامیابی مانگی تھی، طیبہ نے اسے شوبز جوائن کر لینے پہ شدید مسرت اور خوشی سے مبارکباد دی۔

"میں نے دنیا کی فکر کی رشتوں کی پرواہ کی، محبت کی معتبر جانا مگر مجھے کسی احساس نے سہارا دیا نہ تھاما، اپنی اپاہج زندگی کو چلانے کے لئے احساس کی ٹوٹی بیساکھیاں لے کر میں نے غم کو گھسیٹتے خود کو بچانے کی بڑی کوشش کی، خاموشی مصلحت اور نیک نامی کا دامن سسک سسک کر بھی تھامے رکھا مگر دنیا رشتے اور محبت نے میری خاموشی، مصلحت اور نیک نامی کو میرے ٹوٹے خوابوں، بکھرے رشتوں اور زخم زخم وجود کا مرہم نہ بننے دیا، میری ایک غلطی نے ساری نیک نامی خاک میں ملا دی، میرے آنسو، میرا تڑپنا، سسکنا، میری دہائیاں میرے ناکردہ جرم کا کفارہ نہ ہو سکے، وہ جرم جو میں نے کیا نہیں، اسے مجھ پہ مسلط کر کے مجھے اپنی نگاہوں میں مجرم بنا کے معتوب ٹھہرا دیا گیا اور کانٹوں سے بنی رہ گزر پہ خود کو گھسیٹتے، تلخ ہوتے، دلبرداشتہ ہوتے میں اتنا تھک چکی تھی کہ اس کے بعد ملنے والے پے در پے صدمات نے میرے ہر احساس کو مفلوج کر دیا، وہ جو کسی نے کہا ہے کہ۔"

مسلسل حادثوں نے وہ بے حسی بخشی ہے
کوئی چھوڑ کر چلا جائے اب غم نہیں ہوتا

"جب دنیا، تعلقات، رشتے، محبتوں نے مجھے ہر جگہ ہر مقام پہ تنہا چھوڑا میری لاچاری و بے بسی کا تماشہ دیکھا تو میں کیوں خود کو ان کا سوچتے، خوف کھاتے بھوک و ننگ کے مرقد پہ بیٹھی رہوں، ان چیزوں نے مجھے سنبھالا نہیں دیا میں ان کے ڈر سے خود کو گناہگار سمجھتی اپنے گھر سے اٹھتے جنازے دیکھتی رہوں، نہیں طیبہ یہ میرے لئے مشکل بہت مشکل تھا، شوبز جوائن کرنے کا فیصلہ کٹھن تھا، ناممکن تھا مگر بہت سے اسباب نے اسے آسان اور قابل قبول بنا دیا۔" وہ کچھ دیر کو خاموش ہوئی، دو تین گھونٹ پانی کے پیئے گہرا سانس لیا۔

"وہاج حسن وہ شخص تھا جس نے یہ کام میرے لئے آسان تر کر دیا کیسے؟" وہ پھر سے چپ ہوئی چند لمحات کے لئے ملال کی کیفیت اس کے چہرے پر دو چند اور گہری ہوئی خود کو کچھ دیر تک کمپوز کرنے کے بعد وہ بولی۔

"وہاج حسن وہ شخص جسے اپنے وجود کی نفی کر کے میں نے ٹوٹ کے چاہا تھا، اسے مطمئن پرسکون خوشحال زندگی جیتے دیکھنا اس کے ساتھ رہنا بسنا چاہتا بہت سادہ سے خواب تھے میرے، محبت آسمانی تحفہ تھی نصیب کی عطا جیسے وہ سنبھال نہیں پایا اسے جب تک میری ضرورت تھی تو استعمال کرتا رہا، ضرورت ختم ہوئی تو ٹھکرا دیا، مجھے کہنے دو طیبہ کہ وہاج حسن وہ بدنصیب ہے جس نے محبت کو اپنے در سے خالی ہاتھ لوٹایا وہ میری سچائی کو پرکھ نہیں سکا، اپنے نازک دل پر نارسائی کا کرب اٹھائے بیچ راستے سے لوٹنا میرے لئے کتنا کٹھن تھا اس نے ایک بار ایک پل کو نہیں سوچا کوئی درد کو لمحہ لمحہ قطرہ قطرہ کر کے وہ میرے اندر اتارتا تو مجھے تکلیف نہ ہوتی جتنی تکلیف شک کے زہر، بے اعتباری کی شرمناک تضحیک اور نارسائی

کی اذیت کو ایک ساتھ اپنے اندر اتارتے ہوئی تھی، کتنا مانوس تھی میں اس کے گھر کے در و دیوار سے وہاں بستے رشتوں سے اور محبت سے پل میں سب پرایا ہو گیا۔" اس کی بے تحاشا خوبصورت آنکھوں سے آنسو ٹپاٹپ بہہ رہے تھے آواز بھاری، تھکی ہوئی اور بوجھل ہو رہی تھی مگر وہ بولے گئی۔

"واپسی کا ہر راستہ محبت کا ہر امکان اور معافی کا کوئی لمحہ میرے لئے نہیں بچا تھا، اس حقیقت کا انکشاف کتنا جان لیوا تھا بچپن کی دوستی محبت جذبے خواب کتنا کچھ تھا جس نے ان ساعتوں میں ماتم کیا تھا، اپنی بے قدری کا اور میں ساکت کھڑی رہی تھی۔" آنسوؤں نے اسے کچھ دیر کو روک دیا، وہ ہچکیاں لینے لگی طیبہ نے تاسف سے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے اسے دیکھا جو بذریعہ نیٹ سامنے تھی۔

"میں سوچتی تھی محبت واحد شے ہے جسے ابدیت حاصل ہے یہ نہ مر سکتی ہے نہ بے وفا ہو سکتی ہے میں سوچ ہی نہ سکتی تھی کو زوال آ سکتا ہے مگر یہ دنیا ہے یہاں کوئی بھی نظریہ خیال رائے ناممکن نہیں یہ پتا چلا تو اپنے انتہائی نقصان کا شدید احساس ہوا، اسی احساس نے میری فیلنگز کو ٹریپ کیا میں بنا کچھ کیے بری تھی تو کچھ کر کے بری بننا بہتر تھا کم از کم دکھ تو نہ ہوتا اور ویسے بھی احساس کی دنیا میں ہر کیفیت بے معنی ہو جائے تو اچھے برے کی تمیز خود بخود مٹ جاتی ہے، اب جو ہے جیسا ہے جس طرح ہوتا ہے وہ مجھی کو کرنا ہے تو اپنے قاعدے سے دوسروں کے نہیں۔"

آنسو پونچھتی وہ بولی تو لہجہ مضبوط اور اٹل تھا جو اس کے سنجیدہ ہونے کی دلیل دے رہا تھا، طیبہ نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے اسے Good will کا اشارہ دیا تھا جواباً وہ وکٹری کا نشان بناتے ہوئے خود بھی ہنس دی ایک پھیکی اور بے جان ہنسی۔

☆☆☆

سعیہ کے آنے تک وہ کھانا سامنے رکھے منتظر بیٹھا تھا۔

"یہ میرا انتظار کر رہا تھا۔" دل میں خوش فہمی نے سر اٹھایا تبھی دروازہ کھلا اور اس کی ماڈل اندر آئی۔

"سوری شہری تمہیں ویٹ کرنا پڑا میں ذرا میک اپ صاف کر رہی تھی۔" بے تکلفانہ انداز جو سعیہ کو ہضم کرنا مشکل لگا۔

"ویسے سعیہ تم بہت خوش قسمت ہو تمہیں اتنا نائس بندہ ملا جو اتنا کیئرنگ ہے۔" اب وہ اس سے مخاطب تھی۔

"خوش قسمتی شوہر کے دل میں رہنے سے ہوتی ہے، کاغذ کے پرزے پر ہاں کہہ کے نام لکھنے سے نہیں۔" سعیہ نے کرب سے سوچا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

"بھئی آؤ نا تم کھڑی کیوں ہو کھانا کھاؤ۔" اس نے سعیہ کو مخاطب کیا پھر شہریار کو دیکھا اور بولی۔

"اپنی مسز کو شامل کرو ساتھ عجب بندے ہو تم اکیلے شروع ہو گئے۔" پتا نہیں وہ جتا رہی تھی یا اسے احساس دلا رہی تھی مگر سعیہ کو سمجھ نہ آئی کہ اسے کیا کرنا چاہیے جبکہ بھوک بھی لگ رہی تھی پھر خاموشی سے انا و سوچ کے انبار کو پرے کرتی وہ ان کے برابر بیٹھ گئی یہ الگ بات کہ ہر لقمے کے ساتھ کئی آنسو بھی اس کے اندر گرتے رہے، کھانے کے بعد چائے پی گئی شہریار اور اس کی ماڈل کتنی دیر اگلے شوٹ کی ڈیٹیل ڈسکس کرتے رہے اور وہ بارش کو چھو کر آتی ٹھنڈی ہوا سے ابھرتی دلفریب پھولوں کی خوشبو کو اپنے اردگرد پھیلتے دیکھتی رہی، اپنی ماڈل کو رخصت کر کے شہریار واپس آیا تو سعیہ نے خواہش کی۔

"ہم اپنے کمرے سے باہر نکل کر بارش کو دیکھ سکتے ہیں؟"
"نہیں موسم بہت سرد ہے، بیمار پڑ جاؤ گی۔"
"اگر تمہارے اور میرے درمیان اس وقت اتنے فاصلے اور اس کاغذی رشتے کی تلخی نہ ہوتی تو اس وقت یہ ماحول کتنا گلرنگ ہوتا، تم میں ہم کتنے خوش ہوتے۔" نمی کا اک غلاف تھا جو اس کی نگاہوں کے سامنے پھیلنے لگا شہریار نے دیکھا اور مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔
"او کے اٹھو چلیں باہر۔" سعیہ نے کسی قدر حیرت سے دیکھا تھا، اسے یقیناً اس سے اتنی مہربانی کی توقع نہ تھی، لیکن وہ مزید حیرت زدہ ہوئے بغیر اٹھ کر چلنے لگی۔
مبادا کہ شعلہ و شبنم رویہ رکھنے والے اس بندے کا موڈ بدل جائے، باہر سردی واقعی بہت زیادہ تھی مگر وہ عجیب بے خودی کے عالم میں بارش کے قطروں کو ہاتھ کی اوک میں لے کر اچھالتی یا چہرے کو گیلا کرنے لگتی، ٹھنڈ کی شدت انتہا پر تھی اور سعیہ کے ہونٹ سردی کی شدت سے نیلے ہو کر کپکپا رہے تھے، مگر چہرہ بہت خوشی کا تاثر دے رہا تھا، ہوٹل کے کاریڈور اور بیرونی اطراف میں رکھے گملوں میں کھلے پھولوں کی خوشبو بھیگے موسم سے سنور کر سارے ماحول کو معطر کر رہی تھی۔

ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے
مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے
ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے
روٹھے اگر تم تو کیا ہو
پل میں ایسے لگے جسم سے جان جیسے جدا ہو
ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے
مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے

کشور کمار کی خوبصورت آواز فضا کے دوش پر لہراتی ان کی ساعتوں کو خواب کرنے لگی، شہریار مسکراتی نگاہوں سے پلر سے ٹیک لگائے کھڑا دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں پھنسائے سعیہ کو دیکھ رہا تھا۔

ذرا پوچھو تو میرا ارادہ
میرے دل کا کون شہزادہ
میرے خوابوں میں جو سج رہا ہے
وہ خدا تو نہیں پر زمانے میں سب سے جدا ہے

سعیہ اس کی طرف بالکل متوجہ نہ تھی شہریار چند قدم آگے بڑھا اور اس کے قریب آ کر جو برستے موتیوں سے کھیل رہی تھی۔

زندگی بن تمہارے ادھوری
تمہیں پا لوں اگر
ہر کمی میری ہو جائے پوری

اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھتے ہوئے نگاہ خاص سے دیکھا اور بڑی دلکشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"موسم، وقت، ماحول اور یہ گیت Its so romantic۔"
"تو......؟" سعیہ نے ذرا کی ذرا اسے دیکھا اور خود کو چھڑا کر پھر سے بارش سے کھیلنے لگی۔
"آؤ محبت سے دامن بھر لیں، خوابوں، خواہشوں سے کھیلیں۔"

لے چلیں گے تمہیں ہم وہاں پر
تنہائی صنم شہنائی بن جائے جہاں پر
ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے
مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے

اور سعیہ تحیر و حیرت سے دیکھتی رہ گئی، ایسی محبت ایسے الفاظ جو بہت کچھ واضح کہہ رہے تھے وہ بے ساختہ ہی چہرہ جھکا گئی۔
"سعیہ۔" شہریار نے اسے دھیرے سے پکارا تھا۔
"سعیہ آر یو آل رائٹ۔" اب وہ تشویش سے اسے تھامے پوچھ رہا تھا، سعیہ نے بمشکل اپنے وجود میں ہوتی ہلچل سے نگاہیں چرا کر سر اثبات میں ہلایا۔
"میرا خیال ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں کمرے میں چلیں۔" اسے بازو کے گھیرے میں لیے وہ اندر بڑھنے لگا تھا۔
"کیا تمہیں نہیں لگتا کہ خود ساختہ جبر کا موسم زندگی کی بہت سی دلکشی اور خوبصورتی سے دور کر رہا ہے ہمیں، دل کو منانے کی راہ میں انا کو نہیں رہنا چاہیے، دل کو صرف محبت مطلب کے اختیار پہ چھوڑ دینا چاہیے نہیں کیا؟" اسے بیڈ پہ بٹھا کر اس کے نازک شانوں پہ اپنے مضبوط ہاتھ رکھتے وہ خاص انداز سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا، سعیہ نے اپنے وجود میں سنسنی سی دوڑتی محسوس کی کیسے قیامت خیز لمحات تھے جنہوں نے گنگ کر دیا۔
"آؤ محبت کے موسم میں جئیں۔" اسے خود سے قریب کرتے ہوئے بہت آہستگی سے اس کی پیشانی پر مہر خاص ثبت کرتا وہ بولا تو اس کی سوئی انا ایک جھٹکے سے بیدار ہوئی تھی۔
"میری طبیعت ٹھیک نہیں، آرام کرنے دیں مجھے۔" اس کا ہاتھ جھٹکتی وہ یک لخت ناگواری سے بولی تو شہریار گویا اشتعال کی آخری حدوں کو چھونے لگا۔
بنا سوچے سمجھے محض موسم کی خوبصورتی، ماحول کے سحر اور معنی خیز سی تنہائی کے زیر اثر وہ التفات دکھا گیا اور وہ چھٹانک بھر کی لڑکی اسے دھتکار گئی، اس کا وجیہہ چہرہ احساس توہین سے سرخ ہوا تھا۔
"یہ میرے قریب آنا پسند نہیں کرتی میرے التفات کو گناہ سمجھتی ہے اور میں......" وہ لب بھینچے غصے سے دیکھتا اچانک مڑا کمرے کی کھڑکی بند کرتے ہوئے لائٹ بھی آف کر دی اور تکیہ منہ پہ رکھتا سونے لگا، سعیہ نے اٹھ کر نائٹ بلب جلا دیا۔
موسم کی خرابی کی وجہ سے بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک وہ سونے کی کوشش میں ناکام ہو رہی تھی ایسے لگ رہا تھا جیسے آسمانی بجلی اپنی خوفناک کڑک کے ساتھ بس اسی کمرے میں گرنے والی تھی اور کسی خرابی کے باعث جنریٹر بند ہو چکا تھا، کمرہ گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔

☆☆☆

وہ اسلام مسلمان اور قرآن سے متعلق معلومات کے لئے انٹرنیٹ دیکھنا شروع ہو گئی، اسلام پر ریسرچ کے سلسلے میں اس نے فاطمہ سے بھی رابطہ رکھا اس کے وفد کے دیگر اراکین اپنے ریسرچ ورک کے سلسلہ میں حد سے زیادہ معروف تھے، ان سب کے شب و روز لاہور میں بسر ہو رہے تھے، ڈاکٹر نزہت کی اکلوتی بیٹی کے ساتھ ہونے والا حادثہ سب کے ساتھ ماریا کو بھی شدید تاسف اور دکھ کا شکار کر گیا اپنی حد تک جتنا ممکن تھا وہ ان کے گھر جاتی، ان کی دلجوئی کرتی صبا کے پاس بیٹھتی عدیل راحیل سے چونکہ شمالی علاقہ جات کے ٹوئر میں اچھی واقفیت ہو چکی تھی سو ان کے ساتھ بھی وہ اسلام سے متعلق اپنے ویوز، معلومات شیئر کرتی رہتی۔

فاطمہ ایک مخلص لڑکی تھی اس کا تعلق لاہور سے تھا اور وہ ماریا کو ہر روز ملتی اسے خلوص دل سے سمجھاتی کہ پہلے اسلام کے بارے میں خوب مطالعہ کرے اور کوئی الجھن یا معمولی سا بھی اعتراض ہے تو اسے سوالات کر کے رفع کر لے اور اس کے لئے اسے یقیناً وقت چاہیے تھا جبکہ اس کے وفد کے لوگ اپنا ریسرچ ورک مکمل کر کے ایک دو دن میں جانے والے تھے، ماریا بہت غور و خوض کے بعد پاکستان میں رکنے کا فیصلہ کر چکی تھی اس کی ویزا مدت میں توسیع کی درخواست منظور ہو چکی تھی، اب وہ اسلام پروگرام کو نیٹ پہ بہ غور سنتی، انگلش متراجم کے ساتھ عربی زبان و بیان سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرتی، سیمینار کے پروگرام میں ہی اس نے پروفیسر ابراہیم ابو ربیع کے ایمان افروز لیکچر سنے اور سیمینار کی مطبوعہ (The muslim world) دی مسلم ورلڈ میں پہلی بار علی شریتی کا نام پڑھا تو ان کی اسلامی افکار پر مبنی تصانیف پڑھیں، قرآن کی زبان اس کی تاریخ اور اس پر لکھی جانے والی تو ضیحی و تنقید اور توصیفی کتب اب اس کی پہلی ترجیح تھی، وہ جاننا چاہتی تھی کہ حجاز و نجد سے اسلام کے عروج و تعلیمات کے منبع و ماخذ رسول عربیؐ نے کیسے زندگی بسر کی اور حجاز میں لوگوں نے ان سے ایمان کا جذبہ اور ولولہ کیسے حاصل کیا، وہ دور حاضر کے مختلف مذہبی اور سماجی نظریات کا مقابلہ و موازنہ بھی کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ مسلمانوں کے خلاف بولنے والوں کو مختلف تعلیمی و سماجی ادارے بطور مقرر بلاتے اور بھاری رقم بطور معاوضہ دیتے اسی طرح ادبی سطح پر مسلم دشمنی کا غبار اور بغض و حسد نکالنے والے مصنفین کو اعلیٰ سطح پر ایوارڈ سے نوازا جاتا اور اب تاریخ کے صفحات اپنی تمام تر سچائی و صداقت لئے اس کے سامنے کھلے پڑے تھے اور گواہی دے رہے تھے کہ وہ عبداللہ بن ربی جس نے اپنی پوری زندگی حضور کو ایذا دینے میں گزاری اور مکارانہ کام انجام دیے اس کے باوجود وہ بدبخت مر گیا تو حضورؐ نے اپنی چادر اس کے کفن کے لئے دے دی اور فتح مکہ کی وہ شاندار مثال جب گالیاں دینے والے، راستوں میں کانٹے بچھانے والے، زہر کھلانے والے، چچا کا کلیجہ نکال کر کھانے والی، کوڑا کرکٹ ڈالنے والی سب مرجھائے کھڑے ہیں، ایک اشارے پر گردنیں اڑا دی جاتیں مگر رحمتؐ دو جہاں نے رحمت للعالمین کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کو معاف کر دیا پھر بازار طائف میں پتھر کھا کر دعا دینے والے کی شان کو بھلا کون پہنچ سکتا ہے۔

اس نے پڑھا تھا کہ اسلام بربری پر مبنی مذہب ہے اور ان کتابوں میں محمدؐ کی ذات پر بھی رکیک الزامات لگائے گئے تھے، لیکن اپنی عقل سلیم کو استعمال کرتے ہوئے اس نے جب انصاف کے ساتھ تاریخ اسلام، قرآن اور سیرت نبویؐ کا مطالعہ کیا تو پاکیزہ و صاف ستھرے نظام زندگی و بندگی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلیٰ و ارفع اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی، یہ حقیقت ثابت شدہ ہے

کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کے بارے میں کوئی مبہم بات، دھندلاہٹ نہ تھی اور پراسرار نہ دیو مالائی جیسا کہ زرتشت شری کرشن کہ بدھ اور مسیح کی زندگی میں نظر آتی ہیں بلکہ بعض پیغمبروں کے وجود تک کے بارے میں اہل علم نے شکوک و شبہات بلکہ انکار کا اظہار کیا ہے لیکن کسی بھی شخص نے یہ کہنے کی جسارت نہیں کی کہ وہ تو ہمائی شخصیت ہیں یا جنوں پریوں کی داستاں سے مشابہ ہیں۔

وہ مضبوط اور پرسکون انداز میں فاطمہ کے مقابل بیٹھی بول رہی تھی۔

"اور یہ کس قدر تسکین کی بات ہے کہ تاریخ بنی نوع انسان کو صحیح معنوں میں ایسا پیغمبر مل جائے جس کی تاریخ مثال دیتی ہو، ہوائی سفر میں سورہ اخلاص کا ترجمہ اور متن پڑھتے ہوئے میں عقیدہ توحید کی حقیقت کو پا کر دنگ رہ گئی تھی، میں نے زندگی میں پہلی بار یہ پڑھا اور سنا تھا کہ اللہ ایک ہے نہ اللہ کو کسی نے پیدا کیا اور نہ ہی اللہ نے اپنا کوئی بیٹا پیدا کیا اس کی کوئی مثل ہی نہیں، عقیدہ تثلیث پر میرا یقین پہلے بھی نہ تھا پھر یسوع مسیح کس طرح خدا کے بیٹے اور مریم بیوی ہوئی جبکہ اللہ کو کسی نے جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا، یہ آیت پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی۔" فاطمہ نے اسے سکون سے بولتے سنا۔

"ویسے بھی میرا ذاتی خیال ہے کہ کائنات احتیاج و انحصار کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے، خود انسان بھی اسی فطرت کا حصہ ہے اور فطرت بذات خود بری نہیں ہے تو ثابت ہوا کہ انسان بھی طبعاً اور فطرتاً برا نہیں ہے۔"

"تو مجھے انسان کی نجات کی خاطر یسوع مسیح کا سولی چڑھ کر جان دینا ایک بے معنی قصہ معلوم ہوا یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے کائنات کے خالق کی بے شمار صفات کا ادراک حاصل ہوا اور میں نے جانا کہ اسلام کا نظریہ توحید کوئی بے جان تصور نہیں بلکہ زبردست عملی قوت ہے جس کی حقانیت کو ذہن فوراً تسلیم کرتا ہے۔"

"ماریا مجھے خوشی ہے بطور ایک مسلمان کہ تم اسلام کو اس کی درست روح کے ساتھ سمجھ رہی ہو تم نے ایک بات پوچھی تھی راضی بہ رضا اور راضی بہ قضا تب میں نے کہا تا کہ ترک آرزو وہی راضی بہ رضا ہونا ہے، اس کی مشیت کے مطابق کٹھن وقت صبر سے شکر سے گزارنا ایسے کہ تنگدستی، مشکل پریشانی بیماری اور بلا میں رونا جبکہ خوشحالی آسانی تندرستی اور خوشی میں اللہ سے نہ کہنا کہ اللہ مجھ پہ اتنی نوازشات کیوں؟ میں ہی کیوں اس انعام کے قابل؟ تم نے ترک آرزو نہ کیا تو نفس مطمئنہ بھی نہ پایا اور ایسا ہوا تو مشکلات بڑھیں، پتا ہے ماریا ہمارے نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس معاملے "رہنا ہے ہر حال میں راضی" یہ فرمایا کہ۔"

"جب کسی بندے کو اللہ کے ہاں سے کوئی درجہ ملنا ہوتا ہے تو وہ شخص اس درجے کو اپنے خاص عمل سے حاصل نہیں کرتا بلکہ اس پر بیماری کی بلا نازل ہوتی ہے تب وہ اس درجہ کو پا لیتا ہے اور کوئی بندہ جتنا اعلیٰ ظرف ہوتا ہے وہ حساب کتاب میں اتنی ہی نرمی کا معاملہ کرتا ہے، اللہ تو اللہ ہے اس سے بڑھ کر بھلا کون اعلیٰ ظرف ہو سکتا ہے؟ اور بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے گمان کے بہت قریب ہے، بندہ اپنے رب کے بارے میں اس وقت تک خوش گمان نہیں ہو سکتا جب تک اس سے محبت نہ ہو، جب انسان کو اللہ کی میزبانی، اس کے رحم، اس کی محبت کا ادراک ہو جاتا ہے وہ سراپا تسلیم و رضا بن جاتا ہے اور ہر بات ہر واقعہ پر کوئی نہ کوئی حکمت ڈھونڈ لیتا ہے اور جان لیتا ہے کہ بظاہر نظر آنے والا "ناٹھیک" بھی اصل

میں "ٹھیک ہے۔"

"میری تلاش خام تھی یا محنتوں کی توقع کے مطابق ثمر آور نہ ہونے پر، لوگوں کی طعن و تشنیع سننے میں کیا حکمت ٹھیک تھا؟" ماریا نے اپنے تئیں سوال اٹھا کر فاطمہ کو مشکل میں ڈالنا چاہا تھا۔

☆☆☆

کسی کو رکھ کے اپنی نگاہ میں
پھول چننے کی چاہ میں
کوئی خواب بننے کی راہ میں
کسی خواہش کسی آرزو کے واسطے

میرے پاؤں میں بچھے تھے راستے
مگر وادیاں عشق کی نہ زرخیز تھیں
اور آندھیاں بھی تیز تھیں
غبار سے اٹے وہ راستے کہ
نگاہ سے منظر ہٹ گئے
سبھی خواب آنکھ سے کٹ گئے
پھول بھی سارے بکھر گئے
شہر دل کے رنگ بھی اجڑ گئے
میرے ہاتھ سے اس کے ہاتھ تک
جو راستہ تھا انچ بھر کا
وہ راستہ فاصلوں سے اٹ گیا

زندگی جینا اور زندگی کرنا دونوں بالکل الگ چیزیں، وہ جینے کے طریقے خود وضع کرنے والی لڑکی تھی جس کی زندگی میں کوئی Freezing point نہیں تھا کسی کے ساتھ ہونے یا نہ ہونے سے اسے یعنی صبا حیدر کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر وقت اس جیسی اسٹریٹ فارورڈ لڑکی کو ایسے موڑ پہ لے آیا تھا یہاں سفر کے ساتھ راستے بھی ختم ہو گئے تھے اور راستوں کے ساتھ تعلقات، رشتے بھی اسے ہارنے سے نفرت تھی مگر اب مکمل طور پر شکست خوردہ دکھائی دیتی یہ حادثہ پیش آنے میں قدرت کی کوئی مصلحت تھی یا اس کا قصور؟ کہ کچھ باقی نہ بچا، گھر میں سب کا رویہ حد سے زیادہ خلوص، محبت، شفقت اور نرمی لئے ہوتا، راحیل، عدیل کے مذاق، چٹکلے، مما کی محبت اور ممتا کے ساتھ کبھی کبھی کی پیار بھری لرزش، ڈیڈ کا اسے پاس بٹھا کر زندگی کے اسرار و رموز سمجھانا اب یہ نہ تھا، اب تو سب یوں کرتے کہ وہ ہاتھ کا چھالا اسے ٹھیس نہ لگ جائے کوئی بات اس کے خلاف مذاق نہ ہو جائے اس سے یہ خصوصی برتاؤ صبا کو نارمل نہ ہونے دیتا اسے لگتا وہ واقعی ایک غیر اہم فالتو اور ناکارہ وجود ہے، جیسے ایک مکمل انسان سمجھ کر ٹریٹ کرنے سے بھی ڈرتے ہیں شادی ٹوٹ جانا یا رشتہ نہ ہوا معمولی بات نہیں تھی، مگر وہ ایسی کمپلیکس زدہ سوچوں کو جھٹک کر جی سکتی تھی، وجود کا نامکمل ہونا اور ہمدردی، ترحم، ترس کے ساتھ سب کا حد سے بڑھ کر با مروت ہونا اس کے اندر وحشتیں جگا دیتا، دل میں جھکڑ چلتے، طوفان آتے اور آنکھیں خاموشی سے چھلکے جاتیں اور اس کے گھر والوں کے لئے یہ آنسو کتنے تکلیف دہ تھے وہ سوچوں، الجھاوؤں میں غلطاں دیکھ ہی نہ پاتی۔

"صبا پلیز روؤ مت، اس حادثے کے ڈپریشن مت بناؤ، یہ تمہارے لئے مینٹلی ڈسٹربنس کا باعث بنے گا۔" ماریا جو اسے دیکھنے آئی تھی نرمی سے بولی۔

"روؤں نہ تو کیا کروں، زندگی کے سب دروازے مجھ پر بند ہو گئے میری زندگی اس کمرے کے اندر ایک بیڈ تک محدود ہو کر رہ گئی، میں جانے کب تک روز نکلتے سورج، ابھرتے چاند اور پھیلتی دھوپ کو دیکھنے سے محروم رہوں میں پہلے کی طرح چل پھر بھاگ نہیں سکتی، مجھے فالو آن سے نفرت ہے مگر میں ایک اپ سیٹ لائف گزاروں گی، اپ سیٹ وجود کے ساتھ۔" کتنی آہستگی سے اس کی آنکھیں پھر چھلکنے لگیں۔

"صبا تم میری بہن ہو نا اچھی سی تو دیکھو روؤ مت، سب تمہارا کتنا خیال رکھتے ہیں، کتنی توجہ دیتے ہیں ایسے میں تمہارا یہ انٹ شنٹ سوچنا ٹھیک نہیں۔"

"توجہ خیال ابنارمل، معذور، بیمار سمجھ کر دیتے ہیں ایک نارمل ایک انسان سمجھ کر نہیں، مجھے نارمل بی ہیوئیر کے ساتھ ٹریٹ کیوں نہیں کرتے سب مجھے جینے کا پورا رویہ ماحول کیوں نہیں دیتے کیونکہ میں ادھوری ہوں، کیا یہ سب میرا جرم ہے؟" وہ چیخی اور ماریا ساکت سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"سب مجھے کمتر سی بیمار بچی کی طرح ٹریٹ کیوں کرتے ہیں مجھے بہلاتے ہیں پہلے جیسا ہنسی مذاق چھیڑ چھاڑ گفتگو وہ سب کیوں نہیں کرتے۔" وہ آنسوؤں کے درمیان بول رہی تھی، جب ماریا نے کیئرنگ انداز میں اس کے گرد بازو پھیلا دیے اور بولی۔

"صبا ڈاکٹر کی ایڈوائز کے مطابق زیادہ بولنا تمہارے لئے ٹھیک نہیں اور یہ فضول سوچیں بھی غلط ہیں، وہ ماں باپ، بہن بھائی جنہوں نے آج تک تمہیں زک نہیں پہنچنے دی تم کیا سمجھتی ہو تمہیں اس کیفیت میں دیکھنا ان کے لئے آسان ہے، ہرگز نہیں ان کے لئے یہ صورتحال بہت بوجھل ہے، اگر وہ تم سے ہنسی چھیڑ چھاڑ زیادہ بولنے سے کتراتے ہیں تو صرف اس لئے کہ ان کا اندر کمزور پڑتا ہے حادثہ تازہ ہے دکھ دوگنا وہ ابھی تک خود اس حادثے تمہارے نقصان کو قبول نہیں کر پا رہے تمہیں کیسے حوصلہ دیں، انہیں اپنے حوصلے ہمت مجتمع کرنے دو اور خود کو بھی پر سکون رکھو یہ تمہارا کھویا اعتماد واپس لوٹانے کے لئے بہت ضروری ہے۔" اس کی آنکھوں کے کنارے تواتر سے بھیگتے رہے اور ماریا اسی ناصحانہ انداز میں بولی۔

"خدا نے تمہیں نئی زندگی دی ہے صرف چلنے پھرنے کا مسئلہ ہے کچھ عرصے تک وہ بھی آپریشن سے ٹھیک ہو جائے گا مگر دیکھے سوچے سننے بولنے ہنسنے کی سب صلاحیتیں تمہارے پاس ہیں، تم ان کا مقصد سمجھو اپنے ساتھ اپنے پیاروں کو سزا دینا یہ رویہ غلط ہے اس غلط ٹریک سے بچو، یہ بہت کچھ صحیح نہیں دکھاتا۔" ماریا نے اس کے چہرے کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا تو صبا نے خاموشی سے دیکھا تھا۔

"خود کو مایوسی، ڈپریشن سے دور رکھو، بہادر بنو کیونکہ زندگی کی بازی ہمیشہ بہادر لوگ جیتتے ہیں۔" وہ کہہ کر اسے الوداعی بوسہ دیتی اٹھی اور لاؤنج میں آ گئی یہاں عدیل، راحیل نزہت بیگم بیٹھے تھے۔

"آنٹی وہ بہت ڈپریشن کا شکار ہے، اس کا ذہن متضاد کیفیات میں الجھا ہوا ہے اس کی ریکوری اور سروائیو اس کی پر سکون ذہنی کیفیت کا مرہون منت ہے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اسے کچھ دنوں کے

سمیرا عثمان گل

لئے اس ٹینشن زدہ حالت سے نکالنے کو کہیں اور رکھیں اس شہر اس ماحول سے قدرے پرے۔" ماریا نے ان کی طرف دیکھا اور قدرے ٹھہرے لہجہ میں بولی۔

"تبدیلی آب و ہوا بہت ضروری ہوتی ہے بعض دفعہ، اس کے اندر کا موسم اداس ہے وہ اپنا Self confidence کھو چکی ہے، اسے لگتا ہے زندگی سے خوشی، رنگ امنگ روشنی سب رخصت ہو گئے، وہ موجودہ کیفیت میں اندرونی کشمکش کا شکار بیرونی صورتحال کو فیس نہیں کر پا رہی۔"

"وہ تندرست نہیں، زخم تازہ ہیں اس کا فی الحال گھر پہ اور اپنوں کے بیچ رہنا زیادہ ضروری ہے اور پر فضا مقام پر لے جانا مسئلہ بن سکتا ہے فزیکلی ٹمپرامنٹ اور ہے پھر یہ مسئلے کا حل بھی نہیں۔" نزہت نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اسے اندرونی و بیرونی تبدیلی ایک ساتھ یہیں دے دیں۔"

"وہ کیسے۔" ڈاکٹر نزہت بے طرح چونک کر بولیں۔

"آپ اس کی شادی کے لئے کوشش کر سکتی ہیں، یہ ایسی چیز ہے جو اس کی منجمد ذہنی و جسمانی کیفیت پہ اثر انداز ہو کر اس کا گمشدہ اعتماد واپس لا سکتی ہے۔" ماریا نے سنجیدگی سے ایک ہمدردانہ مشورہ دیا تھا۔

"شادی مگر یہ حل کیسے ہو سکتی ہے اس مسئلے کا اور صبا کب مانے گی اگر مان بھی گئی تو ایسی معذور جسمانی صورتحال کی ڈسٹربنس؟" ان کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا اٹکا اور لہجہ نمناک آنکھیں بھرنے لگیں۔

"اتنا سخی کون ہے جو ایک معذور بیمار لڑکی کا ساتھ دے، کون اتنا اچھا ہو سکتا ہے کہ ایک ٹانگ ناکارہ ہو جانے والی لڑکی کے لئے حامی بھرے؟ کون ہے جو صبا حیدر کا اس کیفیت و حالت میں ہاتھ تھامے اس کا اعتماد، یقین واپس لانے کی سعی کرے، اسے اپنائے کون ہو سکتا ہے؟" وہ روتے ہوئے بولیں۔

"میں ہو سکتا ہوں وہ شخص، جو اس حالت کے ساتھ اس صورتحال میں صبا حیدر سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" ایک مضبوط، سنجیدہ فیصلہ کن لہجہ ابھرا ان سب نے بھرپور حیرت بے یقینی کے ساتھ چونکتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔

(باقی اگلے ماہ)

تین سال بعد اس کے قدموں نے سر زمین پاک کو چھوا تو دل چاہا اڑ کر گھر چلی جائے مگر سسرال سے آرڈر تھا کہ پہلے وہاں قیام کیا جائے گا، ائیر پورٹ کی حدود سے نکل کر وہ باہر ڈرائیور کے انتظار میں کھڑے تھے جو انہیں دیکھ کر خود ہی قریب آ چکا تھا عنصر نے گاڑی میں سامان رکھوایا اور خود گھوم کر پچھلی سیٹ پر آن بیٹھا جہاں وہ پہلے ہی بیٹھ چکی تھی، کچھ ہی دیر میں گاڑی لاہور کی شاہراہ پر رواں دواں ہو چکی تھی اس نے گردن گھما کر ساتھ بیٹھے عنصر کو دیکھا جو کھڑکی سے سر نکالے باہر دیکھنے میں مگن تھا یہ وہ شخص تھا جسے اس نے زندگی میں سب سے زیادہ چاہا تھا، جسے وہ گھنٹوں باتیں کرنے کے لئے ترسا کرتی تھی، آج وہ بول رہا تھا اور وہ محض ہوں ہاں میں جواب دیئے جا رہی تھی۔

اس کا موڈ نہ دیکھ کر وہ بھی خاموش ہو چکا تھا، باہر ایک کے بعد دوسرا منظر گزر رہا تھا مسافت سمٹ رہی تھی اور جیسے جیسے ایک کے بعد دوسرا موڑ گزر رہا تھا اس کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں اور اپنا ہی اضطراب اور بے چینی کم کرنے کی خاطر وہ بار بار دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ رہی تھی۔

گاڑی نے ایک دم سے موڑ کاٹا تھا اور اسکا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا سامنے بائیک پر ارحم گزرا تھا، وہ اسے دیکھ کر والہانہ انداز میں کھڑکی پہ جھکی تھی مگر وہ قریب سے بائیک اڑا لے گیا تھا اس نے دیکھ کر بھی ان دیکھا کر دیا تھا مریم کے دل میں جیسے چھن سے کچھ ٹوٹ گیا۔

اتنے سالوں کی دوری نے بھی اس کی ضد کو نہیں توڑا تھا، وہ آج بھی اس سے بے نیاز اور لاتعلق تھا۔

جب شادی کے اس روز جب وہ اس کی بہن اسے رخصت کر رہی تھی تب پیچھے سے کسی نے کہا تھا کہ بھائی کو رخصت کرنا چاہیے وہ کچھ ہی فاصلے پہ کھڑا تھا مریم رک گئی تھی اس نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا مگر وہ یونہی اپنی جگہ جم کر کھڑا رہا تھا۔

"مریم چلو گھر آ گیا ہے۔" عنصر کی آواز نے اسے چونکایا وہ اب گاڑی سے سامان نکال رہا تھا مریم دوسری جانب کا ڈور اوپن کر کے باہر نکل آئی۔

سسرال میں اس کا خوب والہانہ استقبال ہوا تھا اس کی تینوں نندیں آئی ہوئی تھیں سب نے ہال میں ڈیرا جما لیا خوش گپیاں باتیں، لطیفے، چٹکلے، وہ تینوں کی تینوں شوخ و شنگ طبیعت کی مالک تھیں بے تحاشا ہنسنے والی مگر اسے ان ساری باتوں سے جی بھر کر کوفت ہو رہی تھی۔

بس نہیں چل رہا تھا کہ سب لوگوں کو منظر سے غائب کرنے کے بعد اڑ کر سڑک کے آخری کارنر پر موجود نیلی ٹائیلوں سے بیجے گھر کی گھنٹی بجا دے۔

ایک ایک نوالہ نگلنا مشکل ہو رہا تھا اماں سے حرا سے ملنے کی جلدی تھی کھانے کے بعد کافی کا دور چل نکلا اور پھر گفٹس کی باری آ گئی تھی۔

"اب بہو کو دو گھڑی آرام بھی کرنے دو۔" اماں نے اپنی بیٹیوں کو گھورا مگر انہیں اپنے گفٹس کھولے بغیر کہاں چین تھا مریم کو مزید ان کے تبصرے سننے تک وہاں رکنا پڑا اور جب سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو وہ موقع غنیمت جانتے ہوئے عنصر کو بتا کر باہر نکل آئی تھی۔

اور اب اس کے قدم نیلی ٹائیلوں والے گھر کی سمت اٹھ رہے تھے، دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا، گیٹ کے قریب پہنچ کر اس نے ڈور بیل پہ ہاتھ رکھ دیا تھا۔

ایک بار، دو بار، تین بار، آخر وہ مایوس ہو کر پلٹنے والی تھی جب اوپر سے کسی نوعمر لڑکی نے جھانکا۔

"کون ہے؟" منڈیر پہ جھکی وہ پوچھ رہی تھی۔

"میں مریم ہوں اماں اور حرا کہاں ہیں۔" اس نے سر اٹھاتے ہوئے اپنا آدھا ادھورا سا تعارف کروایا لڑکی سیڑھیاں اتر کر دروازے تک آئی تھی۔

"وہ تو بازار گئی ہیں آپ آئیں بیٹھیں۔" مریم اس کی معیت میں چلتی اندر تک آئی۔

"ہم یہاں نئے کرائے دار ہیں۔" لڑکی نے اب اپنے متعلق بتایا تھا مریم سر ہلا کر برآمدے میں چلی آئی۔

"میں ان کا ویٹ کروں گی تم جاؤ۔" ہینڈ بیگ اتارنے کے بعد وہ خود بھی تخت پر بیٹھ چکی تھی۔

خالی کمرے باتیں کر رہے تھے اسے گھر میں تنہا رہنے کا کتنا شوق ہوا کرتا تھا وہ دعائیں مانگا کرتی تھی کہ اماں آج تو کسی بھائی، بہن کی طرف چکر لگا لیں اور وہ گھر میں اکیلی رہے تب اسے عنصر سے خوب جی بھر کر باتیں جو کرنا ہوتی تھی سب دوستوں کو اکٹھا کر کے وی سی آر پہ فلمیں دیکھنے کا بھی الگ ہی مزہ ہوتا تھا وہ ارحم کے کمرے کی سمت چلی آئی تھی اس کمرے میں اماں کی پیٹیوں کے علاوہ تین الماریاں بنی تھیں ایک میں ان سب کے کپڑے تہہ لگا کر رکھے ہوئے تھے دوسری میں اماں کے جہیز کا ڈنر سیٹ اور تیسری میں سلائی کا سامان، دائیں دیوار کے ساتھ کمپیوٹر ٹیبل تھا اور دو چارپائیاں۔

ارحم کتنا لڑتا تھا، "کیا بیڈ روم ایسے ہوتے ہیں۔" لیکن دو کمروں کی بدولت اس نے خود کو اسٹور میں ہی سیٹ کر رکھا تھا۔

وہ کپڑوں والی الماری کے قریب آن کھڑی ہوئی اماں اور ارحم کے کپڑے اس میں سلیقے اور ترتیب سے رکھے ہوئے تھے کبھی وہ کم جگہ کی بدولت کتنا جھگڑتے تھے ارحم تو اکثر اس کے کپڑے نکال کر باہر پھینک دیتا تھا، کمپیوٹر ٹیبل کے اوپر لگی الگنی پر آج بھی ارحم کی ڈریس پینٹ لٹک رہی تھیں۔

"اماں یہ جان کر پینٹ کی کریز ٹھیک سے نہیں بناتی۔" اسے سکول سے دیر ہو رہی ہوتی تھی اور وہ کبھی اس کا بیگ کتابیں تو کبھی نوٹس چھپا دیتا تھا۔

"جب تک پینٹ استری نہیں ہو گی تم بھی نہیں جا سکتی۔" اسے لگا جیسے وہ ابھی برآمدے میں کھڑے لڑ رہے تھے اس نے دوسرے کمرے میں جھانکا، وہاں ایک چارپائی، سنگل بیڈ، فریج، دو برتنوں کی دیوار گیر الماریاں اور ایک انگیٹھی تھی دیوار گیر الماریوں کے آگے اب فریم شدہ شیشے لگ چکے تھے ورنہ جب بھی اس کا اور حرا کا جھگڑا ہوتا وہ ساری الماریوں کے برتن نکال کر دھونے بیٹھ جاتی تھی اماں زبردستی اسے بھی ساتھ لگا دیتی اور اسے حرا کی صفائیوں پر جو غصہ آتا تھا تین روز تک وہ گھر میں طوفان اٹھائے رکھتی تھی۔

مریم اسے چڑانے کی خاطر ڈرائینگ روم کے صوفوں پر چڑھ کر رسالے پڑھا کرتی تھی صوفے حرا نے اپنی کمیٹی کے پیسوں سے بنوائے تھے وہ اور ارحم جو کبھی گھڑی دو گھڑی کے لئے ان پر لیٹ جاتے تو اس کی جان پر بن آتی تھی۔

"جاہلوں کو بیٹھنے کی تمیز بھی نہیں ہے۔" اس کی آواز ماضی کے کسی ادھ کھلے دریچے سے آئی تھی مریم نے صوفے پر لیٹ کر دیکھا مگر آج اس

روز جیسا حزہ نہیں تھا لمحے جیسے ریت کی مانند ہاتھ سے پھسل گئے تھے وقت اتنی جلدی بیت چکا تھا وہ جو خوش گمانیوں بے فکریوں کا دور تھا، اس نے عنصر کی محبت میں قیدیوں کی مانند کاٹا تھا۔

"کب اس قفس سے رہائی ملے گی۔" عنصر ملاقات نہ ہونے پر وہ تلملا کر سوچا کرتی تھی فون سننے کے لئے کبھی واش روم تو کبھی چھت پر جانا زہر لگا کرتا تھا۔

اور جو اگر کوئی پیچھے آ جاتا تو اسے اور غصہ آتا اور وہ پیچھے آنے والا ہمیشہ ارحم ہی ہوتا تھا۔

"تم چھت پر ہو چلو واک کرتے ہیں۔"

"مجھے نہیں کرنی۔" وہ خاصی بے مروتی سے جواب دیتی اور وہ ڈھٹائی سے کھڑا اپنے کالج کی دوستوں کی، پروفیسروں کی باتیں سناتے جاتا اور وہ منہ پر بیزاری سجائے اکتاہٹ بھرے انداز میں ہنستی اس کا دھیان تو اپنے سیل فون پہ آنے والے میسجز کی سمت اٹکا ہوتا تھا۔

اسے ٹہلتے نہ دیکھ کر وہ تنگ آ کر نیچے آ جاتی تھی اور پھر وہ بدلہ لینے کی خاطر صبح صبح اسے لحاف سے باہر نکال کر اپنی بائیک صاف کرواتا تھا اور کبھی منانے پر آتا تو بائیک پر بیٹھا کر سارے شہر کے پارک گھما لاتا تھا آئسکریم کھاتے ہوئے دونوں نیو کپل پر کمنٹس پاس کر کے خوب ہنستے تھے۔

"یہ عنصر ہمارے گھر کی طرف کیوں دیکھ رہا تھا۔" سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ اس کے ہاتھوں کے طوطے کبوتر سب اڑ گئے وہ منہ کھولے ہونق پن سے اسے دیکھنے لگی جو ماتھے پہ سلوٹیں لئے اسے گھور رہا تھا۔

"مم...... مجھے کیا پتہ۔" وہ ہکلا گئی۔

"آج سے تمہارا اکیڈمی جانا بند، گھر سے پاؤں باہر نکالا تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔" ایک نیا حکم صادر کرتا وہ جانے کو مڑا تو وہ مٹھیاں بھینچے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم ہوتے کون ہو مجھ پہ پابندیاں لگانے والے۔"

"ہوا کیا ہے تم دونوں کو۔" اماں ابھی اندر آئی تھیں۔

"اس کے جو ایک دو رشتے آئے ہیں ان میں سے کوئی فائنل کر کے دفع کرو اسے، ورنہ ہماری عزت مٹی میں رول کر رہے گی۔"

"میں شادی کروں گی تو عنصر سے۔" اس کے لبوں سے بے ساختہ نکل گیا ارحم نے اپنے ہاتھ کا ایک جھانپڑ اسے مارا تھا، اماں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"وہ ملکوں کا لڑکا۔" ان کا دل بیٹھا جا رہا تھا گھر میں عجیب ماتمی سی فضا چھا گئی، حرا بھی سسرال سے آ چکی تھی اسے سمجھانے کے لئے، مگر رزلٹ زیرو، وہ اپنی بات پہ مصر تھی۔

اکیڈمی جانا چھوڑ دیا، کھانا پینا چھوڑ دیا، رشتہ دیکھنے کے لئے آئے مہمانوں سے بدتمیزی کی، رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔

اس سے قبل کہ چہ زبان زد عام ہوتا اماں نے ملکوں کو رشتہ دے دیا ارحم کا ایک ہی فیصلہ تھا۔

"جاؤ گی تو ہمیشہ کے لئے۔" وقتی طور پر اس نے ان سب کو چھوڑنے کی حامی بھر لی تھی۔

"اب اس گھر کے دروازے خود پر بند سمجھو۔" اس نے بے نیازی سے سر جھٹک دیا بھلا کوئی کب تک خفا رہتا، بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا اس نے خود کو تسلی دی اور خوش رنگ خوابوں کا پیراہن اوڑھ لیا۔

شادی میں محض چند احباب نے ہی شرکت کی تھی۔

عنصر سعودیہ سے چھٹی پر آیا ہوا تھا جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے گیا اور اس کے بعد وہ

اب آئی تھی۔

اماں اور حرا سے رابطہ بس ٹیلی فونک گفتگو تک ہی محدود رہا تھا، آنگن میں لگے سفید پھولوں کی پتیاں نوچتے ہوئے اسے احساس بھی نہ ہوا کہ پورا ایک گھنٹہ گزر چکا تھا اس گھر میں اس کی فیورٹ جگہ سیڑھیاں تھیں اس وقت بھی وہ املتاس کی بیل کے نیچے خاموش بیٹھی وہ سہانے دن تلاش کر رہی تھی دل چاہ رہا تھا اماں کی گود میں سر رکھ کر خوب گہری نیند سوئے حرا سے ڈھیر ساری باتیں کرے۔

اپنے اس گھر میں بہت سارے دن رہے اور ارحم ہمیشہ کی طرح اسے ستائے اسے تنگ کرے گرم گرم لحاف سے نکال کر اپنی بائیک صاف کروائے وہ اس بار اس کی پینٹ کی کریز بالکل ٹھیک بنائے گی اور اس کے ساتھ چھت پہ واک بھی کرے گی۔

ڈور بیل بجی، ایک چھوٹی بچی اوپر سے بھاگتی ہوئی آئی تھی، مریم سیڑھیوں سے اٹھی لیکن وہ پہلے ہی گیٹ کھول چکی تھی۔

"شکر ہے دولہن کی شاپنگ تو مکمل ہوئی۔" حرا بولتے ہوئے آ رہی تھی مریم لپک کر والہانہ انداز میں آگے بڑھی لیکن یہ کیا حرا اور اماں نے نہ تو اسے گلے سے لگایا تھا نہ اس کی خیریت پوچھی تھی نہ اس کی اچانک آمد کا کوئی ذکر کیا۔

"ارے مریم تم یہاں کیوں چلی آئی ارحم نے دیکھا تو ہنگامہ مچا دے گا۔" حرا کے انداز میں اس قدر عجلت تھی جیسے اسے بازو سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دینا چاہتی ہو مریم سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔

"پلیز ابھی چلی جاؤ، ارحم کے سسرال والے بھی آ رہے ہیں، انہیں ارحم نے یہی کہہ رکھا ہے کہ اس کی بس ایک ہی بہن ہے میں نہیں چاہتی کہ کوئی سین کریٹ ہو۔"

"ہاں ہاں مریم جلدی جاؤ۔" اماں نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے اسے جیسے باہر کا راستہ دکھایا تھا وہ بجھے دل اور شکستہ قدموں سے چلتے ہوئے نیلی ٹائیلوں والے گھر سے دور نکل آئی اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اسے لگا جیسے آج اس کی رخصتی ہوئی ہو جیسے وہ ابھی ابھی سب کے لئے مر چکی ہو جیسے ابھی اس گھر کے دروازے اس پر بند ہوئے ہو جیسے آج اس نے اپنا ماضی کھو دیا ہو جیسے آج وہ اپنوں سے ہمیشہ کے لئے بچھڑی ہو۔

دو روز بعد اس نے نیلی ٹائیلوں والے گھر کو برقی قمقموں سے سجتے ہوئے دیکھا تھا وہ ملک ہاؤس کی چھت پر کھڑی تھی۔

"اب اس گھر کے دروازے خود پر بند سمجھو۔" اس کی سماعتوں میں ایک فقرہ گونجا وہ سپاٹ سے تاثرات کے ساتھ وہاں کھڑی رہی تھی جانے کب اس کے عقب میں عنصر بھی آن کھڑا ہوا تھا اور پھر نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا تھا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں مریم۔" مریم نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا اور لب ہمیشہ کے لئے سی لئے ورنہ وہ اسے کہنا چاہتی تھی کہ ایک رشتہ اس کے کھوئے ہوئے تمام رشتوں کا متبادل نہیں ہو سکتا، اس کے خوابوں کی روشن تعبیر اور خواہشوں کی تکمیل نے اسے خالی کر دیا ہے بالکل خالی اور تہی داماں۔

☆☆☆

سہ پہر کے جاتے سائے دھیرے دھیرے دیواروں پر سکڑ رہے تھے، چھوٹی اینٹوں کے بنے اس دو منزلہ مکان کی دیواریں دوپہر کے وقت یوں تپتی جیسے مکان کے اندر کوئی الاؤ دہک رہا ہو گرم ہوا کے بگولے سے اٹھتے تو جیسے فضاؤں میں انگارے سے بھر جاتے اور وہ یوں چہروں پر گرم کے برساتی مانو صدیوں سے انسان کی بیری ہو، سورج میاں تو پورے جلا دیتے ہوئے وہ اپنی گرم گرم انگاروں بھری آنکھوں سے انسانوں کو یوں دیکھتے گویا ابھی نگل جائیں گے۔

پرندے تک پناہ مانگتے ہوئے سائے کی تلاش میں بھٹکتے رہتے، گرمی ایک تو ہوتی بھی بہت لمبی ہے، سردی کی نسبت اس کا دورانیہ کیوں زیادہ ہوتا ہے یہ ہم انسان کیسے جانیں ہم تو محض کٹ پتلیاں ہیں اس کے ہاتھوں میں وہ جس طرح مرضی نچائے، زینب نے کچے آنگن میں پانی کا چھڑکاؤ کروانے کے بعد پلنگ بچھوا دیئے تھے، بڑی اماں پنکھا ہاتھ میں لئے پہلے ہی اپنے تخت پر آن پہنچی تھیں۔

سہ پہر کے جاتے ہی اک اطمینان بخش اور اس ہر ذی روح کے رگ و پے میں اتر گیا تھا کہ اب اک اچھی اور پرسکون رات ان کو دو گھڑی میٹھی میٹھی نیند سلانے آ رہی ہے۔

بڑی اماں پان دان میں جھانکتے ہوئے

دوسرے ہاتھ سے خود کو پنکھا جھل رہی تھیں اور اپنی اونچی آواز میں اس آگ برساتی گرمی کو بھی کوس رہی تھیں جس نے جینا محال کر رکھا تھا۔

قریب ہی جامن کے پیڑ پر (جس نے آدھے سے زیادہ آنگن کو اپنے پروں تلے ڈھانپ رکھا تھا) بیٹھے کوئے نے بے سری راگنی الاپنا شروع کی تو وہ چھالیہ کی تلاش میں ناکام دل برداشتہ ہو کر پان دان چھوڑے ادھر کو ہولیں۔

"ایک تو گرمی جان کو آگئی اور اوپر سے، سر پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرنے لگا۔" ان کے پھولے ہوئے جھریوں سے اٹے چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے ایک ہاتھ میں پنکھا اور دوسرے ہاتھ میں سروتا پکڑے وہ خاصی دل برداشتہ لگ رہی تھیں اب چھالیہ نہیں مل رہا تو اس میں کوئے کا کیا قصور، چھالیہ کون سا وہ لے اڑا۔

"اے زینو کی اماں ادھر تو آئیو۔" ان کو یوں اس کا سر پر بیٹھنا سخت ناگوار گزر رہا تھا خود تو وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کی وجہ سے بامشکل ہی بیٹھ کر اٹھ سکتی تھیں، اس لئے اپنی بہو کو آواز دی۔

"کنکری مار کر بھگا اسے یہاں سے۔"

کوئے کا ابھی قریب قریب اڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر وہ زینو کی اماں کے آنے کا سن کر ایک ہی جست لگا کر اڑ گیا، زینو کی اماں کی جوابی آواز نہیں آئی تھی شاید وہ کسی کوٹھری میں تھیں۔

زینب یعنی زینو اس وقت آنگن میں نہیں تھی وہ اس وقت خود سے بڑے بھائی عباس کو جگانے اس کے کمرے میں تھی جس نے اسے وقت مقرر پر جگانے کے لئے کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ میرے اٹھنے سے پہلے غسل خانے میں پانی رکھوا دینا میں نے نہا کر کسی سے ملنے جانا ہے۔

انہیں لاہور آئے پندرہ بیس دن ہو چکے تھے، وہ مستقل لکھنو میں رہتا تھا اپنے ننھیال میں۔

دراصل اس کے بڑے ماموں کی کوئی اولاد نہیں تھی بڑے علاج وغیرہ کروائے مگر خدا کو جب تک منظور نہیں تھا کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا، پھر انہوں نے اپنے سے بڑی بہن یعنی عباس کی والدہ آغائی بیگم سے اس کا دو ڈھائی سال کا بیٹا مانگ لیا اور وہ بھی بھائی کی حالت دیکھ کر رہ نہ سکی اور اپنے دل پر پتھر رکھ کر اس نے عباس کو انہیں دے دیا، نانا، نانی بھی بہت خوش ہوئے کہ چلو بیٹے کے گھر میں رونق آگئی ہے اور پھر کرنا خدا کا عباس کے جاتے ہی خدا نے ان کی بیگم کی سوکھی گود ہری کر دی، سارا ننھیال عباس پر وارے وارے جانے لگا کہ اس کے مبارک قدم کیا اس گھر میں پڑے سوکھے درخت ہرے ہو گئے، ان کی حالت تو مانو ایسی تھی جیسے اجڑے ہوئے گھر میں کسی نے چراغ روشن کر دیا ہو۔

تب سے عباس اس گھر کے مکینوں کی آنکھوں کا تارا تھا، بچپن سے لے کر جوانی تک انہوں نے عباس کو کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہونے دی اس کی پڑھائی کی ذمہ داری بھی ان کی تھی، بڑے ماموں گو کہ کم گو تھے اور تھوڑے سخت طبیعت کے تھے مگر عباس پر وہ بھی جان چھڑکتے تھے کہ اسی کی بدولت ایک ننھی سی پری ان کے ویران گھر میں بہار لائی تھی۔

یہ ہندوستان کی تاریخ کا ایسا دور تھا جہاں ایک بہت بڑی شاہی سلطنت اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی، انگریز حکومت جتنی چالاکی سے برصغیر پاک و ہند پر غالب آئی تھی وہ اتنی ہی ذلت سے اپنا بوریا بستر سمیٹ رہی تھی، اس بات کو اگر سوچیں تو ایک ہی بات ذہن میں آتی ہے کہ کوئی جتنے مرضی حق جتائے جس کی چیز ہوتی ہے وہ اسی کی ہوتی ہے، حق جتانے سے کچھ نہیں ہوتا، ہندوستان کا بھی ہندوستانیوں کا تھا اور آج بھی انہی کا ہے، یہ وہ زمانہ تھا 1945ء کا جب وہ یہ بات پوری دنیا پر باور کروا رہے تھے کہ ہندوستان ہمارا ہے۔

جون 1945ء جب ہر طرف مختلف سیاسی تحریکیں اپنے اپنے طریقے سے انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنے کے لئے سرگرداں تھیں، جنگ عظیم (دوئم) فیصلہ کن مراحل میں داخل ہو چکی تھی، جرمنی بری طرح شکست کے شکنجے میں تھا اور جاپان تنہا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

عباس نے اٹھ کر گوالمنڈی جانا تھا، اختر لاہور میں اس کا واحد دوست تھا جو لاہور کی سطح پر چھپنے والے ایک اخبار کا مالک تھا۔

کمرے میں وہ جب بھائی کو جگانے کے لئے آئی تو راکھ دانی میں ادھ جلے سگریٹ دیکھ کر حیران رہ گئی، اتنے سگریٹ، جا بجا کتابیں بکھری پڑی تھیں، انہیں الماری سے نکالنے کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح واپس رکھنا بھول گئے تھے۔

کمرے کا دروازہ کھلا ہونے کے باوجود سگریٹ کی مہک سارے میں پھیلی ہوئی تھی، وہ آگے بڑھ کر کھڑکی کھولنے لگی۔

"کھڑکی کیوں بند کر رکھی ہے گویا سرما کی سرد ہوائیں سرسراتی اندر نہ آجائیں۔" وہ خود سے بولی۔

زینب نے یہ بات تھوڑی اونچی آواز میں کہی تھی، وہ اس کی موجودگی کمرے میں محسوس کرتے ہوئے اٹھ گیا تھا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی، وہ بھی جان گئی کہ بھائی اٹھ گئے ہیں۔

"بھائی یہ سگریٹ کی لت کہاں سے لگ گئی ہے آپ کو، تو یہ راکھ دانی یوں سگریٹوں سے بھری پڑی ہے جیسے کوئی دل جلا اپنا غم سگریٹ کے دھوئیں میں گم کر دینا چاہتا ہو۔" زینو نے سر ہلاتے ہوئے ان سے کچھ پوچھنا چاہا تو عباس کی آنکھوں کے آگے اک تصویری آن رکی، بلا کی حسین، دلربا سی، کاجل کی باریک سی لکیر آنکھوں میں سجائے اپنے غرارے کو بڑے کرینے سے سنبھالتی، دور سے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیسے اتنے دن یہاں رہ لیا ہے میں نے۔" اس نے جیسے خود سے پوچھا، اس کے بغیر تو اس کا ایک ایک پل اتنی مشکل سے گزرتا تھا، وہ تھی ہی اتنی حسین، کسی ٹھنڈے سائے کی طرح مہربان، بات یوں کرتی گویا بات بنی ہی اس کے لئے ہے۔

دل اس کے بارے میں سوچ کر ہی خوش ہو رہا تھا، وہ زینو کے کھڑکی کے پٹ کھولنے پر چونکا۔

"انہیں بند ہی رہنے دو۔" اس نے لیٹے لیٹے دوسری سائیڈ پر کروٹ بدل لی، جانے کس احساس کے تحت، ٹوٹ کر یاد آئی تھی وہ اسے۔

"بھیا تاریکی کیسی بھی ہو اچھی نہیں ہوتی، بعض اوقات کمروں کی گھٹن ذہنوں کو بھی جکڑ لیتی ہے، انہیں اپنا غلام بنا لیتی ہے اور آپ خود کہتے ہیں کہ ذہن کی تنگی غلامی کو جنم دیتی ہے۔" زینو کی فلاسفی سے بھری باتیں سن کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، کھڑکی کھلنے سے کمرہ روشن ہو گیا ہلکی ہلکی گرم ہوا بھی اندر داخل ہوئی تھی۔

"ذہن کی تنگی اور کمرے کی تاریکی میں بہت فرق ہوتا ہے۔" وہ لکھنو کے اس خوش نما ماحول سے فی الحال باہر آ گیا۔

"کمرے کو میں اس لئے بند رکھتا ہوں کہ باہر کا شور اندر کے ماحول کو خراب نہ کرے، زمین

کی تنگی اور بزدلانہ پن بے شک غلامی کو جنم دیتا ہے، مگر الحمدللہ میرا ذہن بہت کھلا اور کشادہ ہے۔''

''پتہ ہے تمہیں ذہن کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں اور وہ قومیں جن کے لوگوں کے ذہن جاگتی آنکھوں سوئے رہتے ہیں وہ کبھی بھی آزادی کی صبح نہیں دیکھ پاتیں۔'' بھیا کی باتیں سنتی وہ ان کے قریب چلی آئی اور ان کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''شعور کے پردے پر غلامی جب کسی کانٹے کی طرح چبھنے لگے مانو وہی وقت آزادی کے جاگنے کا ہوتا ہے اور ہماری آزادی بھی جاگنے والی ہے۔'' بھیا کی جوش سے بھری باتیں سن کر وہ خاصی محظوظ ہو رہی تھی۔

''بے شک اب ہماری آزادی کی دلہن کو کوئی نہیں روک سکتا۔'' وہ عباس کو دیکھ کر سچے دل سے مسکرائی، عباس کو یوں باتیں کرتا اچھا تو لگ رہا تھا مگر اسے جلدی تھی جانے کی اس لئے اس نے غسل خانے کا رخ لیا۔

عباس کو جگانے کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل آئی آگے بڑی بھابھی برآمدے میں بیٹھی حمیدہ کی چٹیا میں پراندہ ڈال رہی تھیں جانے کس بات پر منہ پھلا رکھا ہے، زینو نے سوچا۔

آ گیا ہو گا دونوں میاں بیوی میں کہیں اعظم گڑھ کا ذکر، دراصل ظہورن بھابھی اعظم گڑھ (یو۔پی) کی رہنے والی تھیں اور وہ پچھلے دو سالوں سے اپنے میکے نہیں گئی تھیں ان کی ضد یہ تھی کہ بڑے بھیا یعنی ان کے شوہر نامدار ان کے ساتھ لے کر جائیں اور وہ ہر بار اپنی نوکری کا کہہ کر اکیلے جانے کو کہتے، یہی بات تھی جس کی وجہ سے دونوں میاں بیوی میں ٹھنی رہتی۔

وہ برآمدے کی پکی سرخ چھوٹی اینٹوں سے بنی سیڑھیاں اتر کر آنگن میں چلی آئی، زرد دھوپ سے سارا آنگن خالی ہو چکا تھا اور ایک خوشگوار شام دہلیز کے باہر کھڑی مسکراتی اندر آنے کی اجازت مانگ رہی تھی اور بھلا فطرت کو اجازت کی کیا ضرورت، زینو مسکرائی، مہر بشیر (گھر کا ملازم) کیاریوں کے پاس کھڑا پودوں کو پانی دے رہا تھا جو دن بھر کی گرمی سے نیم جاں ہو چکے تھے بڑی اماں تکیے پر سر لگائے کروٹ بدلے لیٹی تھیں، پنکھے والا ہاتھ ہولے ہولے حرکت کر رہا تھا منجھلی بھابھی اپنے کمرے میں ہی تھیں دو ماہ پہلے ان کی شادی ہوئی تھی، ابا دکان پر تھے بڑے بھیا کے دونوں بیٹے قریبی مسجد میں گئے تھے۔

''زینو!''

''جی اماں۔'' اس نے دادی اماں کے پلنگ کے قریب کھڑے کھڑے پلٹ کر برآمدے کی طرف دیکھا جہاں اماں کھڑی تھیں۔

''عباس جاگ گیا کیا؟''

''جی اماں! جاگ گئے ہیں۔''

''اسے کہیو ابرار میاں سے ملتا آئے، انہوں نے پیغام بھجوایا تھا۔''

''ابھی تو نہانے گئے ہیں آتے ہیں تو کہہ دوں گی۔'' اماں اس کی بات سن کر دوبارہ کمرے میں چلی گئیں۔

☆☆☆

اختر کے پاس بیٹھے بھی اس کا دل کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا، دل کی وادی اداسیوں کی زد میں تھی اس کے بغیر بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''میں اور یہاں نہیں رہ سکتا۔'' اس نے وہاں بیٹھے بیٹھے ہی فیصلہ کر لیا، میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

''کیا بات ہے بڑے چپ چاپ بیٹھے ہو۔'' اس نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا، کافی

لوگ وہاں جمع تھے لیکن ان لوگوں کی گفتگو کا موضوع ایک ہی تھا ہندوستان میں آئندہ کیا ہو گا، وہ سب کی باتیں صرف سن رہا تھا جواب کسی کا بھی نہیں دے رہا تھا اسے جواب دینا اچھا ہی نہیں لگ رہا تھا۔

''لگتا ہے جناب کو کسی کی یاد ستا رہی ہے۔'' وہ اس کے قریب ہی بنچ پر بیٹھ گیا، اختر سے وہ اپنے دل کی ساری باتیں کرتا تھا، اس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں تھا، گھر سے نکلتے وقت اس نے زینو سے کہا تھا کہ وہ کسی ضروری کام سے باہر جا رہا ہے اور ضروری کام یہی، وہ لاہور میں صرف اختر سے اپنے دل کی بات کہہ لیتا تھا آج بھی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی اس کے ساتھ اس کی باتیں کرے۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو یار! ایسی ہی بات ہے۔'' شام کے سانولے سائے رات میں ڈھلنے جا رہے تھے۔

''عباس دل بڑی اونچی جگہ لگا بیٹھے ہو، تو اب رجب علی خاں کی اکلوتی بیٹی، جس کے لئے نوابوں کی کمی نہیں، ایسے میں تم کہاں فٹ ہوتے ہو۔'' اختر کی منصفانہ بات پر ایک پل کے لئے وہ بھی دہل گیا۔

''لیکن چلو چھوڑو وہی بات کہ محبت یہ سب کہاں دیکھتی ہے، وہ تمہیں چاہتی ہے اور ہو سکتا ہے اس کی محبت میں استادم ہو کر سارے مسئلے حل ہو جائیں۔''

اختر نے پہلے خود ہی اسے دہلا دیا اور پھر بعد میں اس کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ دیکھ کر تصویر کا دوسرا رخ بھی دکھا دیا۔

وہ شروع سے بہت ہی شرمیلا تھا بہت جلد کسی سے فری نہیں ہوتا تھا یہ تو بس اس نواب زادی کی بے پناہ محبت نے اسے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''پتہ نہیں مسئلے حل ہوتے ہیں یا مزید بڑھتے ہیں اب تو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

''چلو اچھی بات ہے ویسے بھی وہ کہتے ہیں ناں کہ پانی میں کود کر ہی اس کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اب ڈوبیں یا پار لگیں، قسمت پہ چھوڑ دو۔'' اختر نے اس کے اندر سر اٹھاتے ڈر کو زائل کرنے کی کوشش کی۔

''واپس کب جا رہے ہو۔''

''اماں سے بات کروں گا۔'' واپسی پر اماں کے کہنے پر بھی وہ ابرار میاں کے ہاں نہیں گیا تھا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

تپتی دوپہر کے بعد آتی ٹھنڈی حسین شام کے خوش نما احساس کو اپنے کاسنی آنچل میں سمیٹے وہ حویلی کے پچھواڑے چلی آئی جہاں نواب رجب علی نے اس کی پسند کا خاص خیال رکھا ہوا تھا، ہری گھاس کو ہلکا ہلکا پانی دے کر نم کر دیا گیا تھا جو کے دن بھر کی گرمی سے جھلسا گئی تھی شام کے وقت ٹھنڈی ہری گھاس کے ساتھ وہاں نصب شہری فوارہ عجب بہار دکھاتا اور فوارے کے اندر نصب مورتی جو لال رنگ کی ساڑھی کو سلیقے سے اپنے گرد لپیٹے نیچے کو جھکی آئے والوں کی پیاس بجھاتی بڑی بھلی لگتی۔

سورج کی سنہری کرنیں زمین کے گرم سینے پر اپنا آخری سلام نذر کرتی آسمان کے بیضوی ماتھے میں جذب ہو رہی تھی اور وہ انہیں آتی رات (ٹھنڈی) کے حسین سپنے دکھاتا خواب کی وادیوں میں خراماں خراماں لئے جا رہا تھا اور وہ اس کی محبت میں گرفتار آنے والے وقت کے فریب سے خوف زدہ ہوئے بغیر اس کے ہمراہ ہو لی تھیں۔

''محبت کا فریب۔'' اس کا دل یکدم بڑی

تیزی سے دھڑکا۔

"محبت اگر فریب ہے تو، کیا پاس، نہیں، نہیں۔" اس نے خود کو سمجھایا، مگر سمجھ کر بھی دل سمجھ نہ پایا، ایک تو وہ ویسے بھی اس سے دور تھا۔

"اب اور کتنے دن لگیں گے، ہمیں رونا آ رہا ہے عباس، واپس آ جائیں۔" اس کی آنکھیں حقیقت میں نم ہو گئیں۔

"نہیں رہ سکتے ہم آپ کے بغیر، کہے دیتے ہیں ہم۔" اس نے جیسے اس کے خیال کو ہی بڑے دلار سے پکارا، دو آنسو لڑھک کر اس کے گالوں سے نیچے گرے، دور سے بوا کے کھانسنے کی آواز آئی تو اس نے جلدی سے گال رگڑ ڈالے۔

"بوا تو پوچھ پوچھ کر میری جان کو آ جائیں گی۔" اس نے خود سے کہا، بعد میں اپنے رونے پر اسے خود ہی ہنسی آ گئی۔

"ہم بھی کتنے پاگل ہیں، عباس ٹھیک ہی کہتے ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں کو وہم بنا کر سر پر سوار کر لیتے ہیں ہم، وہ صرف ہمارے ہیں، اپنے دل کو پوری طرح تسلی دیتے ہوئے وہ کرسی پر ٹھیک طرح بیٹھ گئی اور سر کو پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"ارے سلطنت بیٹا کیا سر میں درد ہے، ہے تو لائیں دبا دیں ہم۔" بوا نے گھبراتے ہوئے اس کے ماتھے کو چھوا۔

"ارے نہیں بوا، درد نہیں ہے بس ایسے ہی آنکھیں بند کی تھیں۔"

"ہم تو ڈر ہی گئے، بڑے نواب صاحب کو پتہ چل جاتا تو میری تو شامت آ جاتی کہ بیٹا کہ سر میں درد تھا کسی نے خبر ہی نہ لی۔" وہ ان کے انداز پر ہولے سے مسکرا اٹھی۔

"آپ بس ہمیں چائے پلا دیجئے اور کچھ نہیں۔"

"ابھی آ جاتی ہے چائے ہماری بٹیا کے لئے۔" وہ جلدی سے گئیں اور تھوڑی دیر بعد چائے کی ٹرالی گھسیٹتی اس کے قریب چلی آئیں۔

"کتنا خیال کرتی ہیں ہمارا۔" اس نے بڑی محبت سے انہیں دیکھا، اس کی ماں نہیں تھی مگر اس کی دادی اماں اور بوا نے کبھی ان کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی وہ بہت چھوٹی تھی جب اس کی والدہ اس فانی دنیا سے چلیں گئیں، نواب صاحب دن رات اپنی سیاست میں مصروف رہتے تھے ایک بھائی تھا وہ شادی کر کے انگلستان میں ہی بس گیا تھا، کبھی کبھی وہ بہت اداس ہو جاتی، کتنے عزیز رشتے ہیں بھائی، باپ مگر محبت اور شفقت کسی سے بھی نہیں مل رہی، ساری حویلی میں وہ کسی سائے کی طرح تنہا پھرا کرتی۔

بڑے نواب کی سخت طبیعت کی وجہ سے یونیورسٹی کی سہیلیاں بس وہیں تک ہی تھیں صرف خورشید جہاں تھی جو اس کے گھر آ جاتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ابا بھی سیاست سے وابستہ تھے اور بڑے نواب کی ان کے ساتھ خوب بنتی تھی۔

ایک عباس ہی تھا جو اس کی زندگی کو تازہ گلاب کی صورت مہکا گیا تھا اور اسے دیکھ کر اسے پہلی دفعہ لگا تھا کہ زندگی کتنی خوبصورت ہے۔

عباس، اس ٹھنڈے پتلے میں اس نے جس طرح آگ بھری تھی یہ وہی جانتی تھی، اتنا شرمیلا اور باحیا مرد اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا اور اس کی یہی بات وجہ محبت بن گئی تھی اور پھر ابا حضور کے سارے خوف بالائے طاق رکھے اس وادی میں اتر آئی جہاں اگر پھول ہیں تو ببول کے کانٹے بھی۔

"لو بیٹا چائے پیو۔" بوا نے چائے کا کپ اس کے آگے کیا۔

حویلی کے پچھواڑے رات کی رانی کی مہک فضاؤں کو معطر کر رہی تھی، کیاریوں میں جا بجا پھولوں کی گردنیں اکڑی کھڑی تھیں، بس کبھی کبھی وہ ہوا کے زور کے آگے جھک جاتے مگر دوسرے ہی پل وہی اکڑ مزاج کا حصہ بن جاتی، گو کے ہوا میں ٹھنڈک نہیں تھی مگر وہ پھر بھی اچھی لگ رہی تھی، بوا بڑے سلیقے سے اسے چائے کے ساتھ دوسرے لوازمات پیش کر رہی تھیں، نوابوں کی پرانی خدمت گزار تھیں سارے رکھ رکھاؤ جانتی تھیں اس لئے تو ابھی تک اس حویلی میں اہم کردار ادا کر رہی تھیں، دادی حضور تو اب بس مشکل سے ہی چل پھر لیتی تھیں، نواب صاحب کی سیاسی سرگرمیاں اور بڑے نواب کے چھوٹے بھائی یعنی چچا حضور ویسے ہی ہر چیز سے بے نیاز تھے وہی تھیں جو سلطنت کا ہر طرح کا خیال رکھتی تھیں اور اس چیز کا علم نواب صاحب کو بخوبی تھا اس لئے وہ ان کی بہت عزت کرتے تھے اور انہی کی موجودگی کی وجہ سے پورا پورا ہفتہ گھر سے باہر گزار لیتے تھے بے فکرے ہو کر، گھر میں نوکروں چاکروں کی ایک فوج موجود تھی مگر بوا ہر ایک الگ ہی بھروسہ کیا جاتا تھا، کس کو کیا کیا چاہیے وہ سب جانتی تھیں، سلطنت سے پہلے وہ دادی حضور اور چھوٹے نواب صاحب کے کمروں میں انہیں چائے دے کر آئی تھیں۔

"ایک بات تو بتائیں بوا۔" چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے وہ اس کی چسکی لینے کے بعد بولی۔

"اے لو بٹیا، ایک کیا ہزار پوچھو۔" وہ اس کو چائے دینے کے بعد خود گھاس پر بیٹھ چکی تھی۔

"ہماری امی حضور کیا بہت حسین تھیں۔" سلطنت کے چہرے پر ماں کے ذکر پر عجیب دھوپ چھاؤں سی کیفیت اتر آئی آنکھوں میں کئی سوال نیلی پیلی روشنیوں کا سا عکس لئے چائے کے کپ میں قوس وقزح بنانے لگے۔

ماں کا رشتہ دنیا کے تمام رشتوں سے ارفع ہوتا ہے اس کا اکیلا پن اس رشتے کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔

"حسین لفظ تو بہت چھوٹا ہے بیٹا اور ویسے بھی اس بات کا ثبوت ہے آپ کے ابا حضور کا اکیلا پن، پچھلے اٹھارہ سال سے آپ کی امی حضور کی جدائی برداشت کرتے آ رہے ہیں مگر کسی دوسری عورت کی ہمراہی انہیں منظور نہیں، بہت دفعہ آپ کی دادی حضور نے شادی کا کہا مگر ان کا ایک ہی جواب رہا۔"

"اختری کے بعد اس کسی اور عورت کی گنجائش نہیں زندگی میں۔"

"کچھ اور بتائیں ناں بوا ان کے بارے میں۔" سلطنت کا شوق بڑھا۔

"آپ تو بہت کچھ جانتی ہیں حویلی کے بارے میں۔" بوا کی آنکھیں جانے کیا سوچ کر نم ہو گئیں تھیں ساٹھ کے قریب ان کی عمر ہونے کو آئی تھی، چہرے پہ گزرتا وقت اپنے نشان چھوڑیں جا رہا تھا انہی نشانیوں کے بیچ دفن تھیں اس حویلی کی کئی کہانیاں، مختلف کردار تھے مختلف آوازیں تھیں جنہیں سلطنت نے ان کے توسط سے آواز دینا چاہی تھی، بوا کا دل ایک ایسا مدفن تھا جہاں بہت کچھ دفن تھا لیکن انہوں نے اس حویلی کا نمک کھایا تھا وہ کیسے کسی ایسے راز کو افشاں کر سکتیں تھیں جس سے اس حویلی کی عزت پر حرف آتا۔

"آپ ہو بہو اپنی امی حضور کی شکل رکھتیں ہیں، بہت حسین تھیں کم گو، لیکن انہیں اپنی حیثیت کا مان بہت تھا اور ہوتا بھی کیوں ناں آخر کو وہ نواب سلطان جہان کی اکلوتی صاحبزادی تھیں

جن کا پورے میرٹھ میں طوطی بولتا تھا، آپ کے نانا حضور کو دیکھ کر ہی سامنے والے بندے پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اتنی جلالی طبیعت تھی ان کی، شان و شوکت کی مرقع تھی وہ حویلی اور اس حویلی پر راج کرتی تھیں آپ کی نانی حضور۔" بات کرتے کرتے بوا خاموش ہو گئیں تو وہ اشتیاق سے سن رہی تھی ان کی خاموشی پر بگڑ گئی۔

"چپ کیوں ہو گئیں اور کچھ بتائیں ناں۔"

"اور کچھ بٹیا ہے ہی نہیں بتانے لائق۔"

اسے لگا جیسے وہ اس سے نظریں چراتے ہوئے کچھ چھپا رہی ہیں۔

"بتائیں ناں۔"

"کچھ بھی نہیں بٹیا، اچھا اب میں چلوں، بہت سے کام پڑے ہیں۔" وہ ٹرالی میں سارا سامان رکھتیں اسے گھسٹتی اندر چلی گئیں، سلطنت ان کے اس رویے پر حیران سی تھی، کچھ تو تھا جسے وہ چھپا گئی تھیں۔

☆☆☆

شام کے سائے سارے میں پھیل چکے تھے، بچی کھچی دھوپ بھی آسمان کے سینے میں جذب ہو چکی تھی، اپنے کمرے میں وہ چپ چاپ اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا جب اماں کمرے میں آئیں، طبیعت میں بوجھل پن نمایاں ہو رہا تھا۔

"کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" وہ بڑی فکر مندی سے پلنگ کے پاس آ گئیں، ماں تھیں بیٹے کو یوں اداس اور چپ چاپ دیکھ کر رہا نہ گیا۔

"جی اماں میں ٹھیک ہوں، بس ایسے ہی لیٹا تھا۔" وہ ان کے آنے پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"باہر نکل کر بیٹھو، کمرے میں گرمی ہے۔" وہ ہاتھ والا پنکھا ساتھ لائی تھی اسے ہوا دینے لگیں۔

"رہنے دیں دل نہیں چاہ رہا۔" انہیں اس کی بیزاری کی سمجھ نہ آئی۔

"کیا بات ہے مجھے بھی تو بتاؤ ماں ہوں تمہاری، میرا بیٹا یوں چپ چاپ اور بیزار سا بیٹھے مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔" وہ اس کے ماتھے پر آئے بال بڑی محبت سے پیچھے کرنے لگیں تو وہ ان کے گلے سے لگ گیا، ماں سے اسے بے پناہ محبت تھی۔

"کیا بات ہے کچھ بولو گے نہیں۔" انہوں نے مزید اسے خود کے ساتھ لگا لیا۔

"اوں، اماں لکھنو میں ہوتا ہوں تو آپ کی خراب طبیعت کا سوچ سوچ کر پریشان رہتا ہوں۔" وہ ان سے الگ ہوتے ہوئے بولا۔

"تو چھوڑ آؤ لکھنو کو۔" اماں نے یہ بات دل سے نہیں کہی تھی مگر اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔

"کہہ دوں تمہاری ماموں کو سامان بھجوا دیں تمہارا، بولو کیا جواب دیتے ہو۔" وہ جیسے اس سے کچھ سننا چاہ رہی تھیں، لیکن وہ ان کی باتوں کی گہرائی سے بے خبر تھا۔

"اب تو نہیں چھوٹنے کا لکھنو۔" وہ اماں سے نظریں چراتے ہوئے مسکرا کر نظریں جھکا گیا۔

"کیوں ایسا کیا ہے لکھنو میں، جو آنا اتنا مشکل لگ رہا ہے۔" اماں نے جیسے کریدا، جانے وہ کیا پوچھنا چاہ رہی تھیں جو وہ سمجھ نہیں رہا تھا۔

"وقت آیا تو بتا دوں گا۔"

"کیا بات ہے ماں بیٹے میں بڑے راز و نیاز چل رہے ہیں۔" زینو کے آنے پر ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

زینو اماں کے لئے ابا کا پیغام لائی تھی جسے سن کر وہ باہر چلی گئی تھیں۔

"کیا کہہ دیا اماں کو وہ بڑی خوش ہیں، کہیں بڑے ماموں کا ذکر تو نہیں چھیڑ دیا گیا تھا۔"

"کیا مطلب۔" زینو کی بات پر اسے کچھ کھٹکا۔

"بڑے ماموں سے کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ پوچھتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گا۔

"اماں نے کوئی بات نہیں کی آپ سے؟"

"نہیں تو۔" اسے تشویش ہوئی۔

"اماں نے کونسی بات کرنا تھی تم جانتی ہو کیا۔" زینو اس کی لاعلمی پر جیسے خاموش ہو گئی۔

"نہیں بھیا میں نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا، بات تو کوئی نہیں ہے۔" وہ جلدی سے اٹھ کر باہر نکل گئی جیسے وہ کچھ اور نہ پوچھ لے، عباس کو جیسے حیرت نے گھیر لیا۔

☆☆☆

ڈھیر سارے سفید موتیے کے پھول لیے وہ حویلی کے پچھواڑے حوض کے پاس بیٹھی حسنی کے ساتھ گجرے بنا رہی تھی۔

بڑے نواب صاحب اور چھوٹے نواب صاحب کے ساتھ دادی حضور باہر کرسیوں پر براجمان تھیں دونوں بیٹے گھر تھے اس لئے آج وہ بہت خوش تھیں۔

اس نے دو تین گجرے بنا لئے تو اٹھ کر ان کے قریب چلی آئی جہاں پانی کے مٹکے گھڑونچیوں پر عارضی طور پر رکھوائے ہوئے تھے صاف ستھرے، ٹھنڈے سرخ مٹکے بہت بھلے لگ رہے تھے اس نے دونوں مٹکوں کے اوپر ہار ڈال دیئے جن میں گلاب اور بیلا بھی کہیں کہیں اٹکا ہوا تھا، باقی ہار اس نے گھڑونچی پر سجا دیے، دادی حضور دل ہی دل میں اس کے سلیقے پر خوش ہوئی تھیں۔

"آؤ یہاں آؤ۔" انہوں نے پیار سے اسے اپنے پاس بلایا۔

"پھول بہت پسند ہیں ہماری بیٹی کو۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"جی!" وہ دونوں نوابوں کی موجودگی میں حرف "جی" ہی کہہ سکی، اپنے ابا حضور سے اس کی اتنی بے تکلفی نہیں تھی اس لئے وہ ان سے ڈر کر بات کرتی تھی اور کچھ ان کا اپنا انداز بھی ایسا ہی تھا، لئے دیئے والا برتاؤ، بڑے نواب بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے تھے بولے کچھ نہیں تھے، وہ اٹھ کر دوبارہ حسنی کے پاس چلی گئی جو بوا کے ساتھ باورچی خانے میں جانے کے لئے تیار کھڑی تھی دراصل آج بڑے نواب کے کچھ مہمان کھانے پہ تشریف لا رہے تھے جو کافی عرصے سے لندن میں مقیم تھے، اپنے اہل خانہ کے ساتھ۔

عباس کا بھی خط آیا تھا کہ وہ دو تین دن تک لکھنو آ رہا ہے دل تو خوشی سے جھوم رہا تھا جب سے سنا تھا ایک ایک پل کتنی مشکل سے گزر رہا تھا، تو یہ کتنے بے درد لمحے میں جو جلد کٹنے کا نام نہیں لے رہے، ہماری تو سانسیں رکتی جا رہی ہیں۔

سارے کام وہ خوشی خوشی کیے جا رہی تھی، شام کو کھانے کی میز کو اس نے حسنی کے ساتھ مل کر دنیا کی تمام نعمتوں کے ساتھ سجا دیا تھا۔

سارے مہمان اسے بڑے تپاک سے ملے تھے وہ آج کافی دنوں کے بعد بڑے کرینے سے تیار ہوئی تھی اور جس کے لئے تیار ہوئی تھی وہ اس سے کوسوں دور تھا۔

"لگتا ہے آپ سبزی خور ہیں، آپ کی جلد بہت خوبصورت اور چمکدار ہے۔" بیلا ان کی جوان سال بیٹی سلطنت کو بڑے رشک سے دیکھ رہی تھی۔

"کھاتی ہوں مگر ایسی کوئی روٹین نہیں ہے

سبزی کی، ویسے میں کھانے کی اتنی شوقین نہیں ہوں۔" کھانے کے بعد وہ اسے باہر ہی لے آئی تھی، رات ہو چکی تھی، ہوا معمول کے مطابق ہی تھی۔

"فلموں کا شوق رکھتی ہیں آپ؟" وہ تو جیسے انٹرویو لے رہی تھی، اس کے سوالوں پر اسے ہنسی آ رہی تھی، رات کو واپس جاتے ہوئے وہ اسے بڑی محبت سے ملی تھی۔

"دوبارہ جلد ملیں گے۔" اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھر والے بھی بہت خوش خوش تھے۔

ان کے جانے کے بعد وہ حسنی کو لے کر چھت پر چلی آئی، حسنی ان کے بہت پرانے ملازم غلام علی کی بیٹی تھی اس کی ہم عمر ہی تھی وہ اس لئے سلطنت اس کے ساتھ بات وات کر لیا کرتی تھی، لیکن عباس کا ذکر اس نے بھولے سے بھی اس کے ساتھ نہیں کیا تھا اگر دونوں نوابوں کو بھنک بھی لگ گئی تو قیامت آ جائے گی، لیکن وہ اس قیامت کو کہاں تک روک سکتی تھی ایک نہ ایک دن تو سب کو خبر ہو ہی جائے گی، وہ چھت پر بچھے تخت پر بڑے مایوسی بھرے انداز میں بیٹھ گئی ہاتھوں میں پہنے تازہ پھولوں کے گجرے اب باسی ہو چلے تھے۔

"تھک گئی ہیں تو سر دبا دوں۔" حسنی نے دل جوئی کرنا چاہی۔

"نہیں رہنے دو، یہ گجرے لو۔" اس نے وہ گجرے لے کر ایک طرف رکھ دیئے۔

ایک نہ ایک دن یہ حقیقت کھلے گی، اپنی حیثیت سے کم مرتبہ آدمی کو یہ لوگ کیسے قبول کریں گے، وہ جس کا نوابی سے دور دور کا رشتہ بھی نہیں، "تو کیا نواب کے لئے ایک نواب ہی ہو سکتا ہے۔" اس نے جل کر سوچا، حسنی اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی مگر اس کی سوچوں میں خلل نہیں ڈال سکتی تھی۔

آج جتنی خوشی تھی وہ یہ سب باتیں سوچ کر اتنا ہی اداس ہو گئی تھی اندیشے سے تھے جو ہر طرف سے سر جوڑے چلے آ رہے تھے۔

عباس کی وہ جھکی جھکی باحیا آنکھیں، جو اس کی طرف اٹھیں تو اس کی ہستی کو انہوں نے اپنے اندر سمولیا، کیسے وہ ان سے دور رہ سکتی ہے۔

"نہیں کبھی نہیں۔" سوچ کر ہی اسے جھرجھری سی آ گئی۔

☆☆☆

"ہم نے کہہ دیا عباس کے ساتھ نہ جائیں گے اعظم گڑھ، حسن جائیں گے تو جاؤں گی۔" ظہورن بھابھی اپنے مطالبے پر جمی بیٹھی تھیں۔

"ہم ان کے لئے بنا نہ جائیں گے آخر کو ہماری بھی عزت کا سوال ہے۔" اماں بھولے سے کہہ بیٹھی تھیں کہ عباس لکھنو جا رہا ہے تمہیں بھی اعظم گڑھ چھوڑ آئے گا مگر وہ تو اتنا سن کر بھڑک اٹھیں۔

"ان کے سسرال اتنے بھی گئے گزرے نہیں جو یہ وہاں قدم بھی نہیں رکھتے ہمارے ابا بھی نواب اعظم گڑھ کے باورچی ہیں، ہم کون سا کسی سے کم ہیں۔" ظہورن بھابھی کی بات سن کر زینو کی ہنسی چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔

"ابا باورچی ہیں اسی لئے بیٹی کے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے۔" زینو نے عباس نے کان میں سرگوشی کی تو اس کی طنز پر عباس نے گھور کر اسے دیکھا۔

"ایسے نہیں کہتے۔"

"میری بلا سے جس کے ساتھ مرضی جاؤ، میں نے تو تمہارے بھلے کو ہی کیا تھا۔" اماں اس بات کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتی تھیں اس لئے اٹھ کر اندر چلی گئیں، بڑے بھیا حسن ابھی دفتر سے لوٹے نہیں تھے۔

"یہ اچھا ہے جو بات نہ ماننا ہو، اٹھ کر چل دیئے۔" بھابھی اماں کے یوں اٹھ کر جانے پر تلملا اٹھیں، حمیدہ ان کی گود میں بیٹھی تھی۔

"بیٹے کو زور نہیں دے سکتیں آپ، دیکھتی ہوں کیسے نہیں مانتا آپ کی بات۔" اماں کمرے میں جا چکی تھیں ان کی باتیں سن کر بھی وہ واپس باہر نہ آئیں، اپنے بیٹے کی عادت کو وہ اچھی طرح جانتی تھیں، اپنے علاوہ وہ کسی کی نہیں سنتا تھا، عباس بھی ان کی عادت جانتا تھا بھیا نے جو کہہ دیا بس کہہ دیا۔

اب وہ کیا کر سکتا تھا یہ بھیا اور بھابھی کا ذاتی معاملہ تھا، وہ لے جانا چاہتی ہیں وہ جانا نہیں چاہتے، دونوں اپنے محاذوں پر ڈٹے تھے کوئی تیسرا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اماں کی ہدایت کے مطابق وہ لکھنو پہنچ کر گھر جانے کی بجائے سیدھا ناہید آپا کے پاس (اس کی بڑی بہن) فیض آباد گیا تھا۔

فیض آباد لکھنو سے کوئی پچیس تیس کوئی دور ایک پرانا اور خوبصورت شہر ہے جیسے کسی زمانے میں بنگلہ بھی کہا جاتا تھا۔

یوں تو لکھنو ملت اسلامیہ کا ایک انوکھا اور بے مثال شہر ہے یہاں کی وضع داری پوری دنیا میں مشہور ہے، بڑے بڑے نوابوں نے اس سر زمین پر جنم لیا، جیسے امام باڑوں کی سرزمین بھی کہا جاتا ہے اور اس کی ایک بہت بڑی پہچان۔

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جا
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

میر انیس، جس نے مرثیے کو بام عروج پر پہنچا دیا۔

ناہید آپا قدیم محلے میں رہتی تھیں جہاں کسی زمانے میں میر انیس کی قیام گاہ تھی، آپا کو لاہور گئے ہوئے کافی عرصہ ہو چلا تھا اماں بہت اداس ہو رہی تھیں، انہوں نے کچھ سامان بھجوایا تھا ان کے لئے جو وہ گھر جانے سے پہلے انہیں دینا چاہتا تھا، حیدر بھائی اس وقت گھر موجود نہیں تھے۔

آپا سچ میں بہت اداس ہو گئیں تھیں مگر اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اس لئے وہ پھر جلد آنے کا کہتے ہوئے واپس ہو لیا۔

جب وہ گھر آیا تب ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا گرمی کے مارے برا حال تھا، یہ قدیم لکھنو کا ایک پرانا محلہ تھا جو امام بارہ حسین آباد کے پاس تھا، پرانی وضع کے علمبردار اس گھر کے ایک ایک کونے میں اپنایت چھلکتی تھی، چاروں طرف کمرے اور ان کے وسط میں بڑا سا کھلا ٹھنڈا آنگن اور اسی آنگن کے ایک کونے میں بڑا سا درخت جہاں سویرے سویرے چڑیاں چہچہاتی تو زندگی کے ہونے کا احساس چارسو پھیل جاتا۔

اس کا اپنا کمرہ چھت پر تھا، کمرے کے آگے چھوٹا سا برآمدہ، بڑی سی چھت کے ایک کونے میں کمرہ واقعہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت سکون رہتا، ویسے گھر میں تھا بھی کون، دونوں ماموں سارا دن گھر سے باہر، بڑے ماموں کی ایک ہی بیٹی (اکبری) اور چھوٹے ماموں کے دو لڑکے، دونوں آدھا دن سکول اور پھر تھوڑی سی بچی چیزوں کے ساتھ خوش آمدید کہتا اس کا کمرہ، کتنا سکون ملا تھا اسے، ایک جگہ کی عادت بن جاتے تو کہیں دور چین نہیں آتا اور اسے تو ویسے بھی چین لکھنو آ کر ہی ملتا تھا وہ سوچ کر ہی مسکرا دیا۔

"کہیں غلط فہمیاں تو جنم نہیں لے رہی۔" وہ سوچ کر افسوس میں سر ہلانے لگا۔

اس وقت وہ سلطنت کے علاوہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہ رہا تھا اس لئے ساری سوچوں کو

جھٹکتا کپڑے تبدیل کر کے کھانا کھانے لگا۔

☆☆☆

خوشی سے من جھوم رہا تھا وہ موتیے کے گجرے ہاتھوں میں پہنے بالوں کی لمبی سی چٹیا میں چمپا اڑسے ہلکے گلابی رنگ کا انگرکھا پہنے بے حد حسین اور دلکش لگ رہی تھی۔

"آج وہ بھی ان فضاؤں میں سانس لے رہا ہے جن میں، میں کھڑی ہوں۔" محبت کا یہ پاگل پن کتنا خوش کن لگ رہا تھا، محبت ہوش اڑاتی، نیند چراتی۔

اپنے کمرے کے قد آور آئینے کے سامنے وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے کھڑی تھی اور خود کو بار بار عباس کی نظروں سے جانچ رہی تھی، "حسن کو تو بجنے سنورنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔" ایک دفعہ عباس نے اسے کہا تھا لیکن جانے کیوں آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ عباس کے حواسوں پر چھا جانے کی حد تک حسین لگے وہ اس سے ایک لمحے کے لئے بھی نظریں نہ ہٹا سکے۔

پورے پچیس دن بعد اس نے مجھے دیکھنا ہے، دیوانہ دل اس وقت یہ سوچنے سے قاصر تھا کہ محبت کرنے والے چہروں سے زیادہ روح کے قریب ہوتے ہیں، چہرے تو فریب دیتے ہیں، فنا ہو جاتے ہیں مگر روح ایک ابدی رشتہ ہے، کبھی نہ ٹوٹنے والا۔

بوا اسے اتنا بنتے سنورتے دیکھ کر قریب چلی آئیں۔

"کہاں کی تیاری ہے ہماری بٹیا کی۔" وہ اپنے ہاتھوں میں پہنے ہوئے گجروں کو سونگھ رہی تھی۔

"خورشید جہاں کے ہاں، قمر سے کہہ دیں گاڑی نکال لے، جلد نکلنا ہے ہمیں۔" بات کرتے ہوئے اس نے بوا کے ساتھ زیادہ نظریں نہیں ملائی تھیں مبادا کوئی اور سوال نہ داغ دیں وہ بھی اس کے جلد نکلنے پر مزید کوئی اور سوال کیے بغیر واپس مڑ گئیں دادی حضور اپنے کمرے میں استراحت فرما رہی تھیں وہ ان کو بتانے کی غرض سے کمرے میں گئی اور پھر انہیں خورشید کا بتانے کے بعد کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

"تم بغیر اطلاع کے؟" خورشید اپنی امی حضور کے ساتھ برآمدے میں تخت پر بیٹھی پھل کاٹ رہی تھی۔

"کیوں بھئی اپنے آنے کا میں پہلے اخبار میں اشتہار دیا کروں۔" سلطنت نے فرط شوق سے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔

"اندر آ جاؤ۔" اس نے آنکھ سے اماں کی طرف اشارہ کیا وہ انہیں آداب و تسلیم کرتی اندر آ گئی۔

"عباس کب آئے؟" وہ دونوں پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

"کل ہی آئے ہیں۔" اس کے گال محبت کی الوہی روشنی سے لال ہوئے جا رہے تھے۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔" خورشید نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

"آج ہم بہت خوش ہیں۔" آنکھوں میں ستارے سے کوندے، خورشید کو اس پیاری سی لڑکی کی اتنی وارفتگی پر ڈھیروں پیار آ گیا۔

"ہمیشہ یونہی خوش رہو اور وہ تمہارا اجلی اجلی آنکھوں والا، قسم سے میں کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تم واقعی میں بہت خوش قسمت ہو کہ عباس جیسا مرد تمہاری زندگی میں ہے جس کے بارے میں سوچ کر ہی لڑکیاں پاگل ہو جاتی ہیں، ویسے تو تم خود بھی قیامت ہو اور قیامت کا توڑ قیامت ہی

ہو سکتی ہے؟" خورشید کی باتوں پر اس نے دل ہی دل میں عباس کی نظر اتاری۔

"اچھا شام تک گھر سے گاڑی آئے گی تب تک میں بھی آ جاؤں گی۔" اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر قیصر باغ کی بارہ دری پہنچ جائے۔

بے قرار نظریں ہر طرف اسے ہی تلاش کر رہی تھیں اور پھر وہ اسے خود سے تھوڑے فاصلے پر ایک بنچ پر بیٹھا نظر آیا وہ بھی اسے آتا دیکھ رہا تھا دو بے قرار دل اک لمحے کے لئے ایک دوسرے کو دیکھ کر دھڑکنا بھول گئے تھے، گرمی کا زور یکدم ٹوٹ گیا انہیں لگا جیسے تیز ہوائیں انہیں اڑائیں اک دوسرے کے قریب لا رہی ہیں، اک الوژن کی کیفیت میں تھے وہ دونوں، یہ چند قدم انہوں نے کیسے اٹھائے کیسے وہ چل کر پاس آئے انہیں خبر نہیں تھی سب اپنے آپ ہی ہو رہا تھا۔

دو بت اک دوسرے کے آمنے سامنے تھے، لمحے جیسے منجمد ہو کر ایک جگہ ٹھہر گئے تھے، یہ لمحے دوبارہ نہیں آئیں گے، کاش گھڑیاں یونہی ساکت ہو جائیں۔

"سلطنت۔"

"نہیں عباس کچھ نہیں بولیے، ہمیں بس محسوس کرنے دیجئے کہ آپ ہمارے پاس ہیں۔" اس نے آنکھیں موند لیں، عباس کا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر وہ ان آنکھوں کی معصومیت کو لبوں سے چوم لے مگر ہمیشہ کی طرح حیا نے دامن تھام لیا۔

"یہ دوری، ہم تو جیسے اپنی ہستی ہی کھونے لگے تھے، آپ کے بغیر وہ لمحے، قیامت بن کر گزرے ہم پر۔" وہ ہولے ہولے سے آنکھیں بند کیے بول رہی تھی۔

"آنکھیں کھولو، میں حقیقت میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں اور تم میرے سامنے۔" اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں، جیسے وہ خواب ہے آنکھیں کھلنے پر ٹوٹ جائے گا۔

وہ اسے لے کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا، پھر کافی دیر وہ دونوں باتیں کرتے رہے، جاتی سہ پہر کے سائے آتی شام کو جگہ دیتے خود سرکتے ہوئے پیچھے ہٹ رہے تھے، ہوا میں بھی ہولے ہولے شوخی سی آ رہی تھی، عباس بول رہا تھا اور وہ خاموشی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

نوابوں سے زیادہ جاہ و جلال، حسن اتنا کہ سامنے والا دم سادھے رہ جائے، سید زادہ، کیا کمی ہے اس میں، خواب کی وادی سے باہر قدم نکلے تو حقیقت سے آگے بڑھ کر قدم تھام لئے۔

"کیسے ہو گا سب؟" بڑے نواب صاحب کی پرچھائی جیسے اڑتی ہوئی ان دونوں کے درمیاں حائل ہو گئی، اسے جھرجھری سی آ گئی۔

"ابا حضور کبھی نہیں مانیں گے، وہ کسی بد کردار نواب کے ساتھ مجھے بیاہ سکتے ہیں مگر عباس نہیں کیونکہ اس کے ساتھ نوابی کا لیبل نہیں لگا۔" اس کی نظروں کے آگے چھوٹے نواب کا نقشہ کھنچ گیا، اس نے بوا کے منہ سے سنا تھا کہ وہ تو اپنے گھر کی خادماؤں کو نہیں چھوڑتے تھے، شریف زادیاں تو ان کا سامنا کرنے سے کتراتی تھیں۔

بوا نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ چاندنی بیگم، فیض آباد کی مشہور ناچنے گانے والی کو چھوٹے نواب گھر لے آئے، لیکن گھر والوں نے اسے بھگا دیا، لیکن وہ پھر بھی نہ سدھرے، تمام عمر شادی نہیں کی کہ اس رشتے کی عظمت کو نبھا نہیں سکتے تھے گھر آ کر بھی ان باتوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

☆☆☆

وہ شام کو گھر لوٹا تو اکبری باہر نل کے پاس کھڑی اپنے پاؤں دھو رہی تھی، اچانک اس کی

نظریں اس کے پیروں پر پڑی تھیں اس نے چہرہ پھیر لیا، وہ اندر آ گیا تو اس نے سر پر دوپٹہ جما لیا اور پھر لجاتی شرماتی اس کے قریب چلی آئی۔

"پانی لاؤں۔"

"نہیں رہنے دو۔" حالانکہ اس کو بہت پیاس لگی تھی مگر وہ اس کے اتنے لجانے شرمانے پر "نہ" کر گیا۔

"بھوک لگی ہو تو کھانا لاؤں۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگی، وہ چند سکھی سکھائی باتیں ہی کرتی تھی شاید اماں نے اتنا ہی کہا تھا۔

"رہنے دو بھوک نہیں، ممانی کہاں ہیں؟" بات کرتے ہوئے وہ چند قدم اس سے آگے بڑھ گیا۔

"میر رئیس کے ہاں گئی ہیں، قرآن خوانی میں۔" اس اس کا یوں چند قدم آگے کو بڑھ جانا اچھا نہ لگا اماں گھر پر نہیں تھیں اس بات کا فائدہ اٹھانا اس کا بھی حق تھا ورنہ اماں کی موجودگی میں نظروں کو کتنا سنبھالنا پڑتا تھا دل اتنا چاہتا تھا کہ وہ سامنے بیٹھا رہے اور وہ اسے دیکھتی رہی، اس کے سارے کام بغیر جھجک کے کرے، مگر وہ دامن بچا کر گزر جاتا۔

"چھوٹی ممانی کدھر ہیں؟" اس نے پھر بغیر اسے دیکھے سوال داغا۔

"باورچی خانے میں۔" عباس کی اتنی بے اعتنائی برتنے پر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا مگر وہ جاننے کی پروا کیے بغیر آگے کو بڑھ گیا، جہاں ممانی جان سل پر مصالحہ پیس رہی تھیں۔

"اور سناؤ لاہور والے سارے ٹھیک ہیں؟"

"شکر الحمدللہ، ہر طرح سے خیریت ہے۔"

"اچھی بات ہے میاں، آغائی بیگم کی طبیعت کیسی ہے، سنا تھا اچانک طبیعت بگڑ جاتی ہے، ہمیں تو بڑی فکر ہو رہی تھی۔" وہ کوفتے بنا رہی تھیں۔

"جی ممانی جان ان کی تو مجھے بھی ہر وقت فکر ستاتی رہتی ہیں، پتہ ہی نہیں چلتا پل میں کیا ہو۔"

"خدا سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، زینو کی سناؤ، اس کی تو نسبت طے ہے ناں اپنی پھوپھو کے لڑکے کے ساتھ۔"

"جی سالار بھائی، نیوی میں ہوتے ہیں کراچی۔" عباس نے آگاہ کیا۔

"ہاں ہم جانتے ہیں وہ ہماری ممانی کے دور کے رشتے دار ہیں، بڑے ٹھیک ٹھاک لوگ ہیں آگے زینو کی قسمت خدا نیک کرے۔" ان کے ہاتھ بڑی تیزی سے کوفتے بنا رہے تھے۔

"کتنا مشکل ہوتا ہے یہ بنانے کا عمل۔" عباس ان کی اتنی تیاری دیکھ کر سراہنے لگا۔

"اتنی محنت سے بناؤ پھر بھی تمہارے ماموں کوئی نہ کوئی نقص نکال ہی دیتے ہیں، ویسے تمہاری بیوی کو بڑا فائدہ ہوگا اتنا سراہنے والا مرد ملے گا۔" انہوں نے باورچی خانے کے دروازے سے اندر آتی اکبری کو بڑی معنی خیز انداز میں دیکھا۔

"اتنی محنت سے بناؤ اور کوئی سراہ کر کھائے، اچھا تو لگتا ہی ہے۔" ان کی نظریں کبھی اکبری کی طرف اٹھتیں اور کبھی عباس کی طرف جو شرما کر نظریں نیچی کر گیا تھا ہاں بیوی کے نام پر اکبری نے نجانے کس احساس کے تحت بڑے غور سے عباس کو دیکھا تھا، جہاں اسے اپنے لئے کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا، کیا تھا وہ اک نظر میری طرف دیکھ لیتا۔

"اپنی ظہورن بی کی سناؤ؟ ویسی ہی ہے وہ یا کچھ سنبھلی۔" ممانی جان بات پھر لاہور والوں کی طرف موڑ گئی۔

"ویسی سے کیا مطلب؟"

"سڑیل، ہر وقت غصے میں جو بھری رہتی ہے۔" ظہورن بھابھی کو وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں کیونکہ وہ ان کی ننھیالی رشتے دار تھیں۔

"نہیں تو، ایسی تو نہیں ہیں وہ۔" عباس نے جیسے ان کے سڑیل پن پر پردہ ڈالنا چاہا وہ اس کی بھابھی تھیں ہر کوئی انہیں بات کر جائے اسے یہ بات بھی برداشت نہیں تھی ورنہ جتنی وہ سڑیل تھیں وہ اچھی طرح جانتا تھا اپنے آنے سے پہلے کا واقعہ اس کی نظروں کے سامنے آ گیا، کیسے وہ اس دن اماں کے ساتھ بات کر رہی تھیں، بھابھی تھیں اس لئے وہ خاموش رہا ورنہ کوئی اور ہوتا تو وہ منہ توڑ دیتا جو اس کی ماں کے ساتھ بدتمیزی کرے۔

"ارے میاں رہنے دو، بچپن سے جانتی ہوں میں اسے، جانے آغائی بیگم کو اس میں کیا نظر آیا تھا جو اسے لائق بیٹے کو اس کے لڑ باندھ دیا کمی نہیں تھی اس کے لئے لڑکیوں کی، میرے بڑے بھیا نے ہزار دفعہ مجھے زہرہ کے لئے کہا مگر وہ نجانے کب جا پہنچی اعظم گڑھ۔" ممانی نے جانے کب کا غصہ نکالا تھا، عباس بولا کچھ نہیں، اکبری باورچی خانے سے باہر جا چکی تھی۔

"چلو جو ہوا اچھا ہوا، جہاں قسمت ہوتی ہے وہاں ہی ہوتا ہے، قسمت سے کون لڑا ہے۔" اپنی باتوں کا جواب انہوں نے خود ہی دے دیا تھا۔

"فیض آباد کب جا رہے ہو؟"

"قریب قریب تو نہیں۔" وہ سٹول سے اٹھتا ہوا بولا۔

"جب جاؤ گے تو مجھے بتا کر جانا میں نے کچھ چیزیں بھجوانا ہیں۔" ممانی جان کا میکہ فیض آباد میں ہی تھا اس لئے عباس جب فیض آباد جاتا کوئی کام ہوتا تو وہ اسی سے کرواتی وہ اٹھ کر باہر آ گیا آگے اکبری برآمدے کے پلر کے ساتھ ٹیک لگا کے کھڑی تھی۔

"یہ لڑکی کن راستوں پہ قدم رکھ رہی ہے؟" اسی بات کو سوچتا وہ زینہ چڑھنے لگا۔

☆☆☆

صبح وہ یونیورسٹی کے لئے تیار ہو رہا تھا، جب مہر دین کمرے میں ہانپتا ہوا آیا، بوڑھی جان تھی زینہ چڑھ کر آیا تھا اس لئے سانس پھول رہا تھا۔

"بڑے میاں آپ کو یاد فرما رہے ہیں، کہہ رہے تھے یاد سے مل کر جایئے گا۔" وہ اتنا کہہ کر انہی قدموں سے واپس مڑ گئے، گھر کے پرانے ملازم تھے با اعتماد، بڑھاپے کی وجہ سے کام بھی ٹھیک طرح سے نہیں ہو پاتا تھا مگر سارے گھر والے ان کے ساری زندگی اس گھر کے لئے وقف کر دینے کی وجہ سے ان کی بہت عزت کرتے تھے اور سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ اس گھر سے جائیں وہ اس گھر میں اس گھر کے ایک فرد کی طرح رہتے تھے۔

"ماموں نے صبح صبح کیوں یاد کیا۔" وہ تولیے سے اپنے شانوں کو رگڑنے کے بعد شرٹ پہن کر اس کے بٹن بند کرتا جلدی جلدی زینہ اترنے لگا۔

ماموں کی سخت طبیعت کی وجہ سے وہ ان سے زیادہ گھل مل نہیں پایا تھا حالانکہ کہ اب تو عرصہ ہو چلا تھا اس گھر میں رہتے ہو زینہ اتر کر وہ آنگن میں چلا آیا، بڑی ممانی باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھیں، چھوٹی ممانی بھی ان کی مدد کر رہی تھیں اکبری چھوٹے ماموں کو پانی کا گلاس دے رہی تھی (اسے دیکھ کر دوپٹہ سر پر جما لیا) جو آنگن میں پیڑ کے نیچے تخت پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے، عباس کو دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، باہری دیوار کے ساتھ ساتھ

بنی چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں موتیا گلاب مہک رہا تھا، ننھے ننھے پودے عجب بہار دکھا رہے تھے، ہلکی پھلکی ہوا چل رہی تھی، پرندے خوشی سے چہچہا رہے تھے، صاف ستھرے سرخ فرش کو نواہن (گھر کی ملازمہ) نے سویرے سویرے ہی دھو ڈالا تھا، ٹھنڈا ٹھنڈا، نکھرا نکھرا گھر کا ماحول اندر تک دل کو تسکین بخش گیا۔

وہ چھوٹے ماموں کو آداب کرتا، بڑے ماموں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا، دروازے کے قریب کھڑے ہو کر اس نے گلا کھنکارا۔

''آ جاؤ۔'' ماموں کی آواز پردے کے پیچھے سے نکلی تو وہ پردہ ہلکا سا سرکا کر اندر آ گیا، گرمی ہو یا سردی بڑے ماموں کے دروازے کے آگے ہمیشہ پردہ گرا رہتا، گرمیوں میں نٹ کا اور سردی میں کاٹن۔

اپنے کمرے کی صفائی بڑی ممانی جان خود کر کے گئی تھیں، ماموں جب تک صبح گھر میں ہوتے تھے نواہن کمرے میں نہیں آتی تھی، بس ماموں کو اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہوں اور آس پاس نوکرانیاں دندناتی پھیریں، صبح وہ تھوڑا لیٹ جاتے تھے اس لئے ممانی جان جلدی جلدی ناشتے سے پہلے کمرا صاف کر دیتی تھیں۔

پلنگ پر سفید دو دھاری چادر کرینے سے بچھی ہوئی تھی، دو کرسیوں کے درمیان چھوٹا سا میز جس پر کروشیے کے میز پوش پر راکھ دانی رکھی ہوئی تھی، ماموں سگریٹ بہت پیتے تھے، کمرے میں چھوٹی سی کتابوں کی الماری کے ساتھ آرام دہ کرسی کمرے کے حسن کو بڑھا رہی تھی، فرش پر ہلکے سبز رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا، وہ چلتا ہوا ان کے قریب آ گیا جو آرام دہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔

''آؤ یہاں بیٹھو۔'' وہ سامنے بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

''بہت دن ہوئے ملے نہیں تو سوچا بلا کر تمہارا حال ہی پوچھ لیا جائے۔''

''کیسی گزر رہی ہے۔'' اسے اس وقت اپنی سماعتوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا، ماموں کا یوں اسے اپنے پاس بلا کر حال پوچھنا، اتنا وقت گزرا اس گھر میں رہتے ہوئے لیکن ماموں سے سلام سے لیا تو انہوں نے جواب دے دیا ورنہ وہ زیادہ تر خاموش ہی رہتے تھے۔

''کیا ہوا ہے انہیں؟''

''جی میں ٹھیک ہوں۔'' وہ شاک کا مارا صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''اماں تو ٹھیک ہیں تمہاری؟ سنا ہے طبیعت آئے دن بگڑی رہتی ہے۔''

''جی ٹھیک سنا ہے آپ نے، طبیعت خراب ہی رہتی ہے۔''

ماموں جان اپنی آنکھوں پر چشمہ چڑھائے ہوئے تھے جسے اتار کر انہوں نے رومال سے صاف کیا تھا چشمے کے بعد ایک عدد سگریٹ سلگا کر انہوں نے ہونٹوں میں دبا لیا، وہ نظریں ادھر اُدھر ہی بھٹکا رہا تھا۔

''اچھا جاؤ یونیورسٹی سے لیٹ ہو رہے ہو گے تم۔'' وہ تو آگے ہی موقعہ چاہ رہا تھا، جلدی سے اٹھ کر وہ باہر آ گیا۔

ماموں کا یوں بے مقصد کمرے میں بلانا، دو چار باتیں کر کے جانے کو کہنا اسے سمجھ نہ آیا۔

وہ یہی باتیں سوچتا واپس کمرے میں چلا آیا ذہن جانے کن کن باتوں کی طرف بھٹک رہا تھا لیکن پھر ساری سوچوں کو جھٹکتا وہ اپنی سوچ سلطنت کی طرف لے گیا، آج وہ یونیورسٹی آئے گی۔

دل اندر ہی اندر سوچ کر جیسے بچوں کی طرح خوش ہو گیا، محبت بھی کیا بلا ہوتی ہے سارے وہم دل سے بھلاتی انسان کو اپنے تعاقب میں بھٹکائے رکھتی ہے۔

☆☆☆

یاسمین سے نوٹس لینے کے بعد وہ لائبریری سے باہر نکل آیا، تیز دھوپ آنکھوں میں چبھ رہی تھی دور دور تک سبز گھاس پر دھوپ کی سنہری کرنیں بے خطر اپنی سنہری زلفیں پھیلائے ہوئے تھیں اور اس کی نظریں اس سیاہ زلفوں والی پری کو ڈھونڈ رہی تھیں جو ٹھنڈے امرت کا پیالہ ہاتھ میں پکڑے اس کی پیاس بجھانے کو انتظار میں کھڑی تھی۔

وہ اس کی سیاہ زلفوں میں ساری گرمی بھلا دینا چاہتا تھا اس امرت کو ہونٹوں سے لگانا چاہتا تھا۔

دو پیار کرنے والے اک دوسرے کو تلاش کر رہے تھے، یہ لمحے بھی کتنے جاں گسل ہوتے ہیں محبوب کی جب تک جھلک نظر نہ آئے ہر اٹھنے والا قدم پتھروں سے زیادہ بھاری ہو جاتا ہے، بے قرار نگاہیں ہر سمت یوں اٹھتی ہیں جیسے وہ نظر نہ آیا تو اپنی بینائی کھو دیں گی، وہ اسے خود سے تھوڑی دور برآمدے میں کھڑی نظر آئی۔

وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھی اس لئے اک نظر وہ گھڑی کو دیکھتی اور پھر دوسری دفعہ سامنے والے راستے کی طرف۔

وہ دور سے اس قیامت کا نظارہ کر رہا تھا، جس کی سمندر سے بھی گہری سیاہ آنکھوں میں وہ مست سا خود کو بے سہارا چھوڑ دینا چاہتا تھا یہ ایسا سمندر تھا جس میں ڈوبنے کا بھی اپنا ہی مزہ ہے، وہ بھی اسے دیکھ چکی تھی اس لئے قریب چلی آئی، ہلکے فیروزی رنگ کی شلوار قمیض میں وہ کھلی کھلی بے حد حسین لگ رہی تھی، وہ بے خود سا اسے دیکھ رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔''

''بولو ناں عباس۔'' وہ اس کی خاموشی پر مچل گئی۔

''کچھ نہیں، بس ایسے خاموش رہ کر اپنی قسمت پر رشک کر رہا ہوں، سوچ رہا ہوں خدا کے حضور سجدہ شکر بجا لاؤں۔'' اس کے لہجے سے ٹپکتی محبت، سلطنت کے گال حیا سے لال ہو گئے۔

''ایسا کیا؟'' وہ ادا سے اٹھلائی عباس کی زبان سے نکلے اپنے لئے یہ الفاظ اسے جیسے حیات جاوداں بخش گئے۔

''ایسا کیا نہیں ہے تم میں سلطنت۔'' وہ جذب کے عالم میں بولا۔

''سلطنت نہیں، وہ کہیں جو آپ ہمیں کہتے ہیں۔''

''تنو۔'' ہزاروں رنگ برنگے پھول جیسے کسی نے اس کے اوپر اچھال دیئے، گلال سا فضاؤں کو رنگین کر گیا اور پھر سب سے حسین رنگ عباس کی آنکھوں میں تھا وہ رنگ صرف اس کے لئے تھا ایسا رنگ جو اس کی زندگی کے بلیک اینڈ وائیٹ حصے کو رنگین کر گیا تھا۔

''تمہارے آگے کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا، زندگی میں ہر طرف تم ہی تم ہو۔'' عباس کا ہاتھ ہلکے سے اس کے ہاتھ کو چھوا تھا اس کا تو جیسے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا عباس سے ایسا انجانے میں ہو گیا تھا لیکن وہ جیسے بے خود سے ہو گئی۔

''کیا تھا اس لمس میں۔'' وہ بول رہا تھا مگر وہ ابھی تک اپنے ہاتھ کے اس حصے کو دیکھ رہی تھی جو اس کے چھونے سے نئی زندگی پا گیا تھا، اس کے ہاتھ سے نظریں اٹھا کر عباس کی طرف دیکھا

جو سگریٹ کو سلگا کر ہونٹوں میں دبا رہا تھا، کتنا جچتا ہے اس کے ہاتھوں میں سگریٹ۔

وقت اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ آگے کو بڑھ رہا تھا برسات پورے جوبن کے ساتھ لکھنو کے آسمان پر دندناتی پھیر رہی تھی، کالی گھٹائیں روز ہی اُمڈ اُمڈ آتیں۔

ساون کے جھولے لڑکیوں بالی لیوں کے آس کی اڑانیں اڑا رہے تھے، کوئلیں کوک رہی تھیں، پپیہا پی پی کی صدائیں لگا رہا تھا، لکھنو کے وضع دار لوگ اپنے اپنے گھر میں ساون منا رہے تھے، سکھیاں مل جل کر ساون کے پکوان پکاتی ساتھ ساتھ ساون کے گیت بھی الاپ رہی تھیں۔

پیا آ جا ساون رت آئی
تیرے بنا نہ یہ من بھائی

☆☆☆

بوا پائیں باغ کی صفائی کروانے کے بعد باورچی خانے میں آئی تھیں جہاں حسنی جلال کے ساتھ ہنسی کھیل میں لگی تھی، چائے کا وقت ہو رہا تھا، بوا کو یوں اس کا بے وقت کھیل اچھا نہ لگا اس لئے وہ اسے ڈانٹنے کے بعد چائے کے ساتھ پکوڑوں کا کہتی باہر نکل آئیں جہاں لان میں دادی حضور کے ساتھ سلطنت بھی موجود تھی۔

"ہمارے زمانے میں ساون کے دنوں یہ حویلی دیکھنے کے قابل ہوا کرتی تھی، طرح طرح کے پکوان پکتے، جہاں آرا اور شمیم آرا (سلطنت کی پھپھیاں) رنگ برنگی چنریاں پہنے سارے گھر میں پائلیں بجاتی پھرتیں۔"

دادی حضو کی نظروں کے آگے اس حویلی کے گزرے دن آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔

شروع سے لکھنو واحد ایسا شہر ہے جو ہر موسم اور ہر تہوار کا اپنے انداز سے استقبال کرتا ہے، وہ خوشی کے ایام ہو یا غمی کے۔

"شمیم آرا کی سہیلیاں جب حویلی آتیں تو سارا دن گھر میں میلے کا سا سماں رہتا۔" بوا نے بھی دادی حضور کی باتوں میں شریک ہونا ضروری سمجھا، سلطنت بڑے دھیان سے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"ہاں جہاں آرا کی سہیلیاں اس کی طرح سلجھی ہوئیں تھیں۔"

"آپ کو یاد ہے بڑی بیگم، شمیم آرا کی وہ سہیلی جو اپنے نواب کے پیچھے تو ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی تھی۔" بوا تو اپنے رو میں کہہ گئیں تھیں یہ بات مگر بڑی بیگم نے کڑے تیوروں میں اسے دیکھا تھا۔

"بچی کے سامنے کیا ذکر لے بیٹھی۔" بوا کو بھی خیال آ گیا تھا کہ وہ اس گھر کی راز دار میں غلط جگہ پر بات کہہ بیٹھی ہیں۔

"معافی چاہتی ہوں۔" دادی جان سلطنت کے سہارے اٹھتے ہوئے آرام کی غرض سے اندر چلی گئیں، حسنی ان کے ساتھ کمرے تک گئی تھی، سلطنت کو تو اشتیاق نے آن گھیرا تھا۔

"بولیے نہ بوا کیا ہوا تھا؟" وہ پچھلے پندرہ منٹ سے بوا کا منہ کھلوانا چاہ رہی تھی، لیکن وہ بڑی بیگم کے خوف سے منہ بند کیے ہوئے تھی، لیکن پھر سلطنت جسے وہ بیٹی کی طرح چاہتی تھیں اس کا یوں بار بار اصرار کرنا ان سے دیکھا نہ گیا۔

"بیٹا تم جانتی تو ہو کہ اپنے چھوٹے نواب شروع سے بڑے رنگین مزاج رہے ہیں عورت کو تو انہوں نے ہمیشہ اپنے در کی باندی سمجھا ہے جب جی چاہا کمرے تک لے آئے، لیکن اس چکر میں سارا قصور ان کا بھی نہیں تھا، شمیم آرا کی وہ سہیلی، اتنی تیکھی اور کراری لڑکی میں نے آج تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھی، جسم میں تو مانوں

سپرنگ لگے ہوئے تھے، اچھلتی کودتی رہتی تھی، طبیعت میں ٹھہراؤ نام کو نہیں تھا۔"

اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ اپنے نواب صاحب کس مزاج کے آدمی ہیں اور تھے بھی حسین اوپر سے نوابی کی مہر۔

ساون اپنے پورے جوبن پر تھا، آئے دن بارش لکھنو کے سینے کو جل تھل کر جاتی، من جیسے مور کی طرح ناچتا اور پائلیں بجاتا، ساون کی خوشی ہی الگ ہوتی تھی۔

برسوں سے چلی ریت کے مطابق جہاں آرا اور شمیم آرا کی سہیلیاں حویلی میں اکٹھی تھیں، سب نے مل کر طے کیا اور چھوٹے نواب کو لے کر ریسٹ ہاؤس چلے گئے جہاں سے تھوڑے فاصلے پر ان کے خاندانی آموں کے باغ تھے۔

"بوا آپ بھی ساتھ تھیں۔" سلطنت پہلی دفعہ گویا ہوئی۔

"ہم تو دونوں بیٹیا کے ساتھ ساتھ ہی رہتے تھے، آپ کے دادا حضور بہت سخت تھے اس معاملے میں۔"

"ہمارا ریسٹ ہاؤس پہنچتے ہی بارش بھی دھواں دھار آ گئی، ان لڑکیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ یہ بارش میں ہی باغ میں چلی گئی، سوائے جہاں آرا کے وہ نہ گئی، بڑے نواب صاحب سے بہت ڈرتی تھی، سارا دن لڑکیاں بارش میں ہی مستی کرتی رہیں۔"

"آپ نے انہیں روکا نہیں بوا۔"

"اے لو بٹیا، ہماری کیا اوقات اور وہاں ہماری سنتا کون، سب اپنے اپنے گھروں سے اجازت لے کر آئیں تھیں، ہم کیسے روکتے ان کو، ہاں ہم نے بس شمیم آرا کو منع کیا تھا مگر وہ بھی اپنی مرضی کی مالک تھیں کم ہی سنتی تھیں کسی کی، اس لئے تو......" بوا کچھ بولتے بولتے رک گئیں، سلطنت کو جیسے شک سا گزرا۔

"اس لئے تو...... کیا مطلب ہے؟"

"کچھ نہیں بٹیا۔"

"نہیں کچھ تو ہے آپ ہم سے چھپا رہی ہیں۔"

"بڑی بیگم کو پتہ چل گیا ناں تو ہماری گردن اتروا دیں گی۔"

"کچھ نہیں ہو گا، شمیم پھوپھی نے کیا کیا تھا؟" اس کا تو اشتیاق ہی بڑھتا جا رہا تھا اپنے خاندان کے متعلق وہ جاننا چاہتی تھی۔

"آپ کیوں چاہتی کہ اس بڑھاپے میں ہماری چٹیا کسی کے ہاتھوں میں ہو، بڑی بیگم کو آپ نہیں جانتی۔" بوا تو ہاتھ جوڑ رہی تھیں، مگر وہ ماننے میں نہیں آ رہی تھی۔

"کدھر کی بات کدھر کو چل پڑی۔"

"وہ بھی سن لوں گی میں، آپ پہلے یہ بتائیں۔" بوا کو پتہ تھا کہ یہ کبھی بھی نہیں مانے گی اس کی رگوں میں بھی وہی نوابی خون ہے۔

"تمہاری شمیم پھوپھی نے اپنی مرضی سے اپنے جاننے والے کسی لڑکے سے نکاح کر لیا تھا۔" سلطنت کو جیسے کرنٹ سا لگا، اس پھوپھی کو اس نے بس ایک دو دفعہ دیکھا تھا۔

"شاید بوا اس لئے ان سے کوئی نہیں ملتا۔"

"تمہارے ابا حضور کے علاوہ سب ملتے ہیں، چھپتے چھپاتے۔" بوا نے اک اور انکشاف کیا۔

"لیکن دادی حضور تو اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔" سلطنت بالکل بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

"زمانے کو دیکھنے کے لئے سختی کا خول چڑھایا ہے ورنہ اپنے بچوں میں وہ لڑکیوں کے زیادہ قریب تھیں، تمہارے ابا حضور سے تو وہ ایک

دفعہ باقاعدہ جھگڑ پڑی تھی، کام تو تمہارے ابا سے بھی ٹھیک نہیں ہوا تھا ناں اس لئے وہ کسی کو کیا نصیحت کر سکتے تھے، تمہاری اماں کے ساتھ انہوں نے بھی تو اپنی مرضی سے پوچھے بغیر نکاح کر لیا تھا۔" بوا نے آج ہی حویلی کے سارے رازوں سے پردہ اٹھا دیا تھا، یا ان رازوں سے پردہ کشائی کی ایک کڑی سی بنتی رہی تھی۔۔

سلطنت تو سن کر سکتے میں آ گئی، مجھے علم ہی نہیں اس بات کا، ہاں یہ پتہ تھا کہ امی حضور اور ابا حضور کی پسند کی شادی تھی لیکن گھر والوں کی رضا مندی کے بغیر نکاح اسے جھرجھری سی آ گئی۔

"ایک دن آپ نے اپنی اماں حضور کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی۔" بوا نے تھوڑا عرصہ پہلے کی بات اسے یاد کرانا چاہی، سلطنت کو بھی یاد آ گیا۔

"آپ کی اماں حضور شادی کے بعد صرف ایک دفعہ اپنے میکے گئی تھیں، میں بھی ان کے ساتھ تھی، لیکن آپ کے نانا نواب سلطان جہاں کو جب پتہ چلا، انگارے برساتی آنکھوں کے ساتھ آپ کی اماں کا ہاتھ تو پکڑ کر انہوں نے حویلی سے باہر نکال دیا اکلوتی بیٹی تھیں وہ ان کی یہ بھی نہ سوچا انہوں نے اور تاحیات کے لئے اس پرانی حویلی کے دروازے بند کر دیئے، یہی بات کھا گئی آپ کی اماں کو اور وہ دنوں میں بیمار ہو کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔"

بوا کی باتیں سنتے ہوئے سلطنت کی آنکھوں سے پانی متواتر بہہ رہا تھا، اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے جو بھی کیا، غلط تھا یا سہی، لیکن پھر بھی وہ اس کی ماں تھیں، بوا نے روتی ہوئی سلطنت کو محبت سے اپنے سینے لپٹا لیا۔

"ناں میری بٹیا، ماں نہ سہی آپ کے ابا تو ہیں جو آپ سے اتنی محبت کرتے ہیں۔" انہوں نے اس کی گالوں سے آنسو صاف کیے۔

"آپ کے ابا کی ایک بات ہمیں بہت پسند ہے، محبت کو انہوں نے بدنام نہیں کیا، چھوٹے نواب کی طرح جسے چاہا صرف اسے ہی چاہا اس کے مرنے کے بعد بھی۔"

"اے لو اصل بات تو درمیان میں ہی رہ گئی۔" سلطنت کو چپ کروانے کے بعد ایک طرف بیٹھ گئیں وہ۔

"ان حویلیوں میں جانے کتنی اور داستانیں چھپی ہیں جن کا ہم کو بھی علم نہیں ہے۔" سلطنت آنسو صاف کرتی بغور ان کو دیکھنے لگی۔

"اس رات ریسٹ ہاؤس میں جانے کیا ہوا ہمیں علم نہیں، ہاں اس کے پورے ایک مہینے بعد وہ لڑکی آن دھمکی اور ڈٹ کر بیٹھ گئی کہ جب تک فیصلہ نہ ہو گا وہ جانے کی نہیں۔" بوا سانس لینے کو رکی۔

"ہم تو ہکا بکا رہ گئے کہ ہوا تو ہوا کیا اور پھر جب اس نے منہ کھولا تو زمین سرک گئی سبھی کے قدموں تلے سے، وہ بولی میں نواب آصف علی کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔" بوا نے یہ بات کہتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں جیسے اس گزرے منظر کو دوبارہ من کی آنکھ سے دیکھ سکیں۔

"بڑی بیگم کے ہاتھ سے تو طوطے چھوٹ گئے یہ دھان پان سی لڑکی جس کے ساتھ ہم اپنی بچی سمجھ کر اتنی محبت کرتے تھے، کیسے الزام لگا رہی ہے، ہماری حویلی کی عزت کی اسے ذرا بھی پروا نہیں، لیکن وہ خاموش رہی کہ بیٹے کی کرتوتوں سے بھی اچھی طرح واقف تھیں۔" سلطنت کو جیسے شاک سا لگا، چچا کے بارے میں وہ جانتی تھی مگر اس قدر نہیں وہ سر کو افسوس میں جھٹک کر رہ گئی۔

"چھوٹے نواب تو یہ بات سنتے ہی جانے کہاں فرار ہو گئے، آپ کے ابا حضور نے پیسے دے کر معاملہ رفع دفع کرایا اور وہ لڑکی بھی ایسی ہی تھی جب گرم ہوئی تو چپ کر گئی۔"

"حقیقت میں اس حویلی میں کوئی آدمی تو تھا تو وہ آپ کے دادا حضور تھے، نمازی، پرہیز گار، میں نے انہیں کبھی اونچا بولتے نہیں سنا، لیکن پھر بھی پوری حویلی پر رعب تھا ان کا۔" بوا بڑی عقیدت سے بول رہی تھیں، سلطنت نے انہیں نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ بہت چھوٹی تھی جب وہ اس دار فانی کو خیر باد کہہ گئے تھے، لیکن بوا کے بتانے پر وہ سوچنے پر مجبور ہو رہی تھی کہ اچھائی مر کر بھی انسان کے رتبے میں اضافہ کرتی رہتی ہے اور برائی زندہ انسانوں کو گندگی کے ڈھیر میں بدل دیتی ہے۔

"بٹیا یہ باتیں جو ہم نے آپ کو بتائیں ہیں بڑی بیگم کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ آپ کچھ جانتی ہیں۔" وہ اٹھی تو بوا بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔" وہ ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر یقین دلاتی اندر بڑھ گئی۔

☆☆☆

زینو کا خط ہاتھ میں لئے وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چھت پر چلا آیا، جاتی سہ پہر کے لمبے سائے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے، سورج آدھی سے زیادہ گرمی زمین والوں پر برسا چکا تھا، اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور وہ اپنی بچی کھچی گرمی بھی زمین کے سینے پر انڈیلتا آگے بڑھ رہا تھا جہاں خاموشیوں کی سیاہ چمکتی چادر اوڑھے رات کھڑی تھی جو جانے کیسے کیسے غم اپنے اندر سمیٹے ہوتی ہے پھر بھی وہ سب بھولے اپنی طرف آنے والوں کو سکون سے بھرپور نیند دیتی ہے، ان کے غم اپنے غموں میں انڈیل لیتی ہے، نوابن نل سے بالٹیاں بھر بھر کر گرم چھت کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی تھی، عباس کو دیکھ کر ہاتھ روک دیئے۔

"موئی اتنی گرمی ہے تو اکبری کہنے لگی کہ چھت دھو ڈالیے اور ٹھنڈی چھت پر عباس کے لئے پلنگ بچھوا دیں، کمرہ تو گرمی سے تپ رہا ہے۔" وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا خط ہاتھ میں لئے کمرے میں چلا آیا، جو گرمی سے بری طرح تپش چھوڑ رہا تھا، نوابن نے کمرے کی کھڑکیاں نہیں کھولی تھیں اس نے خط میز پر کتابوں کے ساتھ رکھ دیا اور پھر بند کھڑکیاں کھولنے لگا، کمرے کی طرح اس کا ذہن بھی کسی تپش کے زیر اثر تھا۔

اکبری کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا، اس نے میز پر رکھا ٹھنڈے پانی کا گلاس اپنے اندر انڈیل لیا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔

اسے میری آمد کا وقت کیسے معلوم ہو جاتا ہے، اس نے کرب سے سوچا، کیوں کرتی ہے وہ یہ سب، "تو کیا وہ" ذہن کچھ سوچ کر کانپ اٹھا تھا، وہ ٹھنڈے پانی کا گلاس مانوں آگ بن کر اس کے اندر اترتا محسوس ہوا، اسے واپس میز پر رکھے وہ کھڑکی کے قریب چلا آیا جس کی لوہے کی سلاخیں گرمی کی شدت سے تپ رہی تھیں اس کی نظروں کے سامنے منظر کوئی اور تھا لیکن ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا، جہاں سلطنت ٹھنڈے پانی کا چشمہ بنی اس کی منتظر کھڑی تھی، وہ محبت کے جس جھولے میں جھول رہا تھا، وہاں دو پیار کرنے والوں کے سوائے کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

وہ خواب میں بھی اکبری کے بارے میں سوچ نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کے دل نے صرف سلطنت کے لئے دھڑکنا سیکھا تھا۔

"اے میاں، اتنی گرمی میں اندر کیا کر رہے ہو، باہر آ جاؤ، پلنگ بچھ گیا ہے۔" نوابن کی آواز پر چونکتا وہ کھڑکی سے پرے ہٹ گیا۔

زینو نے خط میں اماں کی بیماری کا ذکر کیا تھا پچھلے دس دنوں سے ان کا بخار نہیں اتر رہا تھا، ابا کی طبیعت بھی نرم گرم ہی رہتی تھی اور سالار کے گھر والے بھی شادی پر زور دے رہے ہیں اور اماں نے ناہید بجیا کو خط لکھنے کو کہا تھا۔

ناہید بجیا کے ذکر پر اسے یاد آیا تھا فیض آباد جانا تھا، پلنگ پر لیٹے لیٹے اس نے کروٹ لی، بجیا تو بہت ناراض ہوں گی۔

بجیا سے اسے دلی محبت تھی، بڑے بھیا سے وہ چھوٹی تھیں مگر شادی ان کی پہلے ہو گئی تھی رشتہ اچھا مل گیا تھا، بھائی صاحب (حیدر) ابا کے دور کے رشتے دار تھے، سکول میں پڑھاتے تھے، بجیا نے ان دنوں نیا نیا میٹرک کیا تھا ابا نے کچھ نہ سوچا اور اللہ کا نام لے کر ان کی شادی کر دی، بجیا بالکل اماں کی طرح تھیں شفیق، مہربان، جب بھی اس کا دل اماں کے لئے اداس ہوتا وہ بجیا سے مل لیتا، بجیا سے ملے بغیر اسے چین ہی نہیں آتا تھا اور اب پورا مہینہ ہو چلا تھا، وقت کا حساب ہی زمین سے نکل گیا تھا، اس خوبصورت احساس کی ملکہ نے سارے حساب ہی الٹ پلٹ کر دیئے تھے، اس کے ہونٹوں پر خوبصورت سی مسکراہٹ مچل گئی۔

کتنا دل نواز احساس ہے یہ، اس نے محبت سے سوچا اور آنکھیں موند لیں، اتنی گرمی کے باوجود اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی ٹھنڈے پانی کے چشمے کے نزدیک آ بیٹھا ہے، ٹھنڈے پانی کی بوندیں اس کے تپتے بدن پر گرتی اسے سکوں بخش رہی تھیں، سلطنت اک خوشی نما احساس بنی اس پر اپنی چاہت کا سایہ کیے ہوئے تھی، کیا تھا یہ سب، وہ کیوں اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ قدم قدم پر اسے وہی نظر آتی تھی شام کو تیار ہو کر وہ ایسے ہی ٹہلنے کے لئے باہر نکل آیا، حسین آباد کا شمار لکھنو کے قدیم علاقے میں ہوتا تھا، ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہوا میں وہ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں خود میں محو سا تھا، گھر میں اس کا دم گھٹ رہا تھا اکبری کو دیکھ کر وہ اندر سے کڑھ سا گیا تھا۔

دس پندرہ دن بعد اس زینو کا ایک اور خط ملا جس میں ایک خط بڑے ماموں کے نام بھی تھا، خط پڑھ کر ماموں بہت مسرور سے نظر آ رہے تھے اسے یہ بات بہت کھٹکی تھی اس لئے اس نے زینو کو خط لکھا اور وجہ پوچھی تو جواب وہی ملا جس کا اسے شک تھا۔

اماں اور بڑے ماموں اس بات کو بہت آگے تک لے گئے تھے، زینو نے بتایا تھا کہ اس میں اکبری کی رضامندی بھی شامل ہے اور اماں کو اپنے بھائی سے بڑھ کر کون تھا۔

خط پڑھ کر ہی اس کے اوسان خطا ہونے لگے، یہ اماں کیا کر بیٹھی ہیں، اب کیا کروں میں اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔

☆☆☆

بھادوں کا گرم اور حبس بھرا شروع ہو چکا تھا، گرمی کے زور میں کہیں سے بھی کمی نہیں ہو رہی تھی، بارش کو بھی اپنی شکل دکھائی کافی دن بیت گئے تھے۔

ملک میں ہر طرف سیاسی گہما گہمی عروج پر تھی، دو اگست کو وائسرائے ہند نے آنے والے موسم سرما میں مرکزی اسمبلی کے لئے عام انتخاب کا اعلان کر دیا تھا، تمام سیاسی جماعتیں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں، مسلم لیگ اپنی پوری ایمان داری اور لگن کے ساتھ اپنی مہم میں مصروف تھی، قائداعظم کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ مسلمانوں کے لئے کسی فرمان سے کم نہ تھا، مسلمان اور ہندو، دو پارٹیوں کی صورت ایک دوسرے کے سامنے تھیں، کس کی بازی کدھر پلٹتی ہے یہ فیصلہ وقت نے کرنا تھا۔

آج کافی دنوں کے بعد وہ یونیورسٹی آیا تھا، سلطنت کی آنکھیں تو راہ دیکھ دیکھ کر تھک چلی تھیں، دادی حضور کافی دنوں سے علیل تھیں وہ ان کی وجہ سے بھی پریشان تھی اور اوپر سے عباس کی غیر حاضری۔

"ہم سے کیا کوئی خطا ہو گئی جو آپ شکل دکھانے سے بھی گئے۔" وہ ملتے ہی گلہ کر بیٹھی، کیا کرتی دل تھا کہ اس کی جدائی میں پاگل ہو رہا تھا جس کی صورت وہ ہر وقت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی تھی وہ اتنے دن نظروں سے اوجھل رہا۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ کیوں اتنے دن غیر حاضر رہا، پتہ نہیں کیوں وہ اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا، زینو کے خط نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا۔

"کچھ تو بولیے عباس۔" اس کی التجائی انداز پر وہ صرف ہولے سے مسکرا دیا۔

"ہم تو سمجھے تھے کہ آپ ناراض ہو گئے ہم سے۔"

"کون کم بخت ہے جو اپنی زندگی سے ناراض ہو سکتا ہے، بولو، ایسا کبھی ہوا ہے اور نہ ہو گا۔" اس کے اتنے خوبصورت انداز پر سلطنت کے اندر منوں سکون اتر گیا۔

"آپ سے ہم نے محبت کی ہے تنو، کوئی ایسی ویسی محبت نہیں، ہمارے لئے ہمیشہ آپ مقدم ہوں گی، یہ ہمارا وعدہ ہے۔" وہ اپنے اندر کا کوئی بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہا تھا وہ باتیں جو پچھلے دنوں سے اسے پاگل کیے دے رہی تھیں اس کے اندر جانے کیسے کیسے وہم سر اٹھا رہے تھے مگر وہ انہیں اپنی جرأت سے پسپا کر رہا تھا اور اس میں وہ کامیاب ہو گیا تھا۔

"خیریت تو ہے، آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں، مجھے کوئی شک نہیں ہے آپ کی محبت پر، میں کافر نہیں ہوں جو عباس کی وفا پر شک کروں گی۔"

"میں جانتا ہوں سلطنت کہ ہم سے کتنی محبت کرتی ہو، وہ خاموشی سے اس کا چہرہ تک یاد تھا جہاں اس کی محبت نے چاہتوں کے گلاب کھلا رکھے تھے، دیئے سے تھے جو اس کی آنکھوں میں روشن تھے، یہ عباس کی محبت کی وجہ سے تھے اور اب اگر اس پتہ چلے تو......" اس چہرے پر اک زرد رنگ آ کر گزر گیا۔

"آپ ہمیں پریشان لگ رہے ہیں، کیا اب آپ ہم سے بھی کچھ چھپائیں گے۔" اس کے اتنے پیار سے پوچھنے پر ایک بار تو اس کا دل چاہا کہ وہ سارا کچھ کھول کر اس کے آگے رکھ دے لیکن وہ ایسا نہیں چاہتا تھا کہ سلطنت اس تکلیف میں مبتلا ہو جس میں وہ ہے۔

"آپ ہماری جان ہیں سلطنت ہاں کوئی مصلحت نہ ہو ورنہ دل کا ہر کونہ آپ کے سامنے ہے، کبھی کچھ نہیں چھپایا۔" وہ پورے ایمان سے بولا تھا۔

"تو اس بات میں کوئی مصلحت ہے اس لئے نہیں بتا رہے، چلیں ٹھیک ہے ہم اب نہیں پوچھیں گے اور ہم ناراض بھی نہیں ہیں۔"

"شکریہ، مجھے آپ سے یہی امید تھی۔"

یونیورسٹی کی نرم نرم ہری گھاس پر بیٹھے وہ اک دوسرے کو مان اور محبت دے رہے تھے، طالب علموں کو ٹولیاں جا بجا ہری گھاس پر موتیوں کی طرح بکھری ہوئی تھیں، سیاسی گہما گہمی اور جوش ہر طالب علم کو پر عزم بنائے ہوئے تھا آنے والے الیکشنوں کو لے کر ہر کوئی جذباتی ہو رہا تھا۔

یہ وہ دور تھا جب ہندو کیا مسلمان کیا سب اپنے ملک کو اغیار کے ہاتھوں اور کھلونا نہیں دیکھ

سکتے تھے، وہ اپنے قائدین کی قیادت میں ہر وہ کام کرنے کو تیار تھے جس میں سو سو مشکلیں تھیں، اپنا دیس بہت بڑی نعمت ہوتی ہے اور اگر وہ پابند سلاسل ہو تو پھر اس کی تکلیف کو کوئی بھی عقل رکھنے والا انسان برداشت نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

جانے آج کس احساس کے تحت وہ اپنے پیانو پر آ بیٹھی تھی جس کی شکل دیکھے اسے کافی عرصہ ہو چکا تھا، کسی زمانے میں یہ پیانو، اس کی اولین خوشی ہوا کرتا تھا دن کا آدھے سے زیادہ حصہ وہ اس کے ساتھ گزارہ کرتی تھی، لیکن وقت کا بدلاؤ بہت سی چیزوں میں تبدیلی لے آتا ہے، وہ چیزیں جن کے بغیر انسان ایک پل نہیں رہتا ان کی جگہ دوسری چیزیں لے لیتی ہے انسان کی فطرت تبدیلی چاہتی ہے، تغیر و تبدل اس کی فطرت میں شامل ہے، لیکن محبت ایک ایسا فطری جذبہ ہے جسے انسان چیزوں سے کمپیئر نہیں کر سکتا، انسان چیزوں کے معاملے میں فطرت کے ہاتھوں مجبور تبدیلی کر سکتا ہے یا ہو جاتی ہے، مگر محبت اگر ایک بار دل میں جنم لے لے تو پھر قیامت بھی اسے بدل نہیں سکتی، کوئی کسی کے دل سے محبت ختم کرنے کی لاکھ کوشش کرنے لیکن یہ جذبہ معدوم ہونے کے لئے دل میں جنم نہیں لیتا یہ تو ایک ایسا پودہ ہوتی ہے جو محبوب کی نظروں سے ٹپکنی والی چاہت سے پروان چڑھتے پردے ہولے ہولے ہوا سے ہل رہے تھے، کھڑکی سے پرے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا صاف ستھرے آسمان پر پرندے اڑتے بہت بھلے لگ رہے تھے، اپنے آپ میں مگن وہ بھی آسمان کا دیکھتی اور کبھی پیانو کو۔

بوا اس کو چائے دینے کے لئے کمرے میں آئیں تو ایسے یوں اپنے خیالوں میں منہمک پا کر چائے پیانو سے تھوڑی دور رکھی میز پر رکھ دی اور خاموشی بغیر آواز پیدا کیے اسے دیکھنے لگیں وہ بھی اتنی محو تھی اپنے خیالوں میں کہ اسے بوا کے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔

بھادوں کا صاف آسمان جن پر عباس کی یاد کے خیالی بادل چھائے تھے وہ اسے اپنے آپ میں جکڑے ہوئے تھے اسے اردگرد کی خبر ہی نہ تھی۔

بوا چھوٹے چھوٹے بغیر آواز کے قدم اٹھائیں اس کے قریب چلی آئیں اور اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھ دیا اس نے چونک کر بوا کو دیکھا۔

''آپ ہیں، ہم تو گھبرا گئے۔'' وہ بوا کو اک نظر دیکھ کر پھر پیانو پر جھک گئی تو بوا کو جانے کیا سوجھی کہ ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو نیچے گرنے لگے، سلطنت نے پھر سے اوپر اٹھایا۔

''کیا ہوا بوا آپ رو کیوں رہی ہیں؟'' وہ پیانو چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور گھبرا کر انہیں گلے لگا لیا، بوا کو روتے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا وہ تو اچانک ان کے یوں رونے پر حواس باختہ ہو گئی۔

''بولیں تو کیا ہوا۔'' بوا نے اپنے آنسو دوپٹے سے صاف کیے۔

''کچھ نہیں بیٹا بس ایسے ہی۔'' انہوں نے پیچھے مڑ کر میز سے چائے کا کپ اٹھایا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

''چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

''آپ کچھ چھپا رہی ہیں ہم سے بوا۔'' اس نے چائے پکڑ لی۔

''آپ بتائیں ہمیں۔'' وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر مسہری تک لے آئی۔

''بس آپ کو دیکھ کر رونا آ گیا ہم کو۔''

''وہ کیوں بھلا۔'' حیرت کے ساتھ ساتھ

اس کے ہونٹوں پر ہنسی بھی آ گئی، انہوں نے دوبارہ بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تو آنکھوں میں ایک بار پھر نمی سی اتر آئی۔

''ہماری ننھی سی گڑیا اب گھر سدھار جائے گی۔'' بوا کی بات سن کر وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی چائے کی پیالی چھوٹ کر فرش پر گرتی دو ٹکڑے ہو گئی۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ۔'' رنگت اس کی یکدم زرد ہو گئی دل جیسے گہرائیوں میں ڈوبنے لگا، کوئی زخمی پنچھی کھلے آسمان تلے تنہا بے آسرا ہو گیا۔

''آپ کی نسبت طے ہو گئی ہے، زمین جیسے پیروں تلے سے سرک گئی اپنا آپ اسے ڈولتا ہوا محسوس ہوا اس نے گرنے کے انداز میں مسہری کا سہارا لیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے مجھ سے پوچھے بغیر۔'' بڑے نواب صاحب کے وہ دوست جو اس دن گھر آئے تھے، وہ لندن والے انہوں نے ہماری بٹیا کا ہاتھ مانگا ہے۔

''بوا بڑی خوشی خوشی اسے اتنے اچھے رشتے کے متعلق بتا رہی تھیں، لڑکا ڈاکٹری پڑھ رہا ہے لندن میں رہتا ہے، اپنا ذاتی بنگلہ ہے اس کا لکھنو میں۔'' عباس کا خیال کسی بجلی کی طرح کوندا تھا ذہن، وہ باحیا آنکھیں اس کے آس پاس ہی منڈلانے لگیں، اشکوں کا ایک سیل رواں تھا جو آنکھوں سے باہر نکل آیا تھا۔

''لے رونے والی کیا بات ہے عورت کی قسمت میں یہ سب لکھا ہوتا ہے؟'' بوا جیسے اسے حوصلہ دینے لگیں مگر اندر سے ان کا اپنا برا حال تھا۔

''مجھ سے کسی نے پوچھا بھی نہیں اور میرا رشتہ طے کر دیا۔'' اس نے روتے روتے بوا کی طرف ایسے دیکھا جیسے سارا قصور انہی کا ہو۔

''بٹیا آپ کو اپنی خاندانی اقدار کا پتہ ہے پھر بھی ایسی باتیں سوچ رہی ہیں، کہاں رشتہ کرنا ہے اور کہاں نہیں یہ فیصلہ ماں باپ نے کرنا ہوتا ہے۔'' وہ اسے سمجھانے لگیں۔

''میں نہیں مانتی ان باتوں کو گزر گیا وہ وقت جب ایسا ہوتا تھا میں ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں، میری رائے کو بھی اہمیت ملنی چاہیے۔'' وہ اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے مسہری پر بیٹھ گئی تو اس کی بات سن کر بوا کے دل میں ٹھک سے کوئی چیز جا لگی۔

''رائے کو اہمیت؟ کیا مطلب ہے اس بات کا۔'' وہ سوچنے لگیں مگر پھر انہوں نے خود ہی اس خیال کو جھٹک دیا۔

''ہمیں نہیں منظور یہ رشتہ۔'' بوا نے جلدی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

''خاموش، دیواروں کے بھی کان ہیں، نواب صاحب تک بات چلی گئی تو قیامت آ جائے گی۔'' بوا کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ان کے سامنے اک دوسری شمیم آرا کھڑی تھی، خوف سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، سلطنت کا یہ نڈر اور بے خوف انداز جیسے بہت کچھ باور کروا گیا ان پر، یہ چڑیا سا دل رکھنے والی لڑکی آج شیر کی طرح کیسے دھاڑنے لگی ہے، کچھ تو ہے۔

وہ روتے ہوئے مسہری میں لیٹ گئی تو بوا خاموشی سے اٹھ کہ کمرے میں چلی آئیں۔

رات کو کھانے کی میز پر خلاف معمول نواب صاحب تشریف لا چکے تھے، سلطنت کو نہ پا کر انہوں نے بوا کو اندر بھیجا انہیں بلانے کے لئے۔

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' وہ ابھی بھی مسہری پر لیٹی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے ہمیں نہیں بتائیں گی آپ؟" بوا پیار سے ان کا سر سہلانے لگیں تو سلطنت جس کے لئے بوا سے زیادہ ہمدرد انسان اس دنیا میں کوئی نہیں تھا ان سے لپٹ کر رونے لگی، وہ تو آگے ہی چاہ رہی تھی کہ کوئی تو ہو جس سے اپنے دل کی بات کہہ سکے۔

"ہم عباس کو اپنا سب کچھ مان چکے ہیں۔" وہی ہوا جس کا بوا کو ڈر تھا۔

"یہ عباس کون ہیں؟" بوا کے پوچھنے پر اس کی پانی سے بھری آنکھیں شرم سے نیچے کو جھک گئیں۔

"ہمارے ساتھ پڑھتے ہیں۔" پھر اس نے عباس کے بارے میں سب کچھ بتایا۔

"جو بھی ہے وہ لڑکا، مگر آپ کو اپنے ابا حضور کا پتہ ہے، وہ کبھی بھی ایسا نہیں چاہیں گے، وہ اپنے دوست کو زبان دے چکے ہیں۔"

"وہ زبان دیے چکے ہیں اور میں دل دے چکی ہوں۔" سلطنت کو عباس کی محبت نے بے خوف کر دیا تھا، بوا تو اس کی باتوں سے بار بار کانپ رہی تھیں، یہ لڑکی جانے کیا کرے۔

"زبان کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن دل واپس نہیں ہوتے۔" وہ نڈھال سی مسہری سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی بوا کو بتا کر جیسے اس کے دل کا بوجھ کچھ کم ہوا تھا۔

بوا کو باتوں باتوں میں یاد نہ رہا کو وہ تو نواب صاحب کے کہنے پر اسے کھانے پر بلانے اندر آئی ہے۔

"باہر نواب صاحب کھانے پہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں یہ بات بعد میں کرتے ہیں اور اس وقت آپ کو چلنا پڑے گا باہر۔" بوا کے تنبیہی انداز پہ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

"آپ اپنے ابا حضور کو اچھی طرح جانتی ہیں۔" بوا ایک دفعہ پھر اسے سمجھانے کے لئے کمرے میں موجود تھیں لیکن اس کا بھی ایک ہی جواب تھا۔

"ہم ان سے بے انتہا محبت کرتے ہیں، کیسے روکیں خود کو، بولیں بوا کبھی دریا بھی آگے بڑھنے سے رکا ہے۔"

"ایک بات کہیں آپ سے ہم، دریا اور انسان میں بہت فرق ہوتا ہے، انسان کو خدا نے بہت سے اوصاف سے نوازا ہے، دل کو سمجھانا تو بہت معمولی بات ہے۔" بوا کی کوشش تھی کہ ابھی وقت ہے وہ سنبھل جائے۔

"نہیں بوا ہم نہیں مانتے اس بات کو، ہمارے لئے ہماری محبت معمولی بات نہیں ہے۔" وہ اپنے محاذ پر ڈٹی ہوئی تھی بوا کو لگا تھا کہ اس کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔

☆☆☆

جوں جوں الیکشن قریب آ رہا تھا سردی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا، شہر جلسے جلوسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب مسلم لیگ واضح اکثریت کے ساتھ منظر عام پر آئی تو مسلمانان ہند کے اندر بھی اک سکون اترا اور انہوں نے جیت کر یہ ثابت کر دیا کہ ہم ایک الگ قوم تھے ہیں اور رہیں گے۔

جہاں پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی وہیں عباس کی زندگی کی کشتی بھنور کی طرف روانہ ہو چلی تھی، اماں نے خود اس سے خط میں واضح طور پر بتا دیا تھا اس لئے وہ خود اماں سے بات کرتے لاہور جا رہا تھا وہ فی الحال سلطنت کو کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا وہ اپنے تئیں معاملہ ٹھیک کرنا چاہ رہا تھا۔

لیکن اماں نے اس کی ایک بھی نہیں سنی تھی اس نے لاکھ سمجھانا چاہا مگر وہ نہیں مانی تو وہ ناراض ہو کر واپس لکھنو چلا آیا۔

یہاں آ کر وہ سلطنت کے پیغام پر باغ میں چلا آیا جہاں وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی، عباس حقیقی معنوں میں بہت پریشان تھا اماں نے جس انداز میں اس سے بات کی تھی اس نے اس کا دل توڑ دیا تھا اور دل، وہ تو یہاں آ کر سلطنت کی بات سن کر مزید ڈوب گیا تھا۔

سلطنت نے نواب سعادت علی خان کے بیٹے کے رشتے کے متعلق بتایا تو وہ سر تھام کر رہ گیا، پریشانیاں جیسے ہر طرف سے سر جوڑے چلی آ رہی تھیں، وہ کافی دیر وہاں خاموشی کے ساتھ بیٹھا رہا، سوچ کے نئے نئے زاویے اس کے ذہن میں بن رہے تھے، سلطنت کسی اور کی ہو جائے وہ خواب میں بھی سوچ نہیں سکتا تھا اور کوئی اس کی زندگی میں آئے وہ یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا، ان دونوں گھروں کو کیسے روکا جا سکتا ہے۔

سلطنت عباس کو سب کچھ بتا کر جیسے شانت ہو گئی تھی اسے پتہ تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالیں گے، ہم نے جس کے ہاتھوں میں اپنی زندگی کی ڈور تھمائی ہے وہ بہت مضبوط ہے، ہمیں بے آسرا نہیں کرے گا اور اس کا سوچنا غلط نہیں تھا اس نے حل نکال ہی لیا تھا اس نے فیصلہ کیا تھا کہ دونوں گھر ایک ہی صورت میں شانت ہو سکتے ہیں اگر انہیں اپنی پڑھائی کی مجبوری بتا دی جائے، کہ جب تک ہم پڑھائی سے فارغ نہیں ہوتے ہمیں یہ رشتوں کی بات کر کے ڈسٹرب نہ کیا جائے۔

عباس کی یہ بات اس کے سمیت گھر والوں کو بھی پسند آ گئی تھی اس لئے دونوں گھر پڑھائی سے فارغ ہونے تک خاموش ہو گئے تھے۔

کبھی وقت چیونٹی کی رفتار سے گزرتا محسوس ہوتا ہے اور کبھی پنچھی کی طرح پر لگا کر اڑ جاتا ہے، یونہی لگتا ہے جیسے سال دنوں میں کٹا گیا ہے اور ان کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا، عباس اور سلطنت اس گزرے سال میں ایک دوسرے کے اور زیادہ نزدیک آ گئے تھے، ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیمان میں زیادہ مضبوطی آ گئی تھی، سلطنت کو اکبری سے کوئی خوف نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے عباس کو اچھی طرح جانتی تھی اس لئے اس نے کبھی مذاق میں بھی عباس کو اکبری کا طعنہ نہیں دیا تھا محبت کی پہلی شرط ہی بھروسہ ہوتی ہے، اعتماد ہوتا ہے۔

☆☆☆

مارچ 1947ء نئے وائسرائے (ماؤنٹ بیٹن) کی آمد کا مہینہ، اب سے ہندوستان ایک نئے راستے پر نکل کھڑا ہوا ہے اسے اب یقین ہو چلا ہے کہ آزادی اس کا مقدر بننے کی ماؤنٹ بیٹن جیسے انگریزی حکومت نے 1948ء تک کے لئے ہندوستان اس مقصد کے لئے بھیجا ہے تاکہ وہ ہندوستان کی حکومت کی ڈور ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھمائیں جو سہی معنوں میں ہندوستان میں بسنے والی دو بڑی قوموں کو ان کے اصلی حقوق دے سکے، لیکن سیاست ایسی چیز ہے جو بڑوں بڑوں کی عقل کے آگے روڑے اٹکا دیتی ہے تاریخ کے ان نوے سالوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انگریز قوم ہمیشہ چاپلوسی کرنے والوں کو اپنا دوست مانتی رہی ہے اور وہ لوگ جو اپنے مقصد کو زیادہ اہمیت دیتے تھے چاپلوسی کرنے کی بجائے، وہ ان کو ہمیشہ پیچھے ہی رکھتی تھی اور ماؤنٹ بیٹن وہ آدمی تھا جیسے چاپلوسی کرنے والے لوگ بہت پسند تھے، یہاں سے (مارچ 1947ء) سے ہندوستانی تاریخ ایک

نیا موڑ مڑتی ہے اور تاریخ کے ساتھ ساتھ سلطنت اور عباس کی زندگی ایک دفعہ پھر پریشانیوں کی زد میں آتی ہے، وہ بات جس سے وہ ایک سال پہلے نبرد آزما ہوئے تھے وہ پھر ان کی زندگی میں گردش کرنے لگی تھی۔

''اس ملک کی تقسیم سے پہلے پہلے ابا حضور میری قسمت کا فیصلہ کر دینا چاہتے ہیں۔'' خورشید جہاں کے گھر وہ آمنے سامنے تھے، عباس خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا، سلطنت کی اِدھر اُدھر بھٹکتی نظریں عباس کے چہرے پر جم گئیں، جہاں پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

''اس ملک کی قسمت کا فیصلہ اس ملک کی عوام کرے گی اور میری قسمت کا فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے عباس، میں کسی اور کے بارے میں سوچنا بھی دینے لئے گناہ سمجھتی ہوں۔'' اس کی کانچ کی طرح چمکتی آنکھیں پریشانی سے مدھم پڑ گئیں تھیں، عباس کو وہ بات کرتے ہوئے اپنے دل کے بہت قریب لگی تھی۔

''کیا میں ایسا سوچ سکتا ہوں تو؟''

''یہی مان تو مجھے سنبھالے ہوئے ہے۔''

اس نے محبت سے عباس کی طرف دیکھا جس پر اس کی اک چاہت بھری نظر سے اک سائبان سائن کیا تھا۔

''بھروسہ رکھو مجھ پر کچھ نہیں ہوگا، میں تمہارے ساتھ ہوں، وقت ضرور ہمارے حق میں بھی فیصلہ کرے گا۔'' عباس کے دلاسوں سے اس کے اندر اک اطمینان سا اتر گیا تھا، لیکن اسکے دلاسے دیتے ہوئے وہ اندر سے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا، کیسے کرے گا وہ یہ سب، گھر والوں کا پریشر جس طرح اس کا احاطہ کیے ہوئے تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

بجیا اس دفعہ خود فیض آباد سے لکھنو چلی آئیں تھیں۔

''تم تو اب شکل دکھانے سے بھی گئے۔''

بجیا کے گلے پر وہ شرمندہ سا ہنس دیا، اکبری بجیا کی آؤ بھگت میں لگی ہوئی تھی، عباس خاموش سا سب کچھ نوٹ کر رہا تھا۔

بڑے سے کھلے آنگن میں تخت بچھ گئے تھے اپریل شروع ہو چکا تھا ٹھنڈ کے بعد گرمی پھر موسم کا حصہ بنتی جا رہی تھی، پھر بھی بجیا کی فرمائش پر نوابن چائے کے ساتھ پکوڑے تل رہی تھیں۔

شام پڑے تک گھر میں خوب رونق رہی، چھوٹے ماموں کے بیٹوں اور بجیا کے بچوں نے خاصا اودھم مچا رکھا، شام کا کھانا کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آیا تو بجیا بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی چلی آئیں۔

''لاہور میں اماں سے جو تمہاری بات ہوئی تھی وہی پھر دہرا رہی ہوں۔'' وہ تقریباً ایک مہینہ پہلے لاہور گیا تھا جہاں اماں نے دوبارہ وہ رشتے والی بات شروع کی تھی وہ وہاں انکار کر آیا تھا بجیا کی بات سے اسے یوں لگا جیسے اماں نے اسے خط میں سب کچھ بتا دیا ہے۔

''آپ کو سب خبر ہے تو آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں۔''

''پتہ تو ہے مگر تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔'' بجیا بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں جہاں کچھ تو بدل گیا تھا جو ان کے لئے بالکل نیا اور پرایا پرایا سا تھا وہ تو وہاں اپنا وہی چھوٹا سا معصوم سا عباس دیکھنا چاہ رہی تھیں، جو اپنی بجیا کے بغیر دو قدم بھی نہیں چلتا تھا اب منہ پھیر کے کیسی بڑی بڑی باتیں کر رہا تھا۔

''میں اماں کو بڑے واضح لفظوں میں بتا کر آیا ہوں کہ میں اکبری سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''یہی تو میں بھی پوچھنا چاہ رہی ہوں، وہ کون سی سی ڈائین ہے جس نے تمہارے ذہن میں خناس بھر دیا ہے، ناگن جو ڈس رہی ہے ہمیں۔'' بجیا کے جوش پر اسے تاؤ سا آ گیا۔

''کیسی گفتگو کر رہی ہیں آپ، کون ڈائن اور کون ناگن۔''

''وہی جو تمہیں اکبری کی طرف مائل نہیں ہونے دے رہی، کسی کے کہنے پر نہیں میرا دل ذاتی طور پر اس کی طرف مائل نہیں ہے میں اس سے محبت نہیں کرتا اور یہی بات آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' وہ یہ بات گھر والوں کو سمجھا سمجھا کر پاگل ہو چکا تھا پچھلے ڈیڑھ سال میں کوئی بیسیوں بار اس نے سب کو بتایا تھا۔

''تم اپنے دل کو اس کی طرف مائل کر کے تو دیکھو۔'' بجیا اس کی بات سن کر نرم پڑ گئیں۔

''چوبیس گھنٹے تمہارے سامنے رہتی ہے وہ، مائل ہوتے کون سے دیر لگتی ہے۔'' اس نے خفگی بھری بڑی نگاہ بجیا پر ڈالی تھی کیسے مشورے دے رہی تھیں وہ۔

اس نے اپنی طرف سے صاف انکار کر کے بات ختم کر دی تھی بات کو لمبا کرنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں تھا، وہ جانتا تھا کہ اس کے گھر والے کبھی بھی نہیں مانیں گے، ان کے نزدیک ماموں نے اسے اتنی دیر اپنے پاس رکھا ہے اس کا سارا خرچا اپنے سر لیا ہے، پڑھائی لکھائی، احسان کا بدلا تو چکانا چاہیے، لیکن وہ اس بات کو نہیں مانتا تھا، یہ کیسا احسان ہے جس کا بدلا وہ اپنی خوشیاں برباد کر کے چکائے۔

بجیا کو اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر آپ کے لئے زیادہ زور دے رہے ہیں کہ ماموں نے میرے اوپر اتنا پیسہ خرچ کیا ہے تو وہ مجھ سے جو چاہے لے سکتے ہیں مگر اکبری دینے کا خیال چھوڑ دیں۔

☆☆☆

بوا نے ایک بڑی گرما گرم خبر اس کے کان میں انڈیلی تھی جسے سن کر مانو اسے الیکٹرک شاک لگ گیا تھا، وہ اچھل کر پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نواب سعادت علی اس ماہ میں اسے امام ضامن باندھنے آ رہے ہیں رشتہ پکا ہو چکا ہے۔'' وہ بڑے بے یقینی کے سے انداز میں بوا کا منہ دیکھ رہی تھی۔

''نواب رجب علی صاحب کہ منہ سے میں یہ بات سن کر آ رہی ہوں۔'' انہوں نے اسے یقین دلانا چاہا، اس کی آنکھوں سے تو ٹپ ٹپ آنسو نیچے گرنے لگے، رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا، بوا اس کے قریب چلی آئیں۔

''بٹیا یہ تو ہونا ہی تھا آپ کو بھی پتہ ہے آپ کی پڑھائی کی وجہ سے دیری ہو رہی تھی۔''

''مجھے نہیں کرنی یہ شادی، میں عباس کے بغیر کچھ بھی نہیں سوچ سکتی۔'' وہ روتے ہوئے بوا کے گلے سے جا لگی، بوا اسے اپنے سینے سے لگائے پلنگ تک لے آئیں۔

''اس کا خیال دل سے نکال دو، میری چندا، نواب صاحب کی بھنک بھی لگ گئی تو وہ قیامت آئے گی جو دیکھی نہ ہوگی۔'' بوا کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

''کیسے نکال دوں بوا، اپنا سب کچھ مان چکی ہوں میں اسے، آپ کچھ کریں بوا۔''

''نہیں بٹیا ہم تو آپ کے نوکر ہیں۔''

''آپ ابا حضور کو منع کر دیں، مجھے نہیں، بندھوانا امام ضامن، مولا میری مدد کیجئے۔'' وہ دونوں ہاتھ بلند کر کے رو دی تو بوا سے اس کا رونا دیکھا نہ گیا۔

''نہ رو میری چندا، تیرا رونا مجھ سے

برداشت نہیں ہوتا، تو تو مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز ہے، پر میں کیا کروں، یہ اس گھر کی عزت کا معاملہ ہے۔" وہ ان کی گود میں سر رکھے سسک رہی تھی، بوا کی اتنی اوقات کہاں تھی کہ وہ نوابوں کے معاملات میں مداخلت کرتیں، انہیں تو صرف گھر کے کام اور سلطنت کی نگرانی سونپی گئی تھی، وہ کیسے نواب صاحب کو اس رشتے سے انکار کا کہہ سکتی تھی، ورنہ سلطنت کے آنسوؤں پر سے وہ سب کچھ وار سکتی تھیں اس کی یہ خوشی تو چیز ہی کچھ نہیں تھی۔

سلطنت کی سسکیوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا تھا، کیسے کیسے ارمان دل میں لئے وہ عباس کی دنیا میں شامل ہوئی تھی، اسے وہ ساری خوشیاں مل گی تھیں جو اس نے کبھی خواہش کی تھیں کیونکہ عباس ہی اس کی خواہش تھا اور خوشی تھا اور اب وہ کیسے اپنی خوشی کو چھوڑ سکتی تھی۔

آنسوؤں کی مالا سے کانچ سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے بوا کے کرتے میں جذب ہو رہے تھے اور پھر سوچ کے نئے دور کھولتا ایک آنسو کا قطرہ جیسے اس کی نظروں کے سامنے فضا میں معلق ہو گیا، کانچ کے اس قطرے سے مختلف قسم کی روشنیاں نکل کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں، ذہن جیسے کسی اور ہی جانب نکل کھڑا ہوا، اس قطرے نے نکلتی روشنی میں جانے کیسے جادو تھا کہ وہ جدھر جدھر جا رہی تھی ذہن اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور پھر بھاگتے بھاگتے وہ اس کے پیچھے اک کھلے میدان میں چلا آیا جہاں اک چمکتا روشن سورج اسے اپنے بہت قریب محسوس ہوا اور وہ روشنی وہ الوہی روشنی گھومتی چکر کاٹتی اس سورج کے اندر جذب ہو گئی، اس کا ذہن اس کھلے میدان میں ہر طرف تنہا تھا، سرسبز وادی میں جہاں دور بہتے جھرنوں کا شور تھا اس کے علاوہ مکمل خاموشی تھی ایسی خاموشی جیسے حرف دو پیار کرنے والے دل ہی محسوس کر سکتے ہیں، اس کا ذہن تنہا تھا لیکن حقیقت میں وہ تنہا نہیں تھا کوئی تھا جو اس کی پشت پر کھڑا تھا اور جس کے بازوؤں کے ہالے میں وہ دھیرے دھیرے قید ہو رہا تھا ایسی قید جس کی انسان خود خواہش کرتے۔

☆☆☆

زینو کا خط ہاتھ میں لئے اس کا دل چاہا وہ اپنا سر دیوار میں دے مارے، مجھ سے زیادہ عزیز ہے انہیں اکبری، اماں کی دھمکیاں پڑھ پڑھ کر اس کا دل جیسے زچ سا ہو گیا، اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹے وہ منہ پر تکیہ رکھے ہوئے تھا، سگریٹ کی آدھی سے زیادہ ڈبیہ ختم کر چکا تھا وہ ہر طرف کمرے میں سگریٹ کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

اکبری دروازہ کھول کر اندر آ گئی کسی کی آہٹ سن کر اس نے تکیہ منہ سے پرے کیا تو اکبری پر نظر پڑی اس کا دل جل بھن گیا وہ چائے کا کپ ہاتھ میں لئے کھڑی تھی اس نے کپ میز پر رکھنے کو کہا تو ساتھ ہی ذہن میں اک خیال رینگا، کیوں نہ میں اسی سے بات کروں شاید یہ میرے دل کی حالت سمجھ جائے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، اس بات کے نتیجے میں ہونے والے سارے خدشات کو اس نے ایک طرف رکھ دیا کیونکہ اب پانی سر کے اوپر سے بہنے لگا تھا ہو سکتا ہے میں اس سے بات کروں تو یہ خود ہی اپنے گھر والوں کے سامنے اس رشتے سے انکار کر دے۔

وہ بھی چائے رکھنے کے بعد بغیر مقصد کے ہی وہاں کھڑی تھی اور عباس کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی اس نے کبھی آج تک چند رسمی باتوں کے اس سے کوئی بات نہ کی تھی اس لئے بڑی جھجک سی محسوس ہو رہی تھی مگر

اپنے پیار کی خاطر اسے یہ سب بھی کرنا تھا۔

وہ پلنگ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اکبری نجانے کیا سمجھتی لال گلال بنی ہوئی تھی اس نے گلا کھنکارا اور بڑی ہمت کر کے بولا۔

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔" یہ بات اٹک اٹک کر اس کے گلے سے نکلی تھی، اکبری کا تو دم نکلنے کو تھا انہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے، اتنے سالوں میں کبھی اس نے اسے اتنے پاس آ کر بات نہیں کی تھی، یہ کیسا معجزہ ہو گیا، اس کا دل اچھل پتھل ہو رہا تھا وہ دوبارہ اپنی بات دہرانے لگا تو وہ دروازے کی طرف جلدی سے مڑ گئی اور وہاں جا کر بولی۔

"جو بات آپ کہنا چاہتے ہیں اس بات کو سننے کی مجھ میں سکت نہیں۔" عباس پر اک مسکراتی ہوئی نظر ڈال کر وہ باہر نکل گئی تو وہ ہونق سا بنا دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر دوبارہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"یہ لڑکی اس بات کو کیا سمجھ بیٹھی ہے۔"

اس نے تو چاہا تھا کہ وہ اس کے دل کی حالت کو سمجھ لے گی لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ وہ اسے مزید پریشان کر دے گی اس لڑکی نے اس بات کو دوسرے رنگ میں ہی لے لیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی سلطنت میں کیا کروں، میرے گھر والوں کا پریشر بڑھتا ہی جا رہا ہے۔" باغ میں وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے، سلطنت بھی آنکھوں میں پانی کی نمی لئے سب کچھ بتا رہی تھی۔

"نواب سعادت علی اسی ماہ امام ضامن باندھنے آ رہے ہیں۔" سلطنت کی بات پر عباس کے سینے پر جیسے پتھر سا آن گرا، چند لمحوں کے لئے وہ بالکل خاموش ہو گیا، چلتے چلتے قدم اپنے آپ رک گئے منوں بھاری وزن ہو چلا تھا ان کا۔

"آپ رک کیوں گئے۔" سلطنت کی آواز پر اس نے مڑ کر اسے دیکھا جو اک آس اور امید لئے اس کی جانب دیکھ رہی تھی اس کا دل سینے میں مچل گیا تھا، اس کا دل چاہا وہ آگے بڑھ کر اس خوبصورت سی لڑکی کے سارے دکھ درد اپنے نام کرے۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" بات کرتے ہوئے اس کی گردن جھک گئی۔

"مجھے یہ بات کہتے ہوئے شرم تو آ رہی ہے، مگر اب اس بات کے بغیر گزارہ نہیں ہے وقت جس دوراہے پر ہمیں لے آیا ہے، وہاں اب فیصلہ بہت ضروری ہو چکا ہے۔" عباس بغور اسے دیکھتا اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگا، سلطنت نے نظریں اوپر اٹھائیں جو عباس کی نظروں سے ٹکرا کر دوبارہ جھک گئیں۔

"آپ ہمیں غلط نہیں سمجھے گا عباس، ایسا ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ ہمیں اس سے بہتر راہ نظر نہیں آ رہی۔" اور پھر وہ آنسو کا قطرہ جس نے اسے اک نئی راہ دکھائی وہ چمکتا ہوا عباس کی نظروں کے سامنے بھی لہرانے لگا۔

اچانک پڑنے والی چمک نے اس کی آنکھیں چندھیا دی تھیں وہ حیران سا کتنی دیر سلطنت کے چہرے کو دیکھتا رہا، اتنی بڑی بات اس کے ذہن میں کیسے آئی۔

"یہ کیسے ممکن ہے تنو، گھر والوں کی رضا مندی کے بغیر نکاح۔"

"تم نے سوچ بھی کیسے لیا۔" وہ ابھی تک حیران تھا۔

"اس کے بغیر ہمارا ملن ممکن نہیں ہے عباس، نہ آپ کے گھر والے مانیں گے نہ میرے

گھر والے۔" اس کی بات پر وہ بھی خاموش ہو گیا کہہ تو وہ ٹھیک رہی تھی دنیا اِدھر سے اُدھر ہو سکتی تھی مگر گھر والے کسی طور نہیں مانیں گے۔

"پھر بھی یہ راستہ غلط ہے، ہم کوشش کر رہے ہیں ایک نہ ایک دن شاید مان جائیں۔" عباس نے اپنے تئیں دونوں کو تسلی دینا چاہی ورنہ جانتا تو وہ بھی تھا اپنے گھر والوں کی ہٹ دھرمی۔

عباس کا جواب سن کر اس کا دل ٹوٹ گیا تھا کیونکہ قیامت سے پہلے قیامت آ سکتی تھی مگر اس کے ابا حضور کا فیصلہ نہیں بدل سکتا تھا اس لئے دل برداشتہ سی وہ دکھی ہو کر رونے لگی۔

"عباس یہ وقت دوبارہ واپس نہیں آئے گا۔" آنکھوں کی قندیلوں میں چمکتا نمکین پانی گھر آ کر بھی اس کے دماغ رپھوار کی طرح برستا رہا۔

"یہ وقت دوبارہ واپس نہیں آئے گا، ہاں نہیں آئے گا، کیا کروں میں۔" کمرے میں ادھر کے ادھر ٹہلتے اس کا ذہن مسلسل سوچوں کے شکنجے میں تھا جو اپنی شوریدہ لہروں کے ساتھ اسے بھی ادھر ادھر بہائے لئے جا رہا تھا، پہاڑ کی ایک چوٹی تھی جس پر وہ تنہا کھڑا تھا، کہاں جائے وہ، گھر والوں کو دیکھے یا اپنے دل کی سنے۔

اپنے دل کی نہ سنے تو پھر وہ پہاڑ کی چوٹی سے یوں گرے گا کہ اس کا نشان بھی مٹ جائے گا اور گھر والوں سے پوچھے بغیر وہ کیونکہ نکاح کر سکتا ہے، کبھی ادھر کبھی ادھر ذہن بھی فٹ بال بنا ہوا تھا، دو کشتیوں میں ایک ایک پاؤں رکھے وہ مسلسل ڈولنے کے عمل سے گزر رہا تھا۔

☆☆☆

مئی کے مہینے کا آغاز ہو چکا تھا گرمی ایک دفعہ پھر روح تک کو جھلسانے کے لئے تیار کھڑی تھی، وہ اپنے کمرے سے باہر برآمدے میں کرسی پر چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا بظاہر وہ خاموش تھا مگر ذہن مسلسل حرکت میں تھا، رات کا سیاہ آنچ آسمان کے سینے پر بچ چکا تھا ٹھنڈی ہوا ہولے ہولے سے کچھ گنگنا رہی تھیں ان سرگوشیاں وہ سن کر بھی سننا نہیں چاہ رہا تھا کیو اس کا دل اندر سے دکھی ہو چکا تھا، سلطنت پانیوں سے بھری آنکھوں نے اسے بے چین رکھا تھا کبھی دل چاہتا کہ مان لوں اس کی بات نکاح کر لوں لیکن دوسرے ہی پل گھر کا سوچ زنجیر سی پاؤں میں آن پڑتی۔

وہ اپنی سوچوں میں گم تھا جب کسی کی ا قریب موجودگی پا کر اس نے آنکھیں کھو دیں۔

اکبری کا یہ نڈر سا انداز اسے چونکا گیا تھا دیکھنا بھی نظر بچا کر اور اب تنہا اس کے قریب جانا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے غصے میں اس طرف دیکھا۔

"مجھے معلوم تو ہے کہ آپ نے مجھ سے کہنا تھا لیکن پھر بھی میں پوچھنے آئی ہوں کہ آپ نے اس دن کیا کہنا تھا۔" وہ بغیر شرمائے بڑے دھڑلے سے اس سے گویا تھی عباس تو اکی ہمت پر سر تھام کر بیٹھ گیا، اگر ماموں اوپر آ جائیں تو کیا سمجھیں وہ۔

"تمہیں یہاں اوپر نہیں آنا چاہیے تھا جاؤ نیچے۔" وہ ذرا تلخی سے بولا۔

"آپ کے ماموں اور ممانی گھر نہیں ہیں اس لئے۔" وہ لجا کر بولی تو وہ پریشان سا ادھر ادھر دیکھنے لگا کوئی اگر آ جائے تو میری عزت مٹی میں مل جائے۔

"کوئی نہیں ہے پھر بھی نیچے چلی جاؤ، میں نے کہا ناں جاؤ۔" وہ اپنی بات کا اثر نہ ہوتا دیکھ کر دھاڑا تو وہ اس کے خطرناک تیور دیکھ کر واپس مڑ گئی۔

عباس ابھی تک حیرانگی کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا اس لڑکی کا یہ انداز، اگر ماموں کو پتہ چل جائے کہ وہ یوں بے دھڑک مجھ سے ملنے لگی ہے تو وہ مجھے بھی اتنا ہی قصور وار سمجھیں گے۔

وہ تو یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ میں اس میں دلچسپی لینے لگا ہوں لیکن خدا گواہ ہے کہ میرے دل میں صرف سلطنت ہے۔

☆☆☆

"فیصلے کا یہی وقت ہے عباس، وقت گزر گیا تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔" سلطنت کی باتیں بار بار دل کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں۔

دل جو پیار کا نگر ہے جس میں محبت اگر ایک بار آباد ہو جائے تو دنیا کی کوئی بھی طاقت اسے ختم نہیں کر سکتی معدوم نہیں کر سکتی، اس نے پیار کا یہ نگر بھی سلطنت کی محبت سے آباد ہو چکا تھا وہ خود کو لاکھ سمجھا بجھا کر کسی اور طرف لگاتا مگر ہر بار ناکامی اس کا مقدر بنتی۔

"وقت گزر جائے تو بات کی قیمت نہیں رہتی، کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے، وقت گزر جائے تو پچھتاوے راتوں کی نیند چھین لیتے ہیں۔"

"بلاشبہ وقت تو یہی ہے، مگر بار بار بیمار ماں کا خیال دامن سے لپیٹ جاتا کہ اگر انہیں خبر ہو جائے تو ان کے دل پر کیا گزرے گی، لیکن اگر وقت گزر گیا تو میں سلطنت کو ہمیشہ کے لئے کھو دوں گا۔"

"نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، سلطنت میری زندگی ہے، کوئی ایسی راہ نکلے جس سے میری پریشانی دور ہو جائے، میری خوشی میں میرے گھر والوں کو شامل ہونا پڑے گا۔" اپنے آپ سے باتیں کرتا وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"لیکن سارے گھر والوں کا جھکاؤ اکبری کی طرف ہے اماں کا جان سے پیارا بھائی...... وہ کیونکر مجھے یہ قدم اٹھانے دیں گے۔" سوچوں کے پے در پے واروں نے اسے چکرا دیا تھا وہ بے آسرا ہو کر برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھ گیا سوچیں یوں آپس میں گتھم گتھا تھیں گویا اسے جکڑ لیں گی خود میں، پسینے نے ساری شرٹ گیلی کر رکھی تھی مگر وہ اپنے آپ میں مگن موسموں کی بے رخی سے بے نیاز تھا۔

وہ اٹھ کر اندر آ گیا، اسے کسی چیز کی طلب اندر سے آئی تھی شاید سگریٹ کی، پلنگ پر تکیے کے قریب رکھی سگرٹوں کی ڈبیا اٹھا کر وہ کھڑکی کے قریب آن کھڑا ہوا بے چینی سی تھی جو ایک جگہ بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔

سگریٹ سلگا کر اس نے ہونٹوں میں دبا لیا لیکن وہ طلب سگریٹ کی نہیں کوئی اور تھی، آدھ جلا سگریٹ بجھا کر اس نے راکھ دانی میں رکھ دیا وہ طلب پکار بن کر اس کے اردگرد گونج رہی تھی، وہ گیلی شرٹ کے بٹن کھول کر اسے اتارتا پلنگ پر بیٹھ گیا۔

وقت گزر جاتا ہے، اپنے پیچھے نشان چھوڑ جاتا ہے۔

"میں وہی کروں گا جو میرا دل چاہتا ہے، میں گزرے وقت کی کوئی نشانی بن کر زندہ نہیں رہنا چاہتا۔" وہ جیسے فیصلے کی پوزیشن میں آ گیا تھا، ساری پریشانیوں کا حل اس نے ڈھونڈ لیا تھا۔

سفید بنیان کے اندر سے چھلکتی اس کی مردانہ وجاہت اس کی بھرپور مردانگی کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور اس کی طرف بھی اشارہ کر رہی تھی کہ اگر ایک مرد کوئی فیصلہ کرے تو اسے پھر دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

☆☆☆

مئی کا مہینہ آدھے سے زیادہ گزر چکا تھا جب وہ دونوں قانونی طور پر ایک دوسرے کی زندگیوں میں شامل ہوئے تھے، نکاح نامے پر سائن کرتے ہوئے سلطنت کے ہاتھ کانپ رہے تھے، عجیب سے احساسات کے ساتھ وہ دونوں اک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، ان نظروں میں استحقاق کا ایک نیا رنگ شامل ہو چکا تھا، وہ خواب جو ابھی تک صرف خواب تھے حقیقت میں ڈھلتے نظر آ رہے تھے۔

لکھنؤ کے گلی کوچے نئے نئے سے لگ رہے تھے کیا تھا کاغذ کے اس عام سے ٹکڑے میں کہ اک دوسرے کے علاوہ ہر چیز فاصلوں پر کھڑی نظر آ رہی تھی۔

دونوں کے دلوں سے خدشے اور اندیشے وقتی طور پر پس پشت جا چکے تھے، وہ تھے اور ان کے گرد چلتی محبت کے رنگوں سے مہکی ہوا، جس نے انہیں مست کر دیا تھا اردگرد کی انہیں خبر ہی نہیں تھی، آنے والے وقت کا خوف دلوں سے زائل ہو چکا تھا (چاہے وہ وقتی تھا) نکاح کے بعد دونوں اپنے گھروں کو واپس چلے گئے تھے، آنکھوں میں سجے خواب ابھی خواب ہی تھے قانونی طور پر وہ میاں بیوی بن چکے تھے یہ رشتہ ابھی کاغذ ہی تھا، دو دلوں نے ابھی اس کی خوشبو کو محسوس نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

"خاموش۔" بوا نے فرط جذبات سے ہلتے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔" غرارہ سنبھالتی وہ تیز تیز قدموں سے دروازے تک گئیں اور اک نظر دروازے کے باہر جھانکتی زور سے اسے بند کر کے اندر چلی آئیں۔

"اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے آپ نے سوچا کیوں نہیں۔" ان کی بوڑھی آنکھوں کے کنارے پانی سے نم ہو چکے تھے، وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں مسلتے ہوئے سلطنت کی جانب دیکھ رہی تھیں، سن کر ان پر تو جیسے کوئی آفت ٹوٹ پڑی تھی، وہ اس حویلی کی نوکر تھیں مگر ایسی جو اس حویلی کی عزت کو اپنی عزت سمجھتی تھیں۔

اس خاندان میں اس قسم کا یہ دوسرا واقعہ تھا، شمیم آرا تو لوگوں کے ذہنوں سے پچیس سال ہوتے اتر چکی تھی، نواب رجب علی نے پلٹ کر کبھی اسے دیکھا تک نہ تھا، لیکن وہ اپنی جان سے پیاری بیٹی کا کیا کرے گا، بوا کا دل سوچ کر ہی دہل گیا۔

"بہت سوچ کر ہی یہ فیصلہ لیا ہے، ہمیں پتہ تھا کہ ہماری مرضی بالکل بھی ابا حضور کو نہیں بھائے گی، عباس ہماری زندگی ہیں، ان کے بغیر ہم نہیں رہ سکتے۔" وہ نظریں نیچے کیے بوا سے مخاطب تھی جو اس کی اتنی جرأت پر حیران و پریشان سانس روکے کھڑی تھیں۔

"عباس کی محبت آپ کے لئے اتنی اہم ہو گئی کہ باقی محبتیں آپ بھول گئیں، آپ نے سوچا تک نہیں کہ آپ کے اس قدم سے کتنے دل ٹوٹیں گے۔"

بوا اس کو شانوں سے پکڑے جھنجھوڑ کر بولیں، وہ خاموش رہی، اس کو یوں دیکھ کر ساتھ ہی بوا کا دل بھر آیا، بن ماں کی بچی، بوا ن اسے سینے سے لگا لیا۔

"آپ نے ہم کو تو بتایا ہوتا۔" سلطنت ان کے گلے سے لپٹی زور زور سے آنسو بہانے لگی، کوئی اس کے دل کو نہیں سمجھتا۔

"ہمیں پتہ تھا بوا آپ کبھی نہیں مانیں گی۔"

"نواب صاحب کو پتہ چلا تو جانے کیا ہو گا، ہمیں تو یہی سوچ سوچ کر ہول اٹھ رہا ہے۔"

"بوا عباس بہت اچھے ہیں۔" سلطنت خود کو بوا سے جدا کرتے ہوئے بولی تو عباس کا نام لینے پر اپنے آپ اس کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔

"میری چند اباتیں اچھے یا برے کی نہیں ہو رہی ہم جانتے ہیں سب، لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، ابا حضور کی ضد ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔" وہ اپنی گالوں پر بہتے آنسو صاف کرتے ہوئے بوا سے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"ہمیں معلوم ہے کہ اگر ابا حضور کو پتہ چلا تو وہ ہمیں جان سے بھی مار سکتے ہیں لیکن جو زندگی عباس کے بغیر گزرے اس سے موت اچھی ہے۔" بوا کو اس کے اتنے نڈر انداز پر خوف سا محسوس ہوا۔

"اب جو ہو گیا ہے ہم اس سے پیچھے نہیں ہٹیں گے اور آپ کو اس میں ہمارا ساتھ دینا ہو گا۔" اس نے مڑ کر بوا کا چہرہ دیکھا جہاں تفکر کے آثار نمایاں تھے، وہ بہت آس کے ساتھ بوا کی جانب دیکھ رہی تھی جن کی پرسوچ آنکھیں جانے کیا سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

اپنے کمرے میں وہ دروازہ بند کر کے لیٹا تھا، نکاح کے بعد ابھی تک اس کی سلطنت سے کوئی بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی، دل میں انگڑائیاں لیتے جذبات کو مشکل سے کنٹرول کیے ہوئے تھا، نکاح کے دو بولوں نے اس کی تو دنیا بھی بدل دی تھی پہلے بھی وہ اسے بہت عزیز تھی مگر اب تو حد سے بڑھ گئی تھی، اس کے حوالے سے دل میں جنم لیتے میٹھے سے جذبات کتنا مزہ دے رہے تھے اسے سوچ کر ہی دل خوشی سے مچل رہا تھا، آنے والے وقت کے خوف سے بے نیاز وہ اپنے آپ میں مگن تھا جو ہو گا دیکھا جائے گا، وہ بھی سر پر کفن باندھ چکا تھا دروازے پر ہونے والی دستک اسے سنائی نہیں دی تھی لیکن دوسری دستک پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا دروازے پر ماموں اور ممانی کو دیکھ کر وہ اپنے خیالوں کی اس حسین دنیا سے نکل کر حقیقت کی کڑی دنیا میں چلا گیا جہاں ہر طرف اپنے اپنے مطلب کو نکالنے کے لئے لوگ سو سو جلیے کر رہے تھے۔

"اتنی گرمی میں دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے میاں۔" ماموں قدم اٹھاتے اندر چلے آئے تو وہ ان کی بات سن کر شرمندہ سا سر کھجانے لگا، ممانی بھی اس کے انداز پر ہنس دیں۔

"بہت گرمی ہے نوابن سے کہہ کر باہر تخت بچھوا لیتے۔" ممانی کی بات پر وہ خاموش ہی رہا اب وہ انہیں کیا بتاتا کہ موسموں کی ستم ظریفی محبت کرنے والے دلوں پر کوئی اثر نہیں ڈالتی، وہ دونوں قریب بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"کمرہ بڑا گندا ہو رہا ہے کیا نوابن نے یہاں کی صفائی نہیں کی۔" ماموں ممانی سے مخاطب ہوئے۔

"حالت سے تو یہی لگتا ہے وہ شاید نیچے مصروف رہی ہو گی۔"

"وہ مصروف تھی تو اکبری سے کہہ دیتیں، کتنا برا لگ رہا ہے، عباس میاں اس گند میں لیٹے کیا اچھے لگتے ہیں۔" وہ ماموں اور ممانی کی ایسی بے تکی باتیں سن کر حیران سا انہیں دیکھ رہا تھا، اسے لگا جیسے وہ کوئی اور بات کرنے کے لئے آئے ہیں اور یہ باتیں کر کے اس بات کے لئے راستہ بنا رہے ہیں۔

"کوئی بات نہیں ماموں جان، یہ میرا کمرہ ہے مجھے ایسے بھی اچھا لگتا ہے۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا کہ یہ کمرہ تمہارا ہے اور

کمرہ سارا گھر ہی تمہارا ہے۔" ممانی کے دلار کو سمجھتا وہ مسکرا کر نظریں نیچی کر گیا، اس وقت وہ صرف مسکرا ہی سکتا تھا۔

"ہمارا کیا ہے بیٹا اکبری ہی ہمارے لئے سب کچھ ہے، تم دونوں ہی ہماری زندگیوں کا مقصد ہو۔" ممانی جان کے اتنے واضح اظہار پر وہ کرب سے آنکھیں موند گیا، اک لمحے کے لئے اسے ان دونوں پر ترس بھی آیا اپنی بیٹی کی نسبت سے وہ کتنی محبت کے ساتھ یہاں اوپر آتے تھے اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور تھا وہ محبت جواب اس کی زندگی بن چکی تھی۔

"آپ دونوں نے ایسے ہی اوپر آنے کی زحمت کی مجھے بلا لیا ہوتا نیچے۔" اس نے بات پلٹی وہ مزید اس گرفت میں نہیں رہنا چاہتا تھا اس کے لئے اول و آخر سلطنت ہی تھی۔

"یہ تو یونہی بیٹھے بیٹھے کہنے لگے چلو عباس کے پاس چلتے ہیں، اکیلا گرمی میں کیا کر رہا ہے۔"

"ہاں واقعی اکیلے گرمی میں کیا کر رہے ہو چلو نیچے چلتے ہیں، سب مل کر بیٹھتے ہیں۔" ماموں تو بات کرتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے تو مجبوراً اسے بھی ان کی تقلید کرنا پڑی۔

☆☆☆

بڑے نواب صاحب کو دیکھ کر جانے اس کے دل کو کیا ہوا تھا، وہ تو باہر ہوا کھانے آئی تھی، وہ انہیں کرسی پر براجمان دیکھ کر واپس پلٹ گئی، آج کافی دن بعد وہ گھر پر نظر آئے تھے ورنہ جیسے ملکی حالات جا رہے تھے ان کا زیادہ وقت انہی پارٹی کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔

دل پر جیسے کوئی بوجھ سا بیٹھ گیا تھا اسے لگا جیسے اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے، اتنی محبت کرنے والا باپ کیا سہہ پائے گا اس بات کو، وہ مسہری پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں منہ چھپا لیا۔

"کوئی اور راستہ بھی تو نہیں چھوڑا تھا ہمارے لئے، ہم بھی کیا کرتے۔"

"بجیا آپ کو بڑے نواب صاحب باہر یاد فرما رہے ہیں۔" حسنی کی آواز سن کر وہ چونک پڑی۔

"باہر ہیں، جلدی آ جائیں انہیں کہیں جانا ہے۔" وہ نواب صاحب کا پیغام دے کر واپس پلٹ گئی تو وہ خوف زدہ اور شرمندہ ہوتے دل کے ساتھ باہر نکل آئی، آگے نواب صاحب اپنی ازلی آن بان کے ساتھ براجمان تھے، کیا یہ آن بان میری وجہ سے مٹی میں مل جائے گی، وہ دکھ کے ساتھ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"آؤ یہاں، ادھر میرے پاس۔" انہوں نے اپنے ساتھ والی کرسی کی طرف اشارہ کیا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ان کے قریب چلی آئی۔

"آداب ابا حضور۔" وہ ان کے قریب بیٹھ گئی، قریب ہی دادی حضور اور بوا بھی موجود تھیں۔

"ہمیں ذرا جلدی ہے، تمہیں کچھ بتانا تھا، آپ کی بڑی پھوپھی جان جہاں آرا کی بیٹی کی شادی لئے ہم جا نہیں سکتے ہماری مجبوری آپ سمجھتی ہیں، اس لئے آپ بوا کے ساتھ ڈھاکہ تشریف لے جائیے، ٹکٹ کا انتظام ہم نے کر دیا ہے آپ بس تیاری کریں۔"

ابا حضور کی بات پر وہ خاموشی سے سر نیچا کر گئی، جانے کو اس کا ذرا بھی من نہیں تھا لیکن ان کے فیصلے کے آگے کون بول سکتا تھا۔

☆☆☆

"ہمارا دل نہیں چاہ رہا جانے کو اتنی دور۔"

وہ کمرے میں آتی بوا کے کندھے پر سر رکھے رونے لگی۔

"آپ کے ابا حضور کا حکم ہے چندا، ماننا تو پڑے گا۔" وہ پیار سے اس کے بالوں کو سہلانے لگیں۔

"بوا آج ابا حضور کے سامنے میرا دل بھر آیا، پتہ نہیں کیوں مجھے لگا جیسے......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"غلطی تو ہوئی ہے بٹیا۔"

"نہیں بوا، میری محبت غلطی نہیں ہے۔" وہ اپنے فیصلے کے دفاع میں کھڑی ہو گئی۔

"عباس کو نہ پا سکنا شاید میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہو جاتی۔"

"اب جو ہوا سو ہوا، ٹھیک وقت دیکھ کر نواب صاحب کو سب کچھ بتا دو۔" بوا کے مشورے پر وہ بدک گئی۔

"تا کہ وہ میرا جنازہ نکال دیں۔" وہ حیران سی بوا کو دیکھ رہی تھی کہ انہوں نے کیسا مشورہ دیا ہے۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں بوا۔"

"بتائیں گی نہیں تو کیا کریں گی، دوسرا کوئی ہے راستہ؟" بوا کی بات سن کر وہ خاموش ہو گئی۔

"راستہ تو کوئی نہیں ہے، عباس سے بات کرتی ہوں اور ساتھ یہ بھی بتاتی ہوں کہ ابا حضور ہمیں ڈھاکہ بھیج رہے ہیں اور وہ اس ضمن میں کیا کہتا ہے۔" کیونکہ اب وہ اس کے حرم میں تھی اس کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں آ جا سکتی تھی۔

☆☆☆

خورشید کے ذریعے اس نے عباس کو پیغام بھجوانا تھا اس لئے وہ ڈرائیور کے ساتھ اس کے ہاں آئی تھی، لال رنگ کا شرارہ پہنے وہ غضب ڈھا رہی تھی۔

"روپ تو تم پر پہلے ہی عاشق تھا اب تو سونے پر سہاگہ ہو گیا، نکاح کے دو بولوں نے تو دنیا ہی تمہاری بدل دی، بڑی حسین لگ رہی ہو، قسم سے۔" خورشید تو واری واری جا رہی تھی۔

"ہم کہاں حسین ہیں سب تو ان کی محبت کا اعجاز ہے، وہ ہمیں جب اک نظر دیکھ لیتے ہیں ہماری زندگی کے دیئے میں تیل پڑ جاتا ہے، ہماری آنکھیں ان کی دی محبت سے روشن ہیں، یہ ہونٹ اسی کی دی ہنسی سے ہنستے ہیں، یہ گال اس کی چاہت سے گلابی ہوتے ہیں، اب بولو مجھ میں کیا ہے، یہ سب انہی کا دیا ہوا ہے۔" وہ بڑے انداز میں خورشید کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے بول رہی تھی گویا وہ ہاتھ عباس کا ہو۔

"ہمارے پاس میرا کچھ بھی نہیں ہے سب ہمارے عباس کا دیا ہوا ہے ہمارے عباس کا۔" وہ تو اس کا ہاتھ چھوڑے اک وجد کی کیفیت میں پلنگ پر دراز ہو گئی اور آنکھیں موند لیں جیسے وہ اس کے پاس ہو بہت پاس، خورشید پاؤں پلنگ سے نیچے لٹکاتے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جو سچی خوشی سے روشن تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ ان بند آنکھوں کے پیچھے کون سا چہرہ ہے جو ان کی معصومیت کو چوم رہا ہے اپنا استحقاق ظاہر کر رہا ہے۔

"برا نہ مناؤں تو ایک بات پوچھوں۔" خورشید کی آواز پر اس نے ایسے بند آنکھیں کھولیں، جیسے کوئی پیاسا پیاس بجھانے کی غرض سے کنوئیں کے پاس جاتے اور بغیر پیاس بجھائے کوئی اسے وہاں سے بلا لے۔

"تمہارا یہ قدم کیا قیامت نہ لائے گا گھر میں۔" خورشید کی آنکھوں میں ڈولتے وسوسے نے اسے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا لیکن آج کل وہ جن ہواؤں میں اڑ رہی تھی انہوں نے بہت جلد

اسے سنبھالا دے دیا۔

"وہ قیامت جو یہ قدم نہ اٹھانے پر ہماری زندگی میں آئی تھی یہ اس سے کہیں کم ہوگئی، ہم اب ہر قیامت کو سہنے کے لئے تیار ہیں۔" وہ خورشید کے سامنے خود کو بڑا مضبوط ظاہر کر رہی تھی۔

"وقت آنے پر ابا حضور کو سب کچھ خود ہی بتا دیں گے، ہو سکتا ہے وہ مان جائیں کیونکہ وہ مسلمان ہیں سید زادے ہیں اور ویسے بھی یہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں زمانہ بدل رہا ہے اور بدلتے موسموں میں ہمیں اتنی چھوٹ تو ہونی چاہیے۔"

"زمانہ جتنا مرضی بدل جائے مگر ماں باپ، رسم و رواج وہی رہتے ہیں، وہ کبھی بھی ہمیں اپنی من مانی کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔" خورشید کی بات پر اس نے سر نیچے کر لیا تھا کہہ تو ٹھیک رہی تھی، اپنے فیصلے کے حق اور دفاع میں وہ بول تو رہی تھی لیکن اندر سے وہ خود بھی سب جانتی تھی۔

"وسوسے ہمیں بھی گھیر لیتے ہیں ہم بھی پریشان ہو جاتے ہیں، مگر ہم کیا کریں، تم ہی بتاؤ کیا ابا حضور مانتے۔"

"پتہ نہیں سلطنت تمہاری طرف سے مجھے ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے، اس فیصلے کا تو اب وقت ہی بتائے گا کہ ٹھیک ہے یا......" اس نے جملہ درمیان میں ہی چھوڑ دیا۔

"تمہارے پاس ہم اپنی خوشی بانٹنے آئے تھے اور تم الٹا ہمیں ہی پریشان کر رہی ہو۔" وہ منہ پھلا کر دوبارہ لیٹ گئی تو خورشید اپنی پیاری سی نواب زادی کے ناراض ہو جانے کے خدشے سے اسے منانے کے لئے اس کے ساتھ لیٹ گئی۔

گھر آ کر بھی سلطنت کا ذہن خورشید کے آخری جملے میں الجھا رہا۔

الجھی سوچوں کے تار لئے وہ یونہی غیر ارادی طور پر دادی حضور کے کمرے میں چلی آئی، جہاں وہ بخار کی حالت میں اپنی مسہری میں لیٹی ہوئی تھیں، کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس سے ہوا کے گرم جھونکے اندر آ رہے تھے، وہ دبے پاؤں اندر آئی تھی اس لئے انہیں خبر نہ ہوئی پردے ہوا سے ہل رہے تھے، وہ مسہری کے قریب آن کھڑی ہوئی، ذہن کہیں اور تھا اور وجود کہیں اور خالی خالی نظروں سے وہ انہیں دیکھتی واپس مڑ آئی، چھوٹے نواب پورے ایک ماہ سے دلی میں تھے، سال کے ایک دو ماہ وہ دلی کی ناچنے والی سلطانہ بائی کے ساتھ گزارتے تھے، اسے اس بات کا علم نہیں تھا وہ تو یونہی ایک دن بوا کے منہ سے پھسل گیا تھا، بعد میں وہ اس سے منتیں کرتی رہی تھی کہ کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرے، ورنہ نواب صاحب میری گردن کاٹ ڈالیں گے۔

☆☆☆

عباس نے اسے اپنی پسندیدہ جگہ پر بلایا تھا، یہ ایسی جگہ تھی جب بھی اس کا دل پریشان ہوتا وہ یہاں چلا آتا، روح کے قریب یہ جگہ اسے اپنے روحانی آنچل میں ڈھانپ لیتی اسے وہی سکون محسوس ہوتا مرثیے کو بام عروج پر پہنچانے والے میر ببر علی انیس کا مزار ہمیشہ کی طرح اپنے پاس آنے والوں کو وہ سکون مہیا کر رہا تھا جس کی تلاش میں وہ وہاں آتے تھے۔

شام کا وقت تھا مزار پر معمول کے مطابق لوگ جمع تھے، کچھ لوگ سوز کے ساتھ مرثیہ پڑھ رہے تھے سلطنت نے خود کو بڑی سی کالی چادر کے اندر ڈھانپ رکھا تھا اس کے باوجود عباس نے اسے دور سے ہی پہچان لیا اور محبت کی یہ ایسی منزل ہوتی ہے جہاں چہرے کوئی اہمیت نہیں رکھتے روح سے روح کا لنک ہو جاتا ہے بن دیکھے بھی محبوب اپنے محبوب کو پہچان سکتا ہے، اس کیفیت تک پہنچنے کے لئے کڑے راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

سلطنت کی نظروں نے بھی اسے کھوج لیا تھا پینٹ شرٹ میں ملبوس وہ شرٹ کے بازو دو پہر کو فولڈ کیے ہوئے تھا شاید اسے گرمی لگ رہی تھی وہ دو تین لوگوں کو پیچھے دھکیلتا تیزی سے اس طرف لپکا لیکن اس کے ساتھ کھڑے نسوانی وجود کو دیکھ کر تھوڑے فاصلے پر ہی رک گیا، بوا نے آج اس کے ساتھ آنے کی ضد کی تھی اور وہ چاہ کر بھی انہیں منع نہ کر سکی کہ وہ کہیں اس بات کا غلط مطلب نہ نکال لیں۔

وہ خود اس کے قریب چلی آئی اور پھر عباس کی ہچکچاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ یہ میری بوا ہیں عباس ان کی موجودگی میں بہت سنبھل سنبھل کر بات کر رہا تھا۔

بوا مبہوت سی اسے دیکھے جا رہی تھیں، سلطنت کے انتخاب نے انہیں چونکا دیا تھا، نوابوں سے زیادہ حسین، ان سے زیادہ باحیا، کسی چیز کی کمی نہیں تھی اس میں، وہ تو دل ہی دل میں اس کی نظر اتار رہی تھیں، سلطنت نے بھی داد طلب نظروں سے بوا کو دیکھا جو عباس کو دیکھے جا رہی تھیں۔

سلطنت کے ساتھ کھڑا وہ کتنا جچ رہا تھا، چاند سورج کی جوڑی تھی جو آج میر انیس کے مزار پر اتری تھی، آج بوا کے دل سے سارے وہم جاتے رہے تھے، جو ہوا شاید وہ اچھے کے لئے ہی ہوا ہے، ایسا لڑکا تو قسمت والوں کا داماد بنتا ہے۔

وہ نظریں نیچی کیے ہوں، ہاں میں ہی جواب دے رہا تھا، بوا اس کے اتنے سنبھل سنبھل کر بولنے کو محسوس کر رہی تھیں، اس لئے وہ انہیں اکیلا چھوڑ کر مزار کے اندر چلی گئیں۔

"کیوں کس لئے۔" عباس نے یہ بات اتنے استحقاق کے ساتھ کہی تھی کہ سلطنت کو اس کے انداز پر بے اختیار پیار آ گیا۔

"ابا حضور کا حکم ہے۔" وہ بھی اسے مزید بتا کر ستا رہی تھی۔

"پندرہ بیس دن لگ جائیں۔"

"پندرہ دن تو کیا ایک دن بھی نہیں، میری بیوی آپ، نکاح ہوا ہے ہمارا، میری اجازت کے بغیر آپ کہیں نہیں آ جا سکتیں۔" وہ اپنا پھر پورا استحقاق ظاہر کر رہا تھا اور سلطنت واری واری جا رہی تھی اس کی محبت پر سے۔

"یہ جو آپ کا چودھویں کے چاند سا چہرہ ہے ناں، یہ ہماری امانت ہے کسی غلط نظر کو بھی برداشت نہیں کروں گا میں، اپنے ابا حضور کو کہہ دیجئے گا ڈھا کہ کسی اور کو بھیج دیں۔"

"تو ٹھیک ہے آپ اپنے سسر صاحب کو خود ہی کہہ دی آ کر، ہم میں تو ہمت نہیں ہے ان کے آگے بولنے کی۔"

"میری جرأت کو نہ آزمائیں، کسی دن گھر آ جاؤں گا آپ کے۔" عباس کا والہانہ انداز دیکھنے کے قابل تھا۔

نکاح کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی اور عباس جس انداز میں اس سے بات کر رہا تھا وہ سلطنت کے لئے بالکل نیا تھا وہ اس سے باتیں سلطنت سمجھ کر نہیں اپنی منکوحہ سمجھ کر کر رہا تھا۔

"وہ دن کب آئے گا۔" سلطنت نے بڑی حسرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"کاش ایسا ہو جائے کہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے نکل آئے۔" وہ دونوں اک

لونے میں کھڑے تھے جہاں برائے نام ہی لوگ تھے، بوا اندر ہی تھیں۔

"وہ دن کب آئے گا عباس، کاش ایسا ہو جائے۔" سلطنت کے چہرے پر یکدم رات کا سیاہ آنچل لہرا گیا تو عباس جو تھوڑی دیر پہلے سلطنت سے مستی کر رہا تھا وہ سب بھولے مچل کر اس کے قریب ہو گیا۔

"آثار تو نظر نہیں آتے مگر چلو اچھا سوچنے میں کیا حرج ہے۔" عباس ہولے سے مسکرایا جیسے جان بوجھ کر نوابوں کی فطرت سے وہ اچھی طرح واقف تھا کسی اور کو اپنے مقابلے پر لانا ان کے لئے موت کے برابر تھا۔

سلطنت کی آنکھیں نمکین پانیوں کے بوجھ سے نیچے کو جھکی جا رہی تھیں، عباس کے اندر ہلچل سی ہونے لگی، اپنی سلطنت کی آنکھوں میں آنسو وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"یہ وسوسے ہمیں جینے نہیں دے رہے عباس۔" پانی چھلک کر آنکھوں سے باہر آ گیا اور عباس کا دل ان پانیوں کی گہرائی میں ڈوبنے ابھرنے لگا، ان آنکھوں میں پانی اسے اپنی موت لگ رہے تھے، اس کے رونے سے ماحول یکدم سوگوار ہو گیا تھا۔

"اچھا بابا یہ رونا دھونا بند کرو اور میری طرف سے اجازت ہے ڈھاکہ جانے کی۔" عباس کی بات پر نا چاہتے ہوئے بھی سلطنت کی بھیگی آنکھوں میں ہنسی کھل اٹھی۔

"آپ کے کہنے کا یہ مقصد ہے کہ میں ڈھاکہ جانے کے لئے رو رہی ہوں۔"

"اور نہیں تو کیا بہانے بہانے سے رو کر مجھے بتا رہی ہو۔"

"آپ بھی نہ عباس......" وہ ہنستے ہوئے گالوں پر آئے آنسو صاف کرنے لگی، ہنستی ہوئی سلطنت کتنی خوبصورت لگتی ہے، عباس نے بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھا تو دل کے اندر کئی جذبات انگڑائی لے کر رہ گئے۔

"آپ کے بغیر یہ پندرہ بیس دن کیسے گزریں گے یہ ہم ہی جانتے ہیں۔" اس نے پلکیں اوپر اٹھائیں جہاں ابھی تک نمی پھیلی ہوئی تھی، رونے سے کاجل آنکھوں کے گرد ہلکے سے پھسل گیا تھا۔

"ساری مستی شراب کی سی ہے۔" عباس کے ہونٹ ہولے سے ہلے تھے، سلطنت تو ان کے اتنے والہانہ انداز پر حیران سی اپنے آپ میں سمٹ گئی حیا سے، اتنے سالوں میں آج پہلی دفعہ عباس نے اس کی تعریف شعر کہہ کی تھی وہ تو بہت ناپ تول کر بات کرتے تھے، جیسے بولنے سے پہلے دس بار سوچتے ہوں سلطنت کو ان کا یہ بدلاؤ سمجھ میں آ رہا تھا اور دل و جان سے پسند بھی آیا تھا۔

عباس نے سگریٹ سلگا کر ہونٹوں میں دبا لیا تھا اور بڑے شریر سے انداز میں وہ اسے دیکھ رہا تھا جو آنکھوں میں ان مٹ خوشی اور چمک لئے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو، کیا شعر پسند نہیں آیا۔" سگریٹ کے دھویں کو اک طرف منہ سے خارج کرتے ہوئے اس نے سلطنت کی طرف دوبارہ روخ موڑا۔

"آپ ایسے تو نہیں تھے، اچانک یوں، یہ شعر، یہ اندازہ۔" وہ ہولے سے گویا ہوئی کیونکہ قریب سے چند لوگ گزر رہے تھے، اس نے چہرہ ڈھانپ لیا۔

"پہلے والے عباس میں اور اب والے عباس میں بہت فرق ہے، اب آپ میری محبوبہ ہی نہیں میری زندگی کی مالک بھی ہیں، شریک سفر ہیں اور اپنی شریک حیات کی میں جس طرح مرضی تعریف کروں۔" عباس نے آدھ جلا سگریٹ بجھا کر نیچے پھینک دیا اور ہولے سے آگے بڑھ کر سلطنت کا ہاتھ پکڑ لیا تو اس کے اندر جیسے بجلیاں سی دوڑ گئیں، سانسیں جیسے ہواؤں کی سپرد ہو گئی تھیں پکڑ میں نہیں آ رہی تھیں، وہ چاہ کر بھی اس سے اپنا ہاتھ نہ چھڑا سکی۔

"ہم مر جائیں گے عباس۔" اس نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے مسکرا کر ہاتھ چھوڑ دیا تو سلطنت نے جلدی سے دینا ہاتھ چادر کے اندر کر لیا تو اس کے ایسا کرنے پر عباس بڑے معنی خیز انداز میں ہنسا تھا۔

☆☆☆

ڈھاکہ جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی سارا سامان پیک ہو چکا تھا، بوا اور دو ملازم اور تھے بوا تو اس سے عباس کی تعریفیں کرتی نہیں تھک رہی تھیں، انہیں عباس بہت پسند آیا تھا، نواب رجب علی کا داماد کسی ایسے ہی مرد کو ہونا چاہیے تھا، نواب سعادت علی کا بیٹا انہیں پسند نہیں تھا اور ساتھ اپنوں نے سلطنت کو ایک خوشی کی خبر اور سنائی تھی کہ نواب سعادت علی کسی کام سے ولائیت گئے ہیں امام ضامن والا چکر لیٹ ہو گیا ہے، سلطنت نے سن کر شکر کا کلمہ ادا کیا تھا۔

بوا کمرے سے باہر گئیں تو بیٹھے بیٹھے جانے کہاں سے یہ خیال اس کے ذہن میں کوندا، بوا دوبارہ کمرے میں آئیں تو ان کے قریب چلی آئی۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے بوا کے عباس بھی ہمارے ساتھ ڈھاکہ چلیں۔" اس کی بات سن کر بوا کے ماتھے پر تیوریوں کا انبار سا لگ گیا۔

"اپنے ابا کو آپ اچھی طرح جانتی ہیں، آپ کے یہ تقاضے ہماری سمجھ سے باہر ہیں۔" لیکن سلطنت کو کہاں پروا کی ان تیوریوں کی، جتنی مرضی اہم سہی ہے تو ان کی ایک ملازمہ ہی۔

"ہمیں نہیں پتہ، ہم نہیں رہ سکتے اتنے دن ان کے بنا۔"

بوا کو اس کی بالکل بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی، وہ ڈھاکہ کیسے لے جا سکتیں تھیں، اک غیر مرد کو کیسے رکھیں گی وہ انہیں وہاں، بوا نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ جلد سے بولی۔

"آپ اپنا کوئی عزیز انہیں بتا دیجئے گا، پھپھو کچھ نہیں کہیں گی مان جائیے نہ بوا۔" سارے جواب تو اس کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔

نواب صاحب کا سوچ کر بوا کو جھرجھری سی آ گئی لیکن وہ تو کسی طور ماننے میں نہیں آ رہی تھی اس لئے وہ خاموش ہو گئیں۔

لیکن عباس کے ساتھ بات کرنے پر پتہ چلا کہ وہ لاہور جا رہا ہے کیونکہ وہ اپنے گھر والوں کو راضی کر کے انہیں سب کچھ بتا دے گا ہاں سلطنت کی خوشی کی خاطر وہ ایک دو روز کے لئے لاہور سے واپسی پر ڈھاکہ چلا آئے گا۔

سلطنت کے لئے یہی بہت تھا کہ اس کے آنے کی آس لئے وہ ڈھاکہ کے لئے روانہ ہو جائے۔

☆☆☆

ہرے بھرے باغات کے درمیان وسیع رقبے پر پھیلا وہ قلعہ نما بنگلہ کسی مہاراجہ کی رہائش گاہ لگ رہا تھا، دور سے دیکھ کر اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سبزے سے بھرے تالاب کے بیچ خشکی کا کوئی بڑا سا ٹکڑہ رکھ چھوڑا ہے، جب جب بارش اس سبزے کو تر کرتی تو وہ بنگلہ بھیگ کر اور بھی حسین لگتا، ایسے لگتا جیسے دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی اور حسین منظر ہو ہی نہیں سکتا۔

پپیتوں کے باغات میں کام کرنے والی سانولی سلونی عورتیں اپنی کمر پر لکڑی کی ٹوکریاں اٹھائے رشک بھری نگاہ سے انہیں دیکھتیں اور سوچتیں کہ اس گھر میں بسنے والے انسان ہیں یا آسمان سے اتری ہوئی کوئی مخلوق۔

یہ بنگلہ 1924ء میں پھپھو جہاں آرا کے سسر نواب ناصر جہاں نے بنوایا تھا، بنیادی طور پر وہ علی گڑھ یو پی کے رہنے والے تھے مگر ان کا چائے کا کاروبار تھا بنگال میں ہو وہ علی گڑھ چھوڑ اپنے کاروبار کی وجہ سے سلہٹ میں آن بسے۔

بنگالی طرز کے اس خوبصورت بنگلے کی ایک ایک جگہ دیکھنے کے قابل تھی۔

باہر دروازے سے اندر آتی بڑی کشادہ بجری کی سڑک گیراج تک جاتی تھی جہاں دو تین گاڑیاں کھڑی تھیں، اسی سڑک کے ساتھ ساتھ خوبصورت سبز باڑ اپنی طرف آنے والوں کو خوش آمدید کہتی۔

اندر داخل ہونے پر ایک بڑا سا ہال کمرہ جو مردان خانہ کہلاتا تھا دنیا کی تمام آسائشوں سے مزین، بہترین صوفے، میز، کھڑکیوں کے آگے خوش نما پردے جب اندر آتی ہوا کے ساتھ چھوتے تو نا چاہتے ہوئے بھی دل کے اندر اک خوش نما سا احساس انگڑائی لینے لگتا، اس گھر کے مکین جن میں پھوپھی جہاں آرا کی دو بہویں اس کے تین بچے دو بیٹیاں اور جب اس گھر کی عورتیں جارجٹ کی ساڑھیاں پہن کر گھر کے ملازموں کے سامنے پھرتی تو غریب ترسی ہوئی نگاہوں کا دل ڈول ڈول جاتا، جہاں غریب لوگ دو وقت کی روٹی بھی اتنی مشقتوں کے بعد کھاتے تھے وہاں ایسی شاہانہ زندگی کسی خواب سے کم نہ تھی۔

سلہٹ بنگال کا ایک خوبصورت اور سرسبز شہر جو اپنی چائے کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے، جہاں کی ہریالی اپنی طرف آنے والوں کو اپنے سینے سے لگا لیتی ہے۔

☆☆☆

اسے یہاں آئے تیسرا دن ہو چکا تھا، شادی کی گہما گہمی میں بھی وہ ایک پل کے لئے عباس کو بھول نہیں پائی تھی، پھوپھی اماں تو وارے وارے جا رہی تھیں، ان کی دو بہویں جن کا تعلق بنگال کی سرزمین سے ہی تھا ان کے اندر بنگال رچا بسا تھا اپنے مخصوص پہناوے سے وہ گھر میں پھرتی بڑی بھلی لگ رہی تھیں، آنکھوں میں کاجل کے ڈورے، بنگالی طرز میں باندھی ساڑھیاں، زیوروں سے لدی، ہر آنے جانے والوں کو خوش دلی سے مسکرا مسکرا کر مل رہی تھیں، اخلاق تو جیسے ختم تھا ان پر۔

بنگال کی بارش حسب معمول زمین کے سینے کو تر کر رہی تھی، شام کے سائے بادلوں کے بیچ اپنی اہمیت کھو چکے تھے، سارا آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا، ہوائیں انہیں اڑانے کی ناکام کوششوں میں مصروف تھیں۔

ابھی تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا، کھڑکی کے پردے پیچھے کو سرکائے وہ دور دور تک پھیلے سبزے پر گرتی بارش کو دیکھ رہی تھی، لیکن دل کے اندر پھیلی ویرانی اپنا من پسند منظر دیکھنے پر بھی کم نہیں ہو رہی تھی۔

کتنے دن ہو گئے عباس کی صورت دیکھے، وقت تو جیسے کاٹے نہیں کٹ رہا وہ عباس کے بارے میں سوچ رہی تھی اور ادھر لاہور میں عباس اپنے گھر والوں کے آگے ڈٹا کھڑا تھا۔

"مجھے پتہ ہے ضرور یہ کسی لڑکی کا چکر ہے جو یوں یہ میرے آگے کھڑا ہو رہا ہے۔" اماں جو قریب ہی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھیں زینو کو قریب بلا کے بولیں۔

"آپ بھی کتنی سنگدل ہیں اماں اگر ایسا ہے تو آپ کو کرنے دو مرضی آخر ان کی اپنی زندگی ہے۔"

"بھاڑ میں جائے اس کی مرضی، مجھے تو لگتا ہے کہ تم ہی دماغ خراب کر رہی ہو اس کا اتنا تابعدار میرا بچہ جانے کس نے پھانس لیا۔" عباس کمرے میں آیا تو آگے اماں زینو اسی بات کو لے کر بول رہی تھیں اسے دیکھ اماں کی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کی مقدار میں اضافہ ہو گیا عباس سے ان کا رونا دیکھا نہ گیا تو وہ ان کے پاس پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"بہت برا ہوں ناں میں اماں جو آپ کی پریشانی کا سبب بن رہا ہوں۔" اس نے اماں کی گود میں سر رکھ لیا تو ان کا دل بھی پسیج گیا انہوں نے جھک کر اس کے ماتھے کا بوسہ لیا زینو ماں بیٹے کا لاڈ دیکھ کر قریب چلی آئی، وہ بھی پلنگ پہ بیٹھ گئی۔

"میں اسرار بھائی کو زبان دے چکی ہوں اور زبان سے پھرنا شریف لوگوں کو زیب نہیں دیتا۔" اس نے گود میں لیٹے لیٹے نظریں اٹھا کر اماں کی طرف دیکھا۔

"میں بھی یہی کہتا ہوں مگر آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔" اماں نے ناسمجھی کے عالم میں اس کے سر پر ہلکے سے دھپ رسید کی۔

"تو خاک کہتا ہے، جو کہنا تھا کہہ دیا میں نے؟" اس نے گود سے سر اٹھا لیا۔

"اماں آپ بھائی کی بات بھی تو سن لیں، ہو سکتا ہے انہیں بھی کوئی لڑکی پسند ہو۔"

زینو کی بات نے اماں کے سامنے اس کے دل کی ترجمانی کر دی تھی، اس نے بڑی تشکرانہ نظر سے زینو کو دیکھا جو کچھ نہ جانتے ہوئے بھی بہت کچھ جان گئی تھی اور اماں نے اسے عباس کی طرف دیکھا جیسا پوچھ رہی ہوں کہ اس بات میں کوئی سچائی ہے، وہ نظریں جھکا گیا تو اماں اس کی جھکی ہوئی نظروں کا مطلب سمجھ گئیں۔

"اگر کوئی ہے تو اسے دل سے نکال پھینکو کیونکہ اکبری کے علاوہ اس گھر کی بہو کوئی نہیں بنے گی۔" اماں کی بات سن کر وہ کافی دیر نظریں نیچے جھکائے جانے کیا سوچتا رہا، شاید وہ سوچ رہا تھا کہ سب کچھ بے سود ہے، زینو عباس کے چہرے پر تفکر کے واضح آثار دیکھ رہی تھی وہ چاہ کر بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

وہ بغیر کوئی بات کیے کمرے سے باہر نکل گیا۔

یہ جان کر کہ میں کسی کو چاہتا ہوں ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں ہوا تو میری نکاح والی بات سن کر تو وہ اپنی جان ہی دے ڈالیں گی، سو وقت پر چھوڑ دو وہی بہتر فیصلہ کرے گا۔

☆☆☆

اختر کو ملنے کے بعد وہ سیدھا لکھنو کے لئے روانہ ہو گیا، اماں کی باتوں نے ذہن کو پریشان کر رکھا تھا، اسے تھا کہ اگر اس بار اماں مان گئیں تو وہ نکاح کی بات لیک آؤٹ کر دے گا مگر یہاں تو وہ پہلے سے ہی بھی زیادہ کڑے تیوروں میں تھیں، وہ چاہ کر بھی خاموش ہی رہا۔

"یہ تمہاری زندگی ہے اسے ڈر کے مت جیو، جو دل میں آئے وہ کرو اور جب وقت آئے گا تو بتا دینا، نکاح ہی کیا ہے تم نے کون سا کوئی بغیر نکاح کے ہو۔" اختر کی بات سے اسے ڈھارس ہوئی تھی، اب وہ وہی کرے گا جو اس کا دل چاہے گا، زینو نے بھی باتوں باتوں میں اسے یہی سمجھایا تھا، سو وہ اب بالکل مطمئن ہو گیا تھا اس بات پر کہ وہ وہی کرے گا جو اس کا دل چاہے گا اور اس کے دل کی اولین خواہش سلطنت تھی اور ویسے بھی اب وہ دونوں جس رشتے میں بندھ گئے تھے، وہ

ان دونوں کو بہت قریب لے آیا تھا۔

☆☆☆

تین جون کے تاریخی فیصلے نے ملکی حالات ایک دم بدل دیئے تھے، مائیگریشن کا سلسلہ پورے ہندوستان میں جاری تھا، ہندوستان کی تاریخ کا ایک کٹھن باب شروع ہو رہا تھا، یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کی تاریخ انسانی خون سے لکھی جانی تھی، ہندوستان کے حالات دھیرے دھیرے سنگین صورت حال میں داخل ہو رہے تھے، لاہور سے لے کر دہلی اور دہلی سے لکھنو، مائیگریشن کے اس چکر نے گاؤں کے گاؤں ویران کر دیئے تھے اور پھر ہندوستان کے درمیان کھنچی اس سرخ لکیر نے ہر سو تھال کے تھال سرخ سیال اچھالنا شروع کر دیا تھا، ہولی سی تھی جو ہر طرف کھیلی جا رہی تھی، ہندوستان کا آسمان دکھ اور پریشانی کے بادلوں تلے نڈھال سا چھپے جا رہا تھا، آندھی سی تھی جو اپنی لپیٹ میں آنے والی ہر چیز کو نیست و نابود کر رہی تھی، انساں بھی اس کی پہنچ سے باہر نہیں تھا۔

آسمان سے خون ٹپک رہا تھا اور دھرتی خاموش تھی، راوی خاموشی سے بیٹھا تاریخ کے صفحوں پہ صفحے لکھے جا رہا تھا، خاموش نظریں اور سلے ہوئے ہونٹ، یہ کیسی بے بسی تھی کہ وہ جو دیکھ رہا تھا اسے حرف لکھ سکتا تھا اس کے خلاف نہ تو بول سکتا تھا اور نہ کچھ کر سکتا تھا۔

آج کے انسان کو کیا ہو گیا ہے اسے خون سے خوف کیوں نہیں آتا کسی دوسرے کی عزت اس کے نزدیک کیوں غیر اہم ہو گئی انسانی رشتوں کی عزت و تکریم سے کیوں بغاوت پر اتر آیا تھا وہ۔

☆☆☆

عباس جب لاہور سے لکھنو پہنچا تو وہ بری طرح بخار میں تپ رہا تھا اسٹیشن سے گھر آئے ہوئے راستے میں جس کی ملاقات خورشید سے ہوئی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ ابھی تک سلطنت واپس نہیں آئی، خورشید کی بات نے اسے پریشان کر دیا تھا ملکی حالات اتنے خراب ہیں اور وہ وہیں بیٹھی ہے، استحقاق کا ایک طوفان سا تھا جو اس کے اندر ہچکولے کھا رہا تھا، بخار اس قدر تیز تھا کہ اسے بالکل بھی سدھ بدھ نہیں رہی تھی، دونوں ممانیاں نے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کر کے شام تک بخار کو ہلکا کر دیا تھا دونوں کی محنت رنگ لائی تھی وہ پہلے سے کافی بہتر تھا۔

اکبری پلنگ کے قریب ہی کرسی پر بیٹھی تھی جب اس کی آنکھ کھلی تھی، بخار سے ابھی بھی اس کا بدن گرم تھا، آنکھوں کی سرخی قدرے کم ہوئی تھی، اکبری کو دیکھ اس کے چہرے کو دوسری طرف موڑ لیا، نقاہت سے برا حال تھا، اکبری اس کا چہرہ دوسری طرف مڑتا دیکھ چکی تھی۔

''کچھ چاہیے آپ کو۔'' دھیمی آواز سے بولتی وہ اٹھ کر جلدی سے کھڑی ہو گئی بڑی ممانی خود سے وہاں بٹھا کر گئیں تھیں کہ اگر اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو کوئی وہاں موجود ہو، عباس نے چہرہ موڑے موڑے ہی نفی میں سر کو ہلایا اور آنکھیں موند لیں، اکبری کو دیکھ کر سلطنت یاد آنے لگی تھی کتنے دن ہو چلے اسے دیکھے ہوئے۔

اسے سوچ کر ایک دفعہ پھر وہ پریشان ہو گیا تھا، پنجاب کی طرح بنگال کے حالات بھی خراب ہوں گے جس طرح کے حالات وہ راستے میں دیکھ کر آیا تھا اگر وہاں بھی، اس کا دل دہل گیا، اک بے چینی اور بے کلی اس کے اعصاب پر طاری ہو گئی تھی اس نے بے خیالی میں ہاتھ ماتھے پر دے مارا تو اکبری جو ابھی تک اس کے قریب کھڑی تھی مچل سی گئی۔

''کیا سر میں درد ہو رہا ہے، میں دبا دوں۔'' وہ تھوڑا سا اس کی طرف سرکی مگر اس کے اتنے سخت انکار پر وہی رک گئی، لیکن دل کے ہاتھوں مجبور دوبارہ آگے بڑھنے کی جسارت کی۔

''میں نے کہا ناں، یہ درد تمہارے دبانے سے ختم نہیں ہو گا۔'' ہلکی سرخی مائل آنکھوں میں غصہ اسے کچھ جتا رہا تھا سمجھا رہا تھا مگر وہ نا سمجھ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

''کوشش کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔''

''لاحاصل کوششیں کچھ فائدہ نہیں دیتیں۔''

''ہر کام فائدے کے لئے نہیں کیا جاتا۔'' وہ بھی بضد تھی اس لئے اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''نہیں کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن میں فائدہ ضروری ہوتا ہے، نقصان ہو جائے تو انسان اپنی ہستی کھو دیتا ہے۔'' وہ اس کی ضد پر زچ ہو گیا اور اپنے تیئں اسے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ فی الحال اس کے جواب پر خاموش ہو گئی لیکن اس کا دل کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہیں تھا، محبت ہوتی ہی ایسی ہے اپنی ذات کے سوائے اسے اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

☆☆☆

گھر میں رہ رہ کر اس کا دل اکتا گیا تھا اس لئے وہ اٹھ کر باہر نکل آیا، لکھنو کی ان قدیم تنگ گلیوں سے گزرتا وہ باہر سڑک پر آ گیا، جہاں دنیا ایک نئے دوراہے پر کھڑی تھی، ہر گزرتا دن انہیں نئے وسوسوں میں دھکیل رہا تھا، اپنے بسے بسائے گھر چھوڑنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتا اور آگے جہاں جانا ہے وہ سب میسر ہو گا کہ نہیں کوئی نہیں جانتا تھا، بنے بنائے معاشرے کو چھوڑ کر نیا معاشرہ تعمیر کرنا مشکل ہوتا ہے۔

لیکن بہت سے لوگ یہ مشکل اٹھانے کے لئے تیار تھے، اک نئے جوش و خروش کو دل میں بسائے وہ اپنے نئے ملک کے لئے ہر مشکل سے ٹکرانے کے لئے تیار تھے اور کچھ تھے جو اک کھٹکا سا دل میں لئے ہوئے تھے، ہچکولے کھاتی کشتی میں سوار تھے۔

اتنے دن بخار میں مبتلا دینے کے بعد وہ اپنے بدن میں کمزوری سی محسوس کر رہا تھا، اس لئے اک چائے والے کی دکان کے آگے رکھے سٹول پر بیٹھ گیا اور اک افراتفری کے عالم میں لوگوں کو ادھر ادھر آتے جاتے دیکھنے لگا۔

لکھنو اپنی آن بان شان کی صدیوں سے سنبھالے ہوئے، یہاں کئی سلطنتیں بنی تباہ ہوئیں لیکن اس کی شان میں فرق نہ آیا مگر آج نجانے کیوں ایسے محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کی آنکھیں نمکین پانیوں کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہیں، وہ کھل کے رونا چاہتا ہے، وہ خود میں مقیم ان لوگوں کو خود سے بچھڑتا کیسے دیکھ سکتا ہے جنہیں صدیوں سے وہ اپنے ساتھ لگائے ہوئے تھا، وہ کیسے ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو جدا کر سکتا تھا جو اس کی گلیوں کی رونق تھے جن سے اس کے دل کا باغ مہکتا تھا، یہ بچے جو اس کے آسمان کے تارے تھے اس کی روشنی تھے۔

یہ لکھنو خود کچھ بھی نہ تھا، اس کے مکینوں نے اپنے اخلاق و اطوار اپنی وضع داری سے اسے اتنا بلند کر دیا کہ دوسرے لوگ ان کے سامنے خود کو چھوٹا محسوس کرنے لگے ان کے اخلاق کو اپنانے کی خواہش کرنے لگے اور وہ بھلا کیسے ان وضع دار لوگوں کو خود سے جدا کر سکتا تھا۔

(باقی اگلے ماہ)

سندس جبیں

تیرویں قسط

ایک قبر وہ ہوتی ہے جو مرنے کے بعد زمین پہ انسان کے لئے کھودی جاتی ہے، ایک قبر وہ ہوتی ہے جو انسان اپنے اعمال کے ہاتھوں خود اپنے لئے خریدتا ہے اور یہ قبر اس کے راستے کی رکاوٹ بن جاتی ہے، وہ مرنے سے پہلے زندہ دفن ہونے کا تجربہ کر لیتا ہے، حبا تیمور بھی اپنے ہاتھوں کھودی اس قبر میں گھٹنوں کے بل جا گری تھی اور باہر نکلنے کا راستہ بھول گئی تھی۔

تیمور احمد اسے لے کر لاہور سے اسلام آباد پہنچے تو بے حد دلگرفتہ اور افسردہ تھے اور ان گزرے مہینوں کے عذاب کے بعد جب اس نے اندر قدم رکھا تو لڑکھڑا گئی تھی۔

کاغذی محبت کے
کاغذی دلاسوں پر
رنگ برنگ خوابوں کے
دیس جانے والوں کو

ناولٹ

یہ پیغام بھی پہنچے
اس نگر کا ہر راہی
وادی محبت سے
لوٹ کے جب آتا ہے
ہنسنا بھول جاتا ہے
پیار جیسے جرم کے
عمر بھر تاوان میں
اپنی روح چھوڑ کر
خواب کے نگر سے بس
جسم ساتھ لاتا ہے

تیمور احمد نے مرینہ کو فون کر کے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ "ان کے پاس ایک سرپرائز ہے۔" وہ بے چاری کب جانتی تھیں کہ یہ کیسا "سرپرائز" تھا اور جب انہوں نے حبا کو دیکھا تو ان کے قدموں تلے زمین نکل گئی تھی، وہ جیسے کسی خلا میں معلق ہو گئیں جہاں نہ ہوا تھی نہ زندگی کے آثار،

اسی کیفیت میں وہ آگے بڑھیں اور حبا کو یوں تھام لیا جیسے وہ کوئی آبگینہ ہو اور پھر سخت متوحش سی ہو کر تیمور کو دیکھنے لگیں۔

"کیا ہوا ہے اسے؟ کیا کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے؟ یہ زخمی کیوں ہے تیمور؟ یہ...... بینڈیج......؟" وہ اب لے کر صوفے پہ بیٹھی تھیں، ازحد پریشانی سے اس کے ماتھے کے بینڈیج کو چھوا، پھر سوجے ہوئے ہونٹ اور رخسار کی خراشوں کو دیکھا اور پھر اس کے ہاتھوں کو جو زخمی تھے، حبا کی آنکھیں بند تھیں اور اس نے سر مرینہ کے شانے پہ رکھا ہوا تھا، تیمور نے تخی سے انہیں دیکھا تھا۔

"اسید نے مارا ہے اسے۔" ان کے انداز میں تھرا دینے والی تخی تھی۔

مرینہ پہ جیسے بجلی گری تھی، وہ فق رنگت لئے انہیں دیکھتی رہ گئیں یوں جیسے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"باقی تفصیلات آپ اس سے جان لیجیے گا۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گئے، مرینہ ناسمجھی کی کیفیت میں بیٹھی رہ گئیں۔

☆☆☆

"مغل ہاؤس" کے در و دیوار میں خاموشی کا راج تھا، دو دن بعد عباس اور سبین کراچی شفٹ ہو رہے تھے، گھر میں اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں، جو کہ تقریباً آخری مراحل میں داخل ہو رہی تھیں، اس رات کومل اور علینہ سبین کی جگہ سب کو دودھ اور چائے پہنچانے کی ذمہ داری نبھا رہی تھیں۔

"میں سب کو دے آئی ہوں علینہ! اب تم یہ کافی بخت بھائی کے کمرے میں پہنچا دو۔" کومل نے ٹرے کیبن میں رکھتے ہوئے کہا۔

"میں؟ نہیں میں نہیں جا رہی پلیز تم ہی دے آؤ نا؟" علینہ نے فوراً انکار کر کے کہا، ابھی وہ پچھلا تجربہ بھولی نہیں تھی۔

"علینہ! پلیز میں تھک گئی ہوں اور بس بخت بھائی کے کمرے تک ہی تو جانا، اوکے میں سونے جا رہی ہوں۔" کومل کہہ کر باہر نکل گئی۔

علینہ تذبذب کی کیفیت کچھ دیر کھڑی رہی، پھر سر جھٹک کر کافی کا مگ اٹھایا اور باہر نکل آئی، لاؤنج کی گھڑی میں وقت دیکھا تو پونے گیارہ ہو رہے تھے، وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

اس کے کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے ایک طویل سانس لے کر خود کو پرسکون کرنا چاہا تھا اور پھر آہستہ سے دروازہ بجایا، کچھ دیر انتظار کیا مگر جواب ندارد، اس نے دوسری بار دستک دینے کی بجائے دروازے کا ہینڈل گھمایا، وہ کھل گیا، علینہ اندر داخل ہو گئی، کمرہ خالی تھا مگر ٹیرس کی سلائیڈنگ ونڈو کھلی ہوئی تھی وہ آگے بڑھ گئی۔

ریلنگ سے کمر لگائے شاہ بخت کی علینہ کی طرف پشت تھی، یکدم وہ اس کی آہٹ محسوس کر کے پلٹا، علینہ کو جھٹکا لگا اس کے چہرے پہ حیرت نظر آئی تھی اور پھر خوف، اس نے ایک نظر شاہ بخت کو دیکھا اور اس کے ہاتھ میں دبے سگریٹ کو، شاہ بخت نے تیزی سے سگریٹ نیچے پھینکا اور بوٹ سے مسل کر ٹیرس کی ریلنگ سے لان میں پھینک دیا اور جب وہ پلٹا تو اس کے تاثرات ازحد بگڑے ہوئے تھے۔

"تم کس کی اجازت سے یہاں آئی ہو؟" وہ ترشی سے بولا تھا، علینہ نے ایک لفظ کہے بغیر کافی ایک طرف پڑے میز پہ رکھی اور واپس مڑنے لگی تھی جب بازو شاہ بخت کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں آ گیا۔

"میرا بازو چھوڑو شاہ بخت۔" اس نے غصے سے کہا۔

"ورنہ کیا کرو گی؟" شاہ بخت کا لہجہ اشتعال دلانے والا تھا۔

"میں تمہارے منہ پہ ایک تھپڑ ماروں گی۔"

اس کا غصہ مزید بڑھا تھا، شاہ بخت نے کچھ کہے بغیر اس کے دونوں بازو اس کی پشت سے پیچھے لے جا کر اپنے دائیں ہاتھ میں اس کے دونوں ہاتھ جکڑ لئے، اس کے نازک ہاتھ شاہ بخت کی مضبوط اور کھردری ہتھیلی میں بری طرح مسلے گئے، وہ تلملا اٹھی تھی، اس نے بے ساختہ خود کو چھڑانے کے لئے مزاحمت کی تھی، شاہ بخت نے بہت محظوظ ہو کر اسے دیکھا۔

"اب کیا کرو گی؟" وہ طنز سے بولا، علینہ کا غصہ فزوں تر ہوتا گیا۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے اس طرح کی گھٹیا حرکتیں کرتے ہوئے۔" وہ پھنکار کر بولی۔

"شٹ اپ، گھٹیا حرکتیں میں نہیں تم کر رہی تھی، میری جاسوسیاں کرتی پھرتی ہو تم۔" وہ غرایا تھا۔

"جسٹ شٹ اپ، میرا دماغ خراب ہے جو میں یہ سب کروں، میری طرف سے تم بھاڑ میں جاؤ، اسموکنگ کرو یا ڈرنکنگ؟ آئی ڈونٹ کیئر۔" وہ تڑپ کے پیچھے ہٹی تھی سردی شدید ہونے کے سبب اس نے گرم شال اوڑھی ہوئی تھی جو کہ خاصی بڑی تھی اس کے پیچھے ہٹنے پہ وہ اس کے پیر میں الجھی اور سر سے اتر کر پیچھے رہ گئی، علینہ کا رنگ دہک اٹھا، بے بسی اور خوف نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"میں کہہ رہی ہوں، مجھے چھوڑو، مجھے جانے دو۔" وہ چلائی تھی۔

شاہ بخت نے دانت پیس کر اسے گھورا تھا اور اسے اندر کی طرف دھکیلا، ایک کندھے پہ اٹکی شال وہیں گر گئی، شاہ بخت نے اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا، ٹیرس اوپن تھا اور بالکل ساتھ عباس کا کمرہ تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ عباس سن لے۔

"میرے سامنے اونچی آواز میں بات مت کرو۔" اس نے وارننگ دی تھی۔

"اچھا...... ورنہ کیا؟ رمشہ بالکل ٹھیک کہتی تھی تم ایک گھٹیا اور بے غیرت انسان ہو جو حیا سے عاری ہے اور......" علینہ نفرت سے کہہ رہی تھی مگر بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی شاہ بخت کا بائیں ہاتھ کا تھپڑ اس کے گال کی خبر لے گیا، علینہ کے حلق سے ایک اضطراری چیخ نکلی تھی اسے لگا جیسے اس کا جبڑا ٹوٹ گیا ہو، وہ بے ساختہ رونے لگی، کیا وہ اس تھپڑ کا بدلہ لے رہا تھا؟ اسی وقت دروازہ کھلا اور دروازے میں عباس کی صورت نظر آئی تھی، شاہ بخت کی دروازے کی طرف پشت تھی جبھی وہ فوری طور پہ دیکھ نہیں سکا تھا، عباس کو دیکھ کر علینہ کا رنگ بدل گیا۔

وہ بلند آواز میں رونے لگی یکلخت شاہ بخت کو عجیب سا احساس ہوا وہ بے ساختہ پلٹا اسے جھٹکا لگا وہاں عباس کو کھڑا پایا تھا اس نے میکانکی انداز میں علینہ کے ہاتھ چھوڑ دیئے، عباس کے چہرے کے تاثرات بڑے عجیب تھے، دکھ، حیرت بے یقینی ثبت تھی وہاں، اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور جلد ہی اسے اپنی مطلوبہ چیز نظر آ گئی تھی، اس نے آگے بڑھ کر ٹیرس کے فرش سے علینہ کی شال اٹھائی اور روتی ہوئی علینہ کو اوڑھا دی اور پھر اسے ساتھ لگا لیا، علینہ کی شرم کے مارے نظریں زمین میں گڑ گئیں، اس کا دل چاہا وہ مر جائے، شاہ بخت کو یکایک معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔

"دیکھو عباس! بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔" وہ تیزی سے بولا، عباس نے ایکدم ہاتھ اٹھا کر اسے روکا، اس کی نظروں کی نفرت بخت کو مار گئی تھی۔

"مجھے وضاحتوں کی ضرورت نہیں۔" اس کا لہجہ بہت اجنبی تھا، وہ علینہ کو اسی طرح ساتھ لگائے وہ آگے بڑھنے لگا تھا جب شاہ بخت تیزی سے ان کے آگے آن کھڑا ہوا، علینہ اسی طرح رو رہی تھی۔

"تم میری بات سنے بغیر نہیں جا سکتے۔" شاہ بخت بے حد مضطرب تھا۔

"کون سی بات سنانا باقی رہ گئی ہے؟" عباس نے اس لمحے بے پناہ ضبط کر کے پوچھا تھا اس سے۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، تم میری بات نہیں سمجھ رہے، تم علینہ سے پوچھ لو۔" وہ تیز تیز بولا۔

"میں تمہیں الو کا پٹھا نظر آتا ہوں کیا میں جانتا نہیں کہ تم کیا کھیل کھیلنا چاہتے تھے۔" عباس ضبط کھو کر پھٹ پڑا تھا، شاہ بخت کا رنگ سرخ ہو گیا۔

"اپنا منہ بند رکھو اور پہلے اس سے پوچھ لو اس کے بعد باقی بکواس کر لینا۔" وہ دھاڑ کر بولا تھا۔

"کیا پوچھوں میں اس سے؟ میں اندھا ہوں مجھے نظر نہیں آتا کیا ہو رہا تھا یہاں پر؟" عباس کے اشتعال میں مزید اضافہ ہوا تھا، یکدم دوڑتے قدموں کی آوازیں آنے لگیں، کھلے دروازے میں ایک ساتھ کئی چہرے نظر آئے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں پر؟" سب سے آگے تایا جان تھے، وہ آگے بڑھ آئے، عباس کے اندر اطمینان اتر آیا، وہ علینہ کو چھوڑ کر الگ ہو گیا۔

"یہ آپ کو شاہ بخت بتائے گا۔" عباس کے انداز میں آگ لگا دینے والی تلخی تھی۔

تایا جان نے تیز نظروں سے شاہ بخت کو دیکھا اور پھر علینہ کو، ان کے چہرے پر تفکر کے سائے گہرے ہو گئے، کمرے میں اس وقت طارق چاچو، نیلم چچی، وقار اور نبیلہ تائی موجود تھیں۔

"وقار! دروازہ بند کر دو۔" احمد مغل نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا تھا، وقار نے فوراً ان کی ہدایت پہ عمل کیا تھا۔

وہ صوفے پہ بیٹھ گئے، ان کی دیکھا دیکھی باقی سب بھی اِدھر اُدھر بیٹھ گئے، شاہ بخت کی تشویش میں اضافہ ہوا تھا۔

"علینہ! اِدھر آؤ بیٹا۔" انہوں نے علینہ کو پکارا، وہ آہستہ سے ان کی طرف بڑھی اور ان کے نزدیک زمین پہ گر گئی، پھر سر ان کے گھٹنوں پہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

(بخت! کیا کر بیٹھے ہو؟) نیلم چچی نے ہول کر سوچا تھا، تایا جان کا ہاتھ علینہ کے سر پہ ٹھہر گیا تھا۔

"کیا ہوا ہے شاہ بخت!" ان کی آواز میں سرد مہری تھی۔

"کچھ بھی نہیں ہوا تایا ابو! عباس کو غلط فہمی ہوئی ہے وہ تو بس ویسے ہی میں......" شاہ بخت نے بے ربطی سے بولنا شروع کیا مگر بات مکمل نہ کر پایا تھا۔

"ہوں...... غلط فہمی؟ عباس کو کیا غلط فہمی ہوئی ہے؟ عباس تم بتاؤ؟" تایا جان اب کے عباس سے مخاطب ہوئے تھے۔

"میں چاہتا ہوں آپ علینہ سے شروع کریں۔" وہ مضطرب تھا۔

"کیوں؟ تم سے کیوں نہیں؟"

"کیونکہ میں نہیں جانتا میرے آنے سے پہلے کیا ہوا تھا؟" اس کا لہجہ مدھم اشتعال لئے ہوئے تھا۔

"ٹھیک...... علینہ...... مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا؟ دیکھو بیٹا روؤ مت، ہم سب تمہارے پاس ہیں، چلو بتاؤ مجھے۔" وہ اس کا سر تھپک رہے تھے، انداز تسلی دینے والا تھا، علینہ کا رونا تھم سا گیا۔

"تایا ابو! میں شاہ بخت کو کافی دینے آئی تھی، میں نے دروازہ بجایا مگر کوئی جواب نہ ملا، مجھے یہی لگا کہ شاہ بخت واش روم میں ہوگا، میں دروازہ کھول کر اندر آ گئی مگر کمرے میں کوئی نہیں تھا، میں آگے آئی تو ٹیرس کا دروازہ کھلا ہوا تھا میں کافی لے کر اِدھر ہی آ گئی۔" اتنا کہہ کر علینہ چپ ہو گئی۔

"پھر کیا ہوا؟" طارق مغل نے بے چینی سے پوچھا، شاہ بخت کے اضطراب میں اضافہ ہو گیا، وہ جانتا تھا کہ وہ کیا بتانے جا رہی تھی اور افشائے راز کا خوف، وہ لب کچل کر رہ گیا، وہ بولنے جا رہی تھی اور وہ اسے روک نہیں سکتا تھا، اقتدار کا وہ تخت جس پہ وہ پچھلے کئی سالوں سے کھڑا تھا اب اس کے پیروں کے نیچے ہل رہا تھا۔

"اس کے بعد کیا ہوا بیٹا؟" تایا جان نے پوچھا۔

"شاہ بخت وہاں کھڑا، سگریٹ پی رہا تھا۔" وہ کہہ رہی تھی۔

شاہ بخت نے لب بھینچ کر اپنے اندر اٹھتے شدید اشتعال پہ قابو پانے کی کوشش کی تھی، وہ جانتا تھا اب تایا جان جو بھی قیامت اٹھائیں گے کم ہو گی، انہیں سگریٹ نوشوں سے شدید نفرت تھی اور اسی وجہ سے ان کا گھرانہ اس لت سے محفوظ تھا مگر اب شاہ بخت کا حشر یقیناً بہت برا ہونے والا تھا، علینہ کے فقرے نے ان پہ جیسے آسمان توڑ ڈالا تھا، وہ بدلے ہوئے رنگ کے ساتھ ششدر سے شاہ بخت کو دیکھتے رہ گئے، وہ نظریں چرا گیا۔

"میں نے کافی کا مگ سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور واپس مڑنے لگی مگر اس نے بازو پکڑ کر روک لیا۔" اس کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔

"اس نے مجھے کہا کہ میں اس کی جاسوسیاں کرتی پھرتی ہوں، میں نے اس سے کہا کہ میرا بازو چھوڑ دو ورنہ میں تمہارے منہ پہ تھپڑ ماروں گی اس نے میرے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے پکڑ لئے میں نے چھڑانے کی کوشش کی مگر میں کامیاب نہیں ہو سکی، میں نے پیچھے ہٹنا چاہا تو میری چادر...... پیر سے الجھ کر اتر گئی، میں نے اس سے دوبارہ کہا کہ مجھے چھوڑ دو مگر اس نے مجھے ٹیرس سے کمرے کی طرف دھکا دیا جس کی وجہ سے میری شال گر گئی، میں بہت ڈر گئی مجھے بہت رونا آیا تھا اور......" وہ پھر بات روک کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی، تایا جان اس کا سر تھپک رہے تھے اور ان کا چہرہ ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔

"تم نے کیا دیکھا عباس؟" انہوں نے علینہ سے مزید کچھ نہیں پوچھا تھا اور عباس سے مخاطب ہوئے تھے۔

"میں اور سبین جاگ رہے تھے، مجھے وہم سا ہوا کہ شاید میں نے علینہ کی آواز سنی ہے مگر اس کا کمرہ تو نیچے تھا اور آواز ٹیرس کی طرف سے آئی تھی میں نے اپنے کمرے کی سلائیڈنگ ونڈو سے پردہ ہٹا کر دیکھا تھا تو شاہ بخت کا ٹیرس خالی تھا میں شاید اپنا وہم جان کر پیچھے ہٹ جاتا مگر مجھے علینہ کے بلند آواز سے بولنے کی آواز آئی، ہاں الفاظ سمجھ نہیں آ سکے تھے، میں سبین کو وہیں چھوڑ کر شاہ بخت کے کمرے کی طرف آ گیا، دروازہ لاک نہیں تھا میں اندر داخل ہوا تو میری عقل ماؤف ہو کر رہ گئی، بہت عجیب منظر دیکھا میں نے، میں نے شاہ بخت کو علینہ کے منہ پر تھپڑ

مارتے دیکھا اور اس نے علینہ کے دونوں ہاتھ موڑ کر جکڑے ہوئے تھے اور اسے دیوار کے ساتھ لگایا ہوا تھا، مجھے دیکھ کر شاہ بخت پیچھے ہٹ گیا، میں نے علینہ کی چادر ڈھونڈ کر اسے اوڑھائی اور اسے لے کر باہر نکلنے لگا، اسی وقت آپ سب لوگ یہاں آگئے۔" عباس بات مکمل کر کے خاموش ہو گیا۔

تایا جان نے عباس کے خاموش ہونے پہ شاہ بخت کو دیکھا۔

"تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟" ان کے اندر میں تپش تھی، شاہ بخت نے بمشکل اعصاب پہ قابو پا کے خود کو بولنے پہ آمادہ کیا۔

"مجھے اچھا لگا کہ علینہ نے آپ کی پوری بات ایمانداری سے بتائی ہے، اگر آپ اس کی بات پوری ہونے دیتے تو یقیناً وہ آپ کو یہ بھی بتا دیتی کہ میں نے اسے تھپڑ کیوں مارا تھا، مجھے اس پہ غصہ تھا، بے حد، بے تحاشا اور آپ جانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ اس نے مجھے گالی دی تھی اور میں کوئی بزدل مرد نہیں ہوں اور نہ ہی اتنے ٹھنڈے دماغ کا، کہ ایک لڑکی سے گالی سن لوں؟" شاید وہ اپنے سرد اور زہریلے لہجے میں اور بھی کچھ کہتا مگر طارق مغل ایک دم سے اٹھ کر اس کے مقابل آگئے۔

"کس بات پہ غصہ آیا تھا تمہیں؟ گالی دینے پہ، اس سے پہلے بھی تم نے رمشہ پہ ہاتھ اٹھایا تھا تب بھی یہی وجہ تھی ہے ناں شاہ بخت!" وہ غرا کر بولے تھے، شاہ بخت نا سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھتا رہا۔

"بحیثیت مرد تمہیں اس بات کا تو احساس ہے کہ تمہیں گالی دی گئی ہے، تو اس بات کا کیوں نہیں کہ آخر تمہیں ہی کیوں دی گئی ہے؟ وقار، ایاز، عباس کو کیوں نہیں؟" ان کا لہجہ مزید خطرناک ہوا تھا۔

وہ بخوبی محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے تخت طاؤس کو اب جھٹکے لگ رہے تھے۔

"چاچو! آپ کیا کر رہے ہیں، پلیز آپ......" وقار اٹھ کر ان کے نزدیک چلے آئے۔

"نہیں وقار! تم بیچ میں مت بولنا۔" ان کا لہجہ اتنا قطعی اور دوٹوک تھا کہ وقار انہیں دیکھ کر رہ گئے۔

"ہاں تو ہاتھ اٹھاؤ مجھ پہ...... مارو مجھے بھی، تم بزدل مرد نہیں ہو ناں؟" طارق ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے، انہوں نے شاہ بخت کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا، وہ لڑکھڑایا۔

"بابا پلیز۔" وہ التجا بولا تھا مگر اس سے طارق کو مزید غصہ آیا تھا۔

"لعنت بھیجتا ہوں میں تمہارے باپ ہونے پہ، تمہیں ذرا سی بھی غیرت نہیں آئی اس معصوم پہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے، کتنے برے انسان ہو تم شاہ بخت!"

"بس کیجئے۔" وہ بلند آواز میں ہاتھ اٹھا کر بولا، طارق کو اس کے انداز نے پاگل سا کر دیا تھا، وہ بے قابو ہو کر آگے بڑھے اور اگلے ہی لمحے دائیں ہاتھ کا بھرپور طمانچہ شاہ بخت کے گال پہ پڑا، نیلم چچی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"میں بس کر دوں؟ تم کیوں نہیں بس کر دیتے؟ ہمارے صبر اور ضبط کا امتحان لینا بند کر دو شاہ بخت، تمہارے نزدیک بس تم اہم ہو، کسی دوسرے کی عزت ہے نہ اہمیت کیوں؟ تمہاری فرعونیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں، کیا چاہیے تمہیں؟ ایسی کیا کمی رہ گئی تھی تمہاری تربیت میں جو اس قسم کی حرکتیں کرتے پھرتے ہو، بولو۔"

انہوں نے ایک اور تھپڑ مارا، شاہ بخت کا رنگ اب زرد پڑ رہا تھا، مگر وہ نظریں زمین پہ گاڑے بالکل خاموش تھا۔

"ہاں تم کیسے بولو گے؟ تمہارے پاس تو جواب ہی نہیں ہے مگر میرے پاس ہے، یہ سب اس لئے کر رہے ہو کہ خود تمہاری کوئی بہن نہیں ہے، ہے نا، جبھی اس قدر بے خوف ہوئے پھرتے ہو، ارے نہ سمجھو اس کو بہن، کزن بھی نہ سمجھو مگر اتنا تو سوچ لو کہ وہ بھی کسی کی بیٹی ہے اس بات کی بھی حیا نہیں آئی تمہیں؟"

وقار نے بے حد مضطرب ہو کر پہلو بدلا، کسی قدر مشکل میں تھے وہ، کچھ کر نہیں سکتے تھے، جبکہ نبیلہ بیگم گم صم سی بیٹھی تھیں، کچھ یہی حال تایا جان کا تھا۔

"میرا دل چاہ رہا ہے دوبارہ تمہاری شکل بھی نہ دیکھوں۔" وہ ہانپ سے گئے تھے، بے ساختہ علینہ کے پاس آ گئے۔

"علینہ! بچی اس کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں، خدا کے لئے اسے معاف کر دو۔" وہ بے حد رنجیدہ تھے، علینہ تڑپ اٹھی۔

"چاچو پلیز۔" وہ پھر رو پڑی۔

علینہ نے ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑ کر شاہ بخت کو دیکھا اور اس کی نگاہ میں بڑی کاٹ تھی۔

"یہ میرا کچھ نہیں لگتا چاچو، میرا اس کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں کہہ کے وہاں سے اٹھی اور چادر تھام کر بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی، کمرے میں مرگ کی سی خاموشی تھی اور پھر وہ ہاں وہی مغرور شہزادہ "شاہ بخت" کسی معزول شہزادے کی طرح گھٹنوں کے بل زمین پہ گر گیا، اس کے دونوں ہاتھ سر پہ تھے، وقار تڑپ کر اس کی طرف بڑھے تھے۔

"وقار رات بہت کافی ہو گئی ہے، سونے کے لئے چلنا چاہیے۔" تایا جان کی سرد آواز نے انہیں روک دیا، وہ بے بس سے ہو گئے۔

"چلو۔" انہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا، ایک ایک کر کے سب باہر نکلتے چلے گئے اور پھر دروازہ بند ہو گیا۔

وہ وہیں تھا، گھٹنوں کے بل گرا سر دونوں ہاتھوں سے تھامے، آج انہونی ہوئی تھی، آج کرامت ہوئی تھی، آج وہ ہوا تھا جس کی کسی کو توقع تھی نہ امید۔

آج شاہ بخت مغل کو اس کے تخت طاؤس سے پورے وقار اور شان سے منہ کے بل گرا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

"تم سچ کہہ رہے ہو حیدر، حیرت انگیز۔" ممی نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔

"ستارا ویسے تو مجھے بھی اچھی لگی ہے مگر اس مسئلے کے بعد مصعب کے لئے فیصلہ واقعی مشکل ہو گا۔" ان کا اشارہ کس طرف تھا وہ فوراً جان گیا۔

"کوئی مشکل نہیں ممی! مصعب کون سا ٹیپیکل پاکستانی مرد ہے جسے اس بات سے فرق پڑتا ہو کہ ستارا Divorced ہیں یا Vidow فضول بات ہے، اگر اتنی مکمل زندگی گزارنے کے بعد انہیں اب ستارا پسند آئی ہیں تو مجھے امید ہے کہ یہ پسندیدگی معمولی نوعیت کی نہیں ہو گی اور وہ اس بات سے یقیناً متاثر نہیں ہوں گے۔" حیدر نے کہا۔

"ہوں مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے، بہرحال انتظار کرو کہ مصعب کیا فیصلہ کرتا ہے؟" انہوں نے کہا۔

"پہلے میں نے سوچا تھا کہ انہیں خود کال کر

لوں، پھر اس خیال کو رد کر دیا، کہ اس کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے وہ ڈسٹرب ہوں اور میرا فون انہیں مزید پریشان کر دے، بس جبھی میں خود ان کی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ بولا، وہ سر ہلا کر اٹھ گئیں، وہ چند لمحے بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔

"علشبہ ایک کپ چائے تو پلا دو۔" اس نے کچن میں مصروف علشبہ کو آواز لگائی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور اسی شام جب وہ کمپیوٹر پہ بہت مصروف تھا، معصب کی کال آ گئی۔

"آپ کیسے ہیں بھائی؟" حیدر نے فوراً کال پک کی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو حیدر؟" معصب نے پوچھا، اس کے لہجے میں کیا تھا حیدر جان نہیں سکا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔" حیدر نے کہا۔

"کیا کر رہے ہو؟" معصب نے پوچھا۔

"کمپیوٹر پہ بیٹھا ہوں، ویک اینڈ کی واحد مصروفیت۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"مصروف تو نہیں ہو؟ میں کچھ دیر تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔" معصب کا لہجہ مدھم گزارشی تھا۔

"اتنا بھی مصروف نہیں ہوں کہ آپ سے بات ہی نہ کر سکوں۔"

"حیدر! میں بہت الجھن میں ہوں۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں مگر مجھے لگا تھا کہ آپ کو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" وہ ریفرنس بوجھ گیا تھا جبھی صاف گوئی سے بولا تھا۔

"غلط سمجھے ہو، مجھے پاپا کے ری ایکشن کا ڈر ہے۔" وہ فوراً ٹوک گیا۔

"ماموں اتنے کنزرویٹو نہیں ہو سکتے۔" وہ بے ساختہ بولا۔

"کنزرویٹو؟ نہیں وہ کنزرویٹو نہیں ہیں اور مجھے نہیں لگتا انہیں اس بات سے کوئی فرق پڑے گا۔" معصب نے بھی بے ساختہ کہا۔

"تو کیا آپ کو فرق پڑتا ہے؟" حیدر نے پوچھا، معصب جواباً خاموش ہو گیا اور یہ خاموشی اتنی لمبی ہو گی کہ حیدر کو پکارنا پڑ گیا۔

"بھائی؟"

"ہوں۔" اس کی ہلکی سی ہوں نے حیدر کو احساس دلایا کہ فون منقطع نہیں ہوا تھا۔

"تو پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟" حیدر نے اس بار محتاط انداز میں پوچھا۔

"بہت زیادہ سوچنے کا کیا فائدہ ہوتا مجھے جبکہ کم سوچنے کے بعد بھی نتیجہ وہی نکلنا تھا، آف کورس میں اسے واقعی پارٹنر بنانا چاہتا ہوں اور مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ Divorced ہے مگر پاپا......" وہ روانی سے بولتا رک گیا۔

"کیا آپ کا مطلب ہے ماموں کوئی ایشو کھڑا کریں گے؟ ناممکن وہ اتنے لبرل ہیں، مجھے نہیں لگتا ایسا کچھ کریں گے وہ۔" حیدر نے فوراً اسے رد کر دیا۔

"ہمارا یہ لبرل ازم اور مساوات کی علمبرداری صرف ملک سے باہر تک چلتی ہے حیدر، پاکستان میں داخل ہو کر پاپا صرف سید زادہ صاحب رہ جاتے ہیں۔"

"اوہ آپ کا مطلب ہے ماموں کو کاسٹ پرابلم ہو گا۔" حیدر فوراً بولا۔

"نہیں۔"

"تو پھر۔" حیدر اس بار قدرے جھلایا۔

"تم جانتے ہو پاپا اسٹیٹس کانشس ہیں۔" معصب نے کہا۔

"اوہ نو، تو یہ بات ہے، مگر ستارا کی فیملی ایسی بھی گری پڑی نہیں ہے۔" حیدر کو نا معلوم کیوں برا لگا تھا۔

"میں اپنی بات کب کر رہا ہوں۔" معصب اس کا لہجہ محسوس کر کے فوراً وضاحت دینے لگا۔

"آپ نے ماموں سے بات کی؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تو فضول بات ہے، آپ مفروضوں پہ بات کر رہے ہیں، آپ پہلے ان سے ڈسکس تو کر لیں، ان کی رائے لیں، ان کو قائل کرنے کی کوشش کریں اگر وہ نہ مانے تو پھر دیکھیں گے کہ کیا ہو سکتا ہے۔" حیدر نے اس بار قدرے ہلکا پھلکا ہو کر کہا۔

"نہیں میں بات نہیں کروں گا، تم اور پھپھو کرو گے۔" معصب نے اس بار اطمینان سے کہا۔

"میں اور ممی کریں گے لیکن کیوں؟" حیدر حیران ہوا تھا۔

"ہاں پھپھو یہی ظاہر کریں گی کہ ستارا انہیں میرے لئے پسند آئی ہے اور وہ پاپا کو منائیں گی اور تم، تم ذرا ستارا کی دو چار خوبیاں بتا دینا۔" اس نے ڈکٹیشن دی، حیدر ہنس پڑا۔

"اچھا ٹھیک ہے جناب، بات کرتا ہوں میں ممی سے اور آپ کی ساری اسکیم بتاتا ہوں پھر جو بھی ڈیسائڈ ہوا آپ کو بتا دوں گا۔"

"زیادہ غور و فکر والی تو بات ہی نہیں، ہیڈ لائن میں تمہیں دے چکا ہوں، باقی تفصیلات تم اپنی مرضی کی طے کر لو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" اس بار معصب ہنسا تھا، حیدر نے مطمئن ہو کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

مرینہ خانم کمرے میں داخل ہوئیں تو وہاں گہرا اندھیرا تھا، انہوں نے لائٹ جلائی تو انہیں عجیب سا احساس ہوا، حبا کمرے میں تاریکی کیے آرام دہ کرسی پہ جھول رہی تھی، اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"حبا اتنے اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو بیٹا، تمہیں تو اندھیرا کبھی اچھا نہیں لگا۔" وہ پیار سے بولیں۔

حبا نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا، اس کی آنکھوں میں بے تحاشا وحشت تھی، مرینہ کو اس سے خوف محسوس ہوا، یہ حبا کی آنکھیں نہیں تھیں، اس کی آنکھیں تو بڑی روشن چمکدار تھیں، جن میں زندگی دھڑکتی تھی، جبکہ یہ آنکھیں وہ نہیں تھیں، یہ تو قبریں تھیں، جن میں موت تھی اور خواب، ارمان، یقین، محبت، وفا، مان اور زندگی کے لاشے دفن تھے، یہ آنکھیں قبرستان تھیں اور اس کو وجود کھنڈر۔

"وہ کہتا تھا دوسروں کی زندگیاں تاریک کرنے والوں کا روشنی پہ کوئی حق نہیں، وہ سچ کہتا تھا۔" اس کے حلق سے سرسراتی آواز نکلی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو حبا؟" وہ الجھ گئیں۔

"روشنی بجھا دیجئے، یہ میری آنکھوں میں چبھتی ہے۔" اس نے پھر سے آنکھیں بند کر لیں۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں، کتنا بدل گئی ہو دیکھو جب سے آئی ہو نہ ڈھنگ سے کھانا کھایا ہے اور نہ کمرے سے نکلتی ہو، تین دن ہو گئے تمہیں آئے ہوئے بیٹا بس کرو، اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی، اسید سے کیا جھگڑا ہوا وہ بھی نہیں بتایا، مجھے اس طرح کیوں پریشان کر رہی ہو حبا۔" وہ پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیر رہی تھیں۔

"آپ پریشان مت ہوں، بس مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔" وہ بدستور اسی طرح بیٹھی رہی۔

"حبا مجھے اس طرح تنگ مت کرو، تمہارے اور اسید کے درمیان جو بھی جھگڑا ہے

اسے یہاں بلا لیتے ہیں پھر مل بیٹھ کر حل کر لینا، اتنی ناراضگی اچھی نہیں ہوتی، شادی ہو گئی تم دونوں کی، کوئی کھیل نہیں گڈے گڑیا کا، سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹا چلو اٹھو، آؤ لان میں چلیں دیکھو کتنی پیاری دھوپ نکلی ہے، وہاں بیٹھتے ہیں چائے پیتے ہیں آؤ نا۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانا چاہا، وہ چند لمحے اپنے ہاتھ کو ان کے ہاتھوں میں دبا دیکھتی رہی، اس کا کمزور، سانولا اور پتلا ہاتھ مرینہ کے سفید خوبصورت اور نرم ہاتھ میں تھا، اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے نکال لیا۔

"مجھے دھوپ اچھی نہیں لگتی اور چائے پینے کی عادت نہیں رہی۔" وہ کہہ کر اٹھی اور مرینہ کی طرف دیکھے بغیر باتھ روم میں بند ہو گئی۔

مرینہ کے لئے اس کا رویہ بہت صدماتی تھا، وہ کبھی بھی توقع نہیں کر سکتی تھیں کہ حبا ان سے اس طرح پیش آ سکتی تھی اور سب سے بڑھ کر اس کی بدلی بلکہ بگڑی ہوئی عادتیں، وہ گم صم سی رہ گئی تھیں، وہ جانتی تھیں کہ حبا اور اسید کے درمیان یہ کوئی پہلا جھگڑا نہیں تھا وہ اس سے پہلے بھی ہزاروں بار جھگڑا کر چکے تھے جن میں کچھ جھگڑے تو خاصے سنجیدہ قسم کے تھے مگر اس کے باوجود بھی وہ ایک دوسرے سے مکمل لاتعلق نہیں ہو پاتے تھے اور اب تو وہ ایک مضبوط تعلق میں بندھ گئے تھے، کتنی حیرت کی بات تھی کہ اب اسید اس سے یوں لاتعلق ہو چکا تھا، وہ کتنی کمزور ہو گئی تھی، کتنا گر گئی تھی اس کی صحت، وہ بے حد فکر مند تھیں، اس کی کلائی کا زخم اب بہتر تھا مگر حقیقت کیا تھی وہ ابھی تک لاعلم ہی تھیں نہ تو تیمور احمد نے انہیں کچھ بتایا تھا اور نہ ہی حبا کچھ بتانے پہ آمادہ تھی، وہ بھی فی الوقت حبا کو سنبھلنے کا موقع دینا چاہ رہی تھیں، جبھی خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

حبا آئینے کے سامنے کھڑی تھی، آئینہ اسے وہ دکھا رہا تھا جو وہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی، اس کا اصل چہرہ تھا وہاں اور کتنا بھیانک تھا، وہ گم صم خود کو دیکھ رہی تھی، وہاں وہ لڑکی تھی جو ٹھکرائی اور روندی ہوئی تھی۔

"تھوکی ہوئی عورت۔" اس نے خود کے لئے ایک بہتر لفظ ڈھونڈا تھا اور اسے اس سے بہتر اور کچھ نہ لگا تھا۔

محسوس کر کے دیکھتے
دل میں اتر کے دیکھتے
تم ساتھ جی کے دیکھتے
تم ساتھ مر کے دیکھتے
نہ یہ جیت ہے نہ یہ ہار ہے
یہ کیسا وصل یار ہے
وصل یا اذیت ہے
وصل یا ندامت ہے
یہ وصل تو رقابت ہے
یہ وصل ہی قیامت ہے
میرا درد ہی میرا پیار ہے
یہ کیسا وصل یار ہے

وہ میکانکی انداز میں منہ پہ پانی کے چھینٹے مارتی گئی، کچھ دیر بعد اس نے چہرہ آئینے میں دوبارہ دیکھا، سب کچھ ویسا ہی تھا، اس کی گڑھوں میں دھنسی آنکھیں اسی طرح خالی اور وحشت ناک تھیں، اس کے ابھرے ہونٹ پہ زخم کا کھرنڈ بھی اتنا ہی بدصورت تھا، اس کے پچکے گال بھی اسی طرح سے موجود تھے، اس کا چہرہ اتنا ہی بھیانک اور بدصورت تھا جتنا کہ اسید اسے بتاتا تھا، یا شاید اس سے بھی زیادہ۔

خود سے نفرت کا پہلا بیج پھوٹا تھا دل میں، اسے اپنی شکل سے نفرت ہوئی تھی، زہر لگا تھا اپنا

آپ خود کو "مجسم بدصورتی" اسے اپنے لئے ایک اور لفظ یاد آیا۔

"ایک وقت آئے گا سب لوگ تم پہ تھوک دیں گے۔" اسید کی زہریلی سرگوشی اس کے گرد لہرائی تھی، اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لئے۔

"کیوں کی میں نے وجود کی چاہ؟ کیوں میں نے خوبصورتی کو معیار بنا لیا تھا؟" اس نے وحشت کے عالم میں آئینے میں دیکھا۔

"کوئی اور مجھ پہ کیا تھوکے گا اسید، میں خود اپنے آپ پہ تھوکتی ہوں۔" اس نے آئینے پہ تھوک دیا، پھر بے جان سے انداز میں تیز رفتار تھا یا اس کے آنسو، وہ نہیں جانتی تھی۔

"کیوں بنایا مجھے ایسا، کیا قصور تھا میرا، کیوں بدصورتی میرے چہرے پہ مل دی، کیوں میرا ظاہر خوبصورت نہ بنایا تم نے اور اگر مجھے یہ سب نہیں دینا تھا تو شعور کیوں دیا، کیوں احساس کا عذاب میرے سر پہ ڈال دیا، کیوں مجھے بے حس نہیں بنایا، مجھے جاہل کیوں نہ رہنے دیا، کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟ اگر میرا مقدر صرف ذلت و رسوائی ہی تھا تو مجھے عزت کا ذائقہ کیوں چکھایا، مجھے ذلیل ہی پیدا کیا ہوتا؟ اگر میرے خوابوں کی تعبیریں ہمیشہ نامکمل اور تاریک رہنا تھیں تو مجھے خواب دیکھنے والی آنکھیں کیوں نوازیں تم نے؟ مجھے تاروں بھرا آسمان کیوں دیا، جب میری قسمت کے آسمان پہ صرف محرومی اور تاریکی تھی؟ مجھے روشنیوں کا مسافر کیوں بنایا جب میری تقدیر میں اندھیرے تھے؟"

"اللہ!" وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"تو میرے ساتھ بات کیوں نہیں کرتا، مجھے میرے سوالوں کے جواب کون دے گا؟"

"وہ" جو مساوات کا علمبردار بنا پھرتا تھا، مجھے غلیظ گالیاں دیتا ہے، مجھے نجس اور ناپاک کہتا ہے، مجھ سے نفرت کرتا ہے، میں بے بس ہوں، نہ اسے مجھ پہ رحم آتا ہے نہ تجھے، کیونکہ تو بھی تو خاموشی سے سب میرے ساتھ ہوتا دیکھتا رہا، وہ مجھے بے جان کٹھ پتلی سمجھ کے توڑتا موڑتا رہا، مجھے گالیاں دیتا تھا، مجھے بدترین تشدد کا نشانہ بناتا رہا اور تو...... تو نے اس کے دل میں میرے لئے رحم نہیں ڈالا کیوں؟ ذرا سا تو ترس کھا لیتا مجھ پہ، مجھے جواب چاہیے، ورنہ میں بھی اس کی بات پہ یقین کر لوں گی، وہ کہتا ہے تو مجھ سے نفرت کرتا ہے، میں ماننے پہ مجبور ہو جاؤں گی۔" وہ تڑپ رہی تھی، جواب ایک گہری خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

☆☆☆

تین دن گزر چکے تھے، کل ہی سبین اور عباس کراچی روانہ ہو گئے تھے اور باوجود شدید خواہش کے عباس کو اس معاملے میں خاصی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ شاہ بخت اس سے ملا نہیں تھا، وہ اس کے نمبر پہ کالز کرتا رہا مگر وہ مسلسل آف جا رہا تھا، آفس سے بھی وہ غائب تھا، وہ بہت بجھے دل کے ساتھ جانے سے پہلے گھر میں پھرتا رہا، مگر ایک اور حیرت انگیز واقعہ ہوا تھا۔

وہ اور سبین رات کو سونے کے لئے کمرے میں آئے تو دروازہ پہ دستک ہوئی، عباس اٹھ کر آیا اور دروازہ کھول دیا، اگلے ہی لمحے اسے چونکنا پڑا، وہاں ایاز کھڑا تھا، عباس کے چہرے پہ کبیدگی آ گئی، اس نے فوراً دروازہ بند کرنا چاہا مگر ایاز نے اپنا پیر رکھ دیا۔

"بات کرنی ہے تم سے۔" ایاز نے کہا۔

"مگر مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔" اس نے دوٹوک کہا، اس کے لہجے نے ایاز کو ٹھٹکایا، وہ

اسے کس طرح مخاطب کر رہا تھا۔

"تمیز سے بات کرو اور تمہیں میری بات سننا ہو گی۔" ایاز نے اس کا کندھا تھاما، انداز خشونت بھرا تھا۔

عباس جواب دینے کی بجائے اسے گھورتا رہا، چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو نظروں میں تولتے رہے پھر عباس نے ایک طویل سانس لے کر دروازے کا ہینڈل چھوڑا اور ایک طرف ہٹ گیا، ایاز اندر آ گیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا، بیڈ پہ بیٹھی سبین کے تاثرات بھی خاصے بگڑ گئے تھے، وہ تیزی سے ٹانگیں بیڈ سے نیچے لٹکا کر اٹھی اور قریب تھا کہ وہ کمرے سے نکل جاتی جب ایاز کی آواز نے اسے روکا۔

"ایک منٹ سبین، کدھر جا رہی ہو تم؟ مجھے تم دونوں سے بات کرنی ہے ادھر ہی رکو۔" اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جس نے سبین کے بڑھتے قدم تھما دیئے تھے، اس نے الجھن بھری نظروں سے عباس کو دیکھا تھا، وہ بھی ایاز کو ہی دیکھ رہا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" ایاز نے خاصے تحکمانہ لہجے میں کہا، عباس چند لمحوں کے توقف کے بعد بیڈ کے کونے پہ ٹک گیا، جبکہ وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"سبین بیٹھ جاؤ۔" اس بار ایاز کا لہجہ نسبتاً دھیما تھا۔

سبین نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر عباس کو دیکھا جو اس کی طرف متوجہ نہیں تھا پھر نا چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گئی۔

"تم مجھ سے کس بات پہ ناراض ہو عباس؟" ایاز نے پوچھا، عباس کے ماتھے پہ شکن آ گئی اس نے کرخت تاثرات سے انہیں گھورا۔

"آپ جانتے ہیں۔" اس بار اس کا انداز تخاطب قدرے سنبھلا ہوا تھا۔

"نہیں میں نہیں جانتا، تم مجھے بتاؤ۔" اس نے چیلنجگ انداز میں کہا۔

"آپ کو لگتا ہے سبین کا معاملہ اتنا چھوٹا تھا کہ میں اسے بھلا دوں؟" عباس پھٹ پڑا، ایاز نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا تھا۔

"رشتوں کے ساتھ انصاف کرنا سیکھو عباس، تم مجھ سے اس لئے قطع تعلق کیے ہوئے ہو کیونکہ میں نے اسے چھوڑ دیا، اگر میں اسے ساتھ رکھتا، تو تب تم خوش رہتے مگر ہم دونوں کا کیا، میں اس سے جھگڑتا، اسے برا بھلا کہتا، اسکے ساتھ بدتر سلوک کرتا تو کیا تب بھی تم خوش رہتے، نہیں بالکل نہیں، تم مجھے ایک برا انسان سمجھتے اور میری شکل بھی دیکھنا پسند نہ کرتے اور فرض کرو میں اس سے شادی کر کے نیویارک سے واپس ہی نہ آتا، تب تم کیا کر لیتے؟ حقیقت پسند بن کر سوچو عباس ہر شخص کی زندگی میں اس کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں اپنی ویلیوز اور Norms ہوتی ہیں اور کم از کم میرے جیسا آدمی ایک ان چاہے رشتے کو نبھا نہیں سکتا تھا، بجائے اس کے کہ میں ساری عمر کا روگ اسے لگاتا میں نے اسے چھوڑ دیا، ایک بہتر فیصلہ کیا۔" وہ مسلسل بول رہا تھا عباس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، ہمیشہ کی طرح وہ ہر بات کا جواب ہر دلیل اپنی جیب میں لئے ہوئے پھر رہا تھا۔

"مجھ سے تمہاری ناراضی میرے لئے بہت حیران کن ہے اور کسی حد تک احمقانہ بھی، ایک بات یاد رکھو عباس، میں صرف اپنے ماں باپ اور سبین کو جواب دہ ہوں تمہیں نہیں، تم مجھ سے کس بنا پر ناراض ہو، میں تمہیں یہ نہیں کہہ رہا کہ تم خود کو میری جگہ پہ رکھ کر سوچو، کیونکہ ایسا ممکن ہی نہیں ہم دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، تم میں لچک ہے مجھ میں نہیں ہے، تم زندگی کو کمپرومائز کر کے گزار سکتے ہو، میں نہیں اور ویسے بھی زندگی ہر شخص کے احساسات کا مختلف تجربہ ہے، ایک ہی چیز کے بارے میں سو لوگوں کی رائے لو گے تو وہ ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہو گی، ورنہ پوچھ تو تم سے میں بھی یہ سکتا ہوں کہ آخر تم نے سبین سے شادی کیوں کی، لیکن میں پوچھوں گا نہیں، تم دونوں خوش ہو میرے لئے کافی ہے مجھے سوال کرنے کی عادت نہیں، نہ ہی میں ہمیشہ کے لئے یہاں رہنے آیا ہوں اور نہ ہی تم لوگوں کی زندگی میں دخل اندازی کرنے، چند دن مزید یہاں ہوں پھر چلا جاؤں گا مگر تمہاری ناراضگی میرے لئے تکلیف دہ ہے عباس، تم میرے بھائی ہو، مجھے غلط سمجھتے ہو تو ضرور سمجھو مگر اپنے اندر اتنا حوصلہ بھی پیدا کرو کہ کسی دوسرے کا نظریہ جان سکو، امید ہے بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی، مختصراً اتنا جان لو کہ میں سبین کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا، جبھی اسے سہولت سے آزاد کر دیا اور اس کا حق مجھے میرا مذہب دیتا ہے، تم خدائی فوجدار مت بنو چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا، عباس لاجواب ہو گیا تھا، وہ دونوں بھی کھڑے ہو گئے، عباس خاموش رہا تھا مگر سبین نہیں۔

"آپ واقعی بہت انصاف پسند اور اعلیٰ سوچ کے حامل ہیں ایاز، آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے لئے اتنا بولڈ اسٹیپ لیا۔" سبین کا لہجہ مستحکم تھا، عباس اور ایاز نے بیک وقت چونک کر اسے دیکھا۔

"خوشی ہوئی کہ تم نے میری بات سمجھ لی۔" ایاز نے کہا اور عباس کے قریب آ گیا۔

"زندگی کو فیئر اینڈ سوکیئر طریقے سے گزارنا سیکھو عباس، ایک رشتے کو لے کر اتنا ٹچی اور پوزیسو ہو جانا کہ باقی سارے لوگ نظر انداز ہو جائیں کچھ ٹھیک نہیں ہے، ہم پر صرف ہمارا اپنا نہیں، دوسروں کا بھی حق ہوتا ہے میرے بھائی۔" ایاز نے گھرے لہجے میں کہا، عباس چند لمحے خاموش رہا، پھر پیش قدمی کر کے آگے بڑھا اور ایاز کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر دھیمے سے بولا تھا۔

"آئم سوری بھائی۔" وہ بے حد شرمندہ تھا، ایاز نے اسے ساتھ لگا لیا۔

"اٹس او کے یار، ایک غلط فہمی تھی دور ہو گئی بات ختم۔" ایاز نے اس کا کندھا تھپکا۔

"او کے اب تم لوگ آرام کرو۔" وہ باہر نکل گیا، سبین اور عباس کے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی تھی اور اگلی صبح وہ کراچی روانہ ہو گئے مگر عباس کے لئے اس بات کی تکلیف کم نہیں تھی کہ کہاں تو شاہ بخت اس سے اتنا ناراض ہوا تھا کہ وہ کراچی جا رہا ہے اور کہاں وہ اس کو شکل دکھانے کا روادار بھی نہ تھا، اسے ملے بغیر کراچی آنے کا عباس کو بے حد قلق تھا۔

☆☆☆

"اگر آپ مجھے کچھ نہیں بتائیں گے تو مجھے کیسے پتا چلے گا تیمور، آخر ہوا کیا ہے، حبا بھی چپ سادھے بیٹھی ہے، مجھے بتائیں میں کیا کروں، آخر آپ اسید کو کیوں نہیں بلاتے آپ تو اس سے مل کر آئے ہیں اسے بلائیں یہاں پر، ہم اس سے بات تو کریں، مسئلہ حل کرنے سے ہی ختم ہو گا، ایسے تو نہیں ہو گا۔" مرینہ آج کافی دنوں کے انتظار کے بعد آخر بولنے پہ مجبور ہو گئیں کہ وہ دونوں باپ بیٹی تو چپ کا روزہ رکھ بیٹھے تھے اور کچھ بتانے پہ آمادہ نہ تھے۔

"وہ کہیں نہیں جائے گی نہ ہی اسے کوئی لینے آئے گا، آپ یوں سمجھیں کہ وہ کہیں گئی ہی نہیں تھی۔" تیمور احمد نے مختصر سی بات کر کے

موضوع ہی ختم کر دیا، مرینہ نے دہل کر انہیں دیکھا۔
''کیا مطلب ہے آپ کا؟ اس کی شادی ہو چکی ہے تیمور۔'' انہوں نے جیسے یاد دلایا۔
''بھول جائیں اسے۔'' وہ بے نیازی سے بولے۔
''کیا مطلب بھول جاؤں؟ کیسے بھول جاؤں؟ نکاح ہوا ہے دونوں کا۔'' وہ بوکھلا گئیں۔
''میں نے کہا نہ بھول جائیں کہ ان چار مہینوں میں کچھ ہوا تھا، وہ اب یہیں رہے گی۔'' وہ اس بار سختی سے بولے، مرینہ کے اندر کوئی بھاری درد آلود شے کلبلائی تھی۔
''تو گویا بس میرے بیٹے کو نکالنا مقصود تھا۔'' انہوں نے گہری اذیت سے سوچا تھا، پھر خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئیں۔
اگلی صبح انہوں نے حیا کو دیکھا جو کہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔
''حیا!'' انہوں نے پکارا۔
''جی!'' وہ مڑے بغیر بولی تھی۔
''تیمور بتا رہے تھے کہ اب تم یہیں رہ گی، واپس نہیں جاؤ گی، وہ چاہ رہے ہیں تم دوبارہ سے کالج جوائن کر لو، بات کی ہے انہوں نے تمہارے پرنسپل صاحب سے، وہ پریقین ہیں کہ تم کور کر لو گی، تم اپنا مائنڈ میک اپ کر لو، پرسوں سے تمہیں کالج جانا ہے، میں کل ملازمہ کو بھجوا دوں گی وہ تمہارے ساتھ مل کر تمہاری چیزیں تیار کروا دے گی۔'' وہ مختصر اور بے تاثر لہجے میں بات مکمل کرنے کے بعد اس کے تاثرات اور جواب جانے بغیر باہر نکل گئیں۔
''کالج؟'' اس کے اندر پھیلی ویرانی اور سناٹے میں یہ لفظ ایک کراہ کی صورت گونجا تھا، اذیت سے اس کا رواں رواں جکڑا گیا، وہ بے دم سی ہو کر کھڑکی کے پٹ سے لگ گئی، اس کی بے خواب آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے اور درازوں سے بھرا دل کسی آندھی کی زد میں آ کر ہچکولے کھانے لگا۔
''کیا اب بھی کوئی خواب میرا رستہ دیکھ رہا ہے؟'' پھر وہ میکانکی انداز میں نفی میں سر ہلانے لگی تھی، الٹے ہاتھ سے آنکھیں صاف کیں تو ہاتھ کی پشت بھیگ گئی۔
''مجھ جیسے لوگ جو دوسروں کی آنکھوں کو بے خواب کر دیں، انہیں خواب دیکھنے کا کوئی حق نہیں۔'' اس نے خود کلامی کی تھی۔
''مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا میں اپنے لئے کوئی خواب دیکھوں، دوسروں کی راہ کھوٹی کر کے میں کیسے منزل پہ جا سکتی ہوں، مجھے کوئی اختیار نہیں میں زندگی میں کچھ حاصل کر سکوں اور ویسے بھی میں کتنی بھی ڈگریاں حاصل کر لوں، رہوں گی تو ایسی ہی نا، بدصورت اور بدکردار۔'' وہ نفرت سے بڑبڑا رہی تھی، اس کی منفی سوچ پہلے سے زیادہ خطرناک ہو رہی تھی، اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا، اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھاما اور کھڑے قد سے لہرا کر نیچے گری تھی اور پھر کالج جانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔
اسی دوپہر جبکہ وہ دو گھنٹوں کی بے ہوشی کے بعد ہوش میں آئی تو ڈاکٹر ثمرین نے مرینہ کو بتایا تھا۔
"Marina! you are going to be grand mother"

☆☆☆

اس نے ویٹرز کو ڈشز ٹیبل پہ سجاتے دیکھ کر حیرت سے سوچا تھا کہ اس نے کل رات سے کھانا نہیں کھایا تھا، ورنہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔
اس نے کھانا شروع کیا تھا، موبائل اس

نے اپنے سامنے میز پہ رکھ لیا تھا، اس کا ذہن پھر سے گھر کی طرف الجھا تھا، اس نے تیزی سے سر جھٹکا تھا، محبت، اعتماد، یقین، مان، ایک پل میں سب کچھ بھک سے اڑ گیا تھا، اس کے اندر تلخی اتر رہی تھی اس نے چمچ پلیٹ میں رکھتے ہوئے پانی کا گلاس اٹھا لیا، ایک گھونٹ لیتے ہوئے اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور یکلخت ٹھٹک گیا اسے وہم ہوا اس نے گلاس ایک طرف رکھ کر دوبارہ دیکھا، دائیں طرف کے آخری میز پہ بیٹھا وہ شخص بلاشبہ وہی تھا، اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی موجود تھا جس کی اس کی طرف پشت تھی۔
''طلال بن معصب۔'' اس نے حیرت سے آنکھیں ملتے دوبارہ اسے دیکھا۔
''یہ پاکستان کب آیا؟ اور اس نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟'' اس نے سوچا، وہ دونوں بھی کھانا کھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ باتیں کر رہے تھے، اس نے کچھ سوچ کر سامنے پڑا موبائل اٹھایا اور اس کا نمبر ملایا، بیل جا رہی تھی اس نے نظر معصب پہ جماتے ہوئے دیکھا، وہ یکدم چونکا تھا پھر اس نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر دیکھا اور پھر کچھ مزید حیران ہوا تھا، مگر پھر اس نے یکدم کال ڈسکنکٹ کر دی اور موبائل لاپرواہی سے اپنے سامنے ٹیبل پہ ڈال دیا، شاہ بخت کو جھٹکا لگا تھا، اس کو یقین نہیں آیا تھا طلال بن معصب نے اس کی کال کاٹ دی تھی، وہ بے یقین تھا، ایسا کیسے ہو سکتا تھا؟ آخر ساری دنیا یکدم اس کے خلاف کیوں ہو گئی تھی، اس نے کان کے ساتھ لگے فون میں سے آتی آواز کو حیرت اور بے چینی سے سنا جو کہ کہہ رہی تھی کہ اس کا مطلوبہ نمبر بند ہے، طلال بن معصب نے صرف کال ہی نہیں رد کی تھی بلکہ موبائل ہی بند کر دیا تھا کہ وہ دوبارہ کال ہی نہ کر سکے، اس نے ڈھیلے ہاتھوں سے موبائل کان سے ہٹا لیا، ایک لمحے کو تو اس کا دل چاہا کہ وہ سیدھا اٹھ کر جائے اور طلال بن معصب کے منہ پر ایک تھپڑ دے مارے، مگر اگلے ہی پل وہ اس سوچ پر خفیف سا ہو کر رہ گیا اگر اس باپ کے ہاتھوں تھپڑ پڑے تھے تو یقیناً اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنا بدلہ اور جلن یوں دوسروں پہ نکالتا پھرے، اسے اپنی سوچ پہ افسوس ہوا، اس نے سامنے دوبارہ دیکھا، طلال اب اس شخص کے دونوں ہاتھ تھامے کچھ کہہ رہا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات بڑے گزارشی اور منت بھرے تھے جیسے وہ کسی بھی قیمت پہ اپنی بات منوا لینا چاہتا ہو، خواہ عاجز ہو کر، جھک کر ہی سہی، شاہ بخت نے بے زاری اور خفگی سے سر جھٹکا، وہ دوسرا شخص کون تھا؟ وہ کوشش کے باوجود بھی دیکھ نہ سکا، سامنے پڑے کھانے میں اس کی دلچسپی ایکدم ختم ہو چکی تھی، اس نے بل ادا کیا اور باہر نکل آیا۔
ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ٹیپ آن کر دیا، گاڑی میں بلند آواز سے جسٹن بابر کا فاسٹ نمبر گونجنے لگا، اس کی پریشانی اور مایوسی قدرے بڑھی تھی اور گاڑی اس کے قابو سے باہر ہو کر ایک موٹر سائیکل سوار کو کچل گئی، اسے ہوش تو تب آیا جب اس نے پولیس کو اپنے سر پہ کھڑے پایا، وہ حواس باختہ ہو گیا تھا، یہ ایک اور اتفاق تھا کہ اس وقت اس روڈ پہ پولیس کا ناکا موجود تھا اور چند بڑے افسران بھی نظر آ رہے تھے، دو منٹ کے اندر اندر اس کی گاڑی کو پولیس فورس نے گھیر لیا، ایک نے زور دار آواز کے ساتھ گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا تھا۔
''باہر نکلو۔'' اس کی کرختگی سے کہے گئے جملے کے ساتھ ہی اسے کالر سے گھسیٹ کر باہر نکال لیا گیا، سڑک پہ بے حد افراتفری کا عالم تھا،

ساری ٹریفک رکی ہوئی تھی، گاڑیوں اور موٹر سائیکل سواروں کے ہارن چیخ رہے تھے اور اسی شور میں دل دہلا دینے والی آواز کا ہوٹر بجاتی ایمبولینس بمشکل اس رش میں جگہ بناتی آن پہنچی تھی، سڑک کے اس حصے میں زخمی شخص پڑا تھا اس کی موٹر سائیکل کو اس سے الگ کر دیا گیا تھا اس کی فائل ایک طرف پڑی تھی اور اس میں سے صفحات نکل کر اِدھر اُدھر بکھر چکے تھے اس زخمی کے گرد پولیس کا گھیرا تھا اور ایمبولینس کی آمد کے بعد وہ اسے اٹھا کر ایمبولینس میں منتقل کر رہے تھے، وہ بے چارہ بری طرح زخمی تھا اور اس کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

پولیس فورس نے اسے گھیرے میں ہی نہیں لیا تھا بلکہ سختی سے جکڑ بھی لیا تھا، وہ اتنا حیران اور خوفزدہ تھا کہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا، اسی وقت اس نے ایک شخص کو آگے بڑھتے دیکھا اور پھر اردگرد کھڑے جوانوں کو محتاط ہوتے دیکھا، شاہ بخت نے اس پہ نظر جما کے اسے دیکھا، وہ فل یونیفارم میں تھا اور اس کے سینے پہ سجے پھول اور بیج سے اس کے رینک کا اندازہ کیا جا سکتا تھا، شاہ بخت نے اس کا نام پڑھا، پھر عہدہ اور پھر اسے اپنا خون خشک ہوتا محسوس ہوا تھا۔

''وہ ایس پی تھا۔''

اور اس کے باوجود کہ وہ ایک بڑا ہینڈسم بندہ تھا اس کے تاثرات قطعاً دوستانہ نہیں تھے اس کے بھورے اور سنہرے مائل سلکی بال غالباً پیچھے کو بنائے گئے تھے مگر وہ بہت ملائم ہونے کی وجہ سے پھسل کر اس کے ماتھے پہ آ گئے تھے، اس کی آنکھیں بہت چمکدار اور روشن تھیں اور اس کا رنگ بڑا کھلا اور سفید تھا۔

مگر اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں خشونت و سفاکیت تھی، اس نے نزدیک آ کر شاہ بخت کی آنکھوں میں جھانکا۔

''تم امیر زادوں کا یہ بڑا مسئلہ ہے، سڑک کو باپ کا باغ سمجھ کر گاڑی چلاتے ہو۔'' اس کی آواز کسی پھنکار سے مشابہ تھی، شاہ بخت کا رنگ سرخ پڑ گیا۔

''آفیسر! میری بات سنیں...... میں......''

اس نے تیز آواز میں کچھ کہنا چاہا۔

''کیا دھمکی دینا چاہتے ہو؟'' ایس پی نے اس کی بات کاٹی تھی، اس کی بات پہ شاہ بخت کو فوراً ایک خیال سوجھا تھا۔

''میں دھمکی نہیں دینا چاہتا، میں بس اپنے بھائی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' شاہ بخت نے نہایت تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔

''کیوں تمہارا بھائی کیا گینگسٹر ہے، ڈان ہے یا پھر...... وزیر اعظم کا سالا۔'' وہ حقارت سے بولا تھا، انداز تمسخر اڑانے والا تھا، پولیس کے جوانوں میں دبی دبی ہنسی پھیلی تھی۔

''دیکھیں آفیسر! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا یہ سب، میں اپنے ہوش میں نہیں تھا۔'' وہ صفائی دینے والے انداز میں بولا تھا۔

''اوہ۔'' ایس پی نے ایک معنی خیز اوہ کی تھی۔

''ایک تو غلط موڑ کاٹا، دوسرا ایک جوان آدمی کو موٹر سائیکل سمیت کچل ڈالا اب کہتے ہو ہوش میں نہیں تھا۔'' ایس پی نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا تھا۔

''اس کا مطلب تم......'' یکلخت ایس پی نے اس کا کالر تھاما اور اسے زور سے جکڑ کر سرسراتے لہجے میں پوچھا تھا۔

''Have you drunk?'' شاہ بخت چیخ پڑا تھا۔

''زبان سنبھال کر بات کرو، سب کو اپنے جیسا سمجھتے ہو، بے غیرت اور گھٹیا، مجھے جانتے نہیں ہو تم، میں کیا طوفان کھڑا کر سکتا ہوں تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے، میں میڈیا کا آدمی ہوں آفیسر، مجھ سے الجھ کر تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔'' شاہ بخت نے وہی کیا تھا جو کوئی بھی لوز ٹمپر اور بے وقوف شخص کر سکتا تھا، اس نے بلا سوچے سمجھے بلند آواز میں بیسیوں پولیس کے آدمیوں کے درمیان ایک خاصے معزز اور اعلیٰ عہدے دار کو دھمکیاں دے ڈالی تھیں۔

وہ ایس پی چند لمحے تو گنگ سا کھڑا رہا پھر اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا تھا، اس کا رنگ بدل گیا تھا۔

''اس کی تلاشی لو۔'' اس نے سرد مہری سے حکم جاری کیا، فوراً ہی ایک آدمی آگے بڑھا اور بڑی مہارت سے اس کی تلاشی لینے لگا، چند منٹ کے بعد اس نے شاہ بخت کا موبائل، گلاسز اور سیل فون اپنے قبضے میں لے لئے پھر اس نے والٹ کھول کر شناختی کارڈ نکال لیا۔

''شاہ بخت ولد طارق مغل۔'' آدمی نے بلند آواز میں پڑھا۔

''ہوں...... لے چلو اسے، ذرا آج دیکھیں تو سہی کہ اس شاہ بخت کی گمشدگی کیسے ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین سرکاتی ہے، آخر یہ میڈیا کا آدمی ہے، کمشنر اور آئی جی صاحب تو ہمیں لائن حاضر کر دیں گے۔'' ایس پی نے اپنی بات کے اختتام پر ایک زہریلا قہقہہ لگایا تھا۔

''چلو۔'' دو تین آدمیوں نے اسے زبردستی دھکیل کر پولیس موبائل میں پھینکا تھا۔

''مجھے بات کرنے دو آفیسر تم یہ غلط کر رہے ہو، مجھے اپنے گھر والوں کو انفارم کرنے دو، تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' وہ چیخ رہا تھا مگر وہاں کسی کو پرواہ نہیں تھی، وہ سب ایسی التجاؤں کے عادی تھے، چند منٹ کے سفر کے بعد وہ اسے پولیس اسٹیشن لئے گئے تھے، وہاں اسے الگ تھلگ کمرے میں بند کر کے وہ واپس چلے گئے، وہ پاگلوں کی طرح انہیں پکارتا رہ گیا، اس کا خوف و پریشانی سے برا حال تھا وہ جانتا تھا وہ اس سے بد سے بدتر سلوک کرنے والے تھے، اس کا واسطہ کبھی اس قسم کی سچویشن سے پڑا ہی نہ تھا ورنہ ہینڈل کر لیتا، مگر جس قسم کا ان کا رویہ تھا یہ بات بعید از مکان ہی دکھائی دیتی تھی اور متنزادا سے وقار کی بیساکھیوں کی عادت پڑی ہوئی تھی، ہر معاملے میں ہمیشہ وہ ہی اس کے آگے کھڑے ہوتے تھے، کسی گھنے مہربان بادل کی طرح مگر اب ایکدم اسے اپنے سر پہ کڑی دھوپ کا چبھتا ہوا تلخ سایہ محسوس ہو رہا تھا۔

آخر دو گھنٹوں کے جان لیوا انتظار کے بعد دروازہ کھلا اور ایس پی صاحب کے ساتھ دو پولیس فورس کے آدمی اندر آ گئے، انہوں نے عقابی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر اس کے دائیں بائیں منکر نکیر کی مانند آ کر کھڑے ہو گئے، اس نے دیکھا وہ ایس پی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ چکا تھا۔

''شاہ بخت مغل، پروفیشنل ماڈل ہو، خاندانی بزنس کر رہے ہو، تعلیم ایم بی اے، ہائٹ چھ فٹ تین انچ، اکلوتے رہ گئے ہو کیونکہ حال ہی میں تمہارے بھائی کی ڈیڈ باڈی پاکستان آئی تھی، ریکارڈ تو صاف نظر آ رہا ہے، کوئی گرل فرینڈ بھی نہیں ہے، حیرت انگیز لگتا ہے، مگر ایسا ہی ہے، ہاں مگر......'' وہ جیسے نیوز بلیٹن پڑھ رہا تھا، سپاٹ بے تاثر انداز میں، پھر وہ خاموش ہوا اور شاہ بخت کا موبائل سامنے کر لیا اور اس کے ٹچ اسکرین پہ انگلی پھیرنے لگا، پھر وہ رک گیا جیسے اپنی مطلوبہ چیز مل گئی ہو، اس نے موبائل شاہ بخت

کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

"یہ پرنسز علینہ کون ہے؟" وہ بڑے استہزائیہ انداز میں پوچھ رہا تھا، شاہ بخت نے خون کے گھونٹ پی کر اسے دیکھا تھا، اسکرین پہ علینہ کی تصویر ساکن تھی۔

دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے اپنے خوبصورت انداز اور بے نیازی سے کرسی پہ کسی شہزادی کی طرح براجمان تھی، یہ خوبصورت تصویر شاہ بخت نے اس کی بے خبری میں لی تھی اور پھر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لی تھی، ایک دن بڑے موڈ میں بیٹھے ہوئے اس نے اس Pic کو ٹائٹل کر دیا تھا۔

"Princess Alina!" پھر خود ہی کافی دیر ہنستا رہا تھا، مگر جانے کیا سوچ کر اس نے اسے ڈیلیٹ نہیں کیا تھا اور اس وقت اس کی ایک پل کی بے اختیاری، بے بسی اس کے سامنے تھی۔

"تمہیں دوسروں کے ذاتیات میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں آفیسر۔" وہ بلند آواز میں بولا تھا۔

اس نے ترچھی نظروں سے بخت کو گھورا اور پھر طنزیہ انداز میں سر جھکا کر موبائل پہ کچھ اور کھولنے والا تھا کہ شاہ بخت نے طیش کے عالم میں جھپٹا مارا اور اس سے بھی زیادہ مستعد اور چوکنا پولیس فورس نے فوراً اسے سنبھال لیا تھا، موبائل ایس پی کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا تھا اور اس کی ٹچ اسکرین پہ دراڑیں یوں پڑ گئیں تھیں جیسے مکڑی کا جالا اور یہ دراڑیں علینہ کے خوبصورت چہرے پہ پھیلی ہوئی اسے بدصورت بنا رہی تھیں، ایس پی نے خونی نظروں سے اسے دیکھا، فون اس نے وہیں گرا رہنے دیا اور اٹھ کر اس کے مقابل آ گیا۔

شاہ بخت کو اگر دونوں بازوؤں سے جکڑا نہ گیا ہوتا تو یقیناً اب تک وہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر اس پر ٹوٹ پڑتا۔

"میرا فون مجھے واپس کرو، یو باسٹرڈ۔" آخر شاہ بخت کے ضبط کی حد ٹوٹ گئی تھی وہ بلند آواز میں چلا چلا کر اس کو گالیاں دینے لگا، خوف و وحشت اور بے بسی کے احساس نے اسے سارے بدتر نتیجوں سے بے پرواہ کر دیا تھا، مگر اگلا لمحہ اس پہ بہت بھاری پڑا تھا، ایس پی کا ہاتھ برق کی مانند گھوما اور شاہ بخت کے دائیں گال پہ پڑا تھا۔

"بہت بدتمیز ہو تم، اتنی گندی زبان تو مجھے استعمال کرنی چاہیے، پولیس والا ہوں مجھ پہ تو سوٹ بھی کرے گی مگر تم، غرور کس بات کا ہے پیسے کا یا اس شکل و صورت کا۔" وہ بہت خراب لہجے میں کہہ رہا تھا، آنکھوں سے جیسے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

"اسے سکھاؤ کہ بات کس طرح کی جاتی ہے اور یہ کہ گاڑی کس طرح چلائی جاتی ہے۔" وہ بہت معنی خیز لہجے میں کہہ کر مڑا اور باہر نکل گیا۔

اب وہ ان دونوں آدمیوں کے رحم و کرم پہ تھا اور وہ اس سے بد سے بدترین سلوک کرنے والے تھے، یہ ان کے تاثرات بخوبی بتا رہے تھے۔

☆☆☆

حیدر کو یہ تو علم نہیں ہو سکا تھا کہ ممی نے ماموں کو کس طرح منایا تھا، کون سے دلائل دیے تھے کون سی وضاحتیں دی تھیں، مگر بہرحال اتنا ضرور ہوا تھا کہ ماموں اور ممی ستارا کے گھر جا رہے تھے، اس نے بھی جانا چاہا تھا مگر ممی نے اسے روک دیا تھا۔

"ابھی تمہارے جانے کا کوئی جواز نہیں بنتا حیدر، اگر سلسلہ کچھ بنا تو پھر آنا جانا لگا ہی رہے گا مگر ابھی نہیں، ابھی مجھے وہاں کے حالات کا کچھ جائزہ لینے دو، ماحول کو اپنے حق میں ہموار کرنے دو، پھر دیکھتے ہیں۔" انہوں نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔

وہ فوراً ان کی بات سمجھ گیا تھا، جبھی سر ہلا کے اٹھ گیا تھا، معصب بھی آج ادھر ہی تھا اور یہ ستارا کے گھر کا منظر تھا، وہ اپنے سر کی ممی کو دیکھ کر تو حیران تھی مگر ان کے ساتھ کھڑے بارعب اور باوقار آدمی کو دیکھ کر کنفیوژڈ بھی ہو گئی تھی۔

"یہ میرے بھائی صاحب ہیں، معصب کو تو آپ نے دیکھا ہی تھا نا، وہ ان کے بیٹے ہیں۔" انہوں نے ستارا کی والدہ کو بتایا۔

جو انہیں دیکھ کر عجیب کشمکش و پیچ میں پڑتی نظر آ رہی تھیں، ان کی آمد کا مقصد کیا تھا؟ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں، جب ستارا اندر آئی اور باوجود اس کے کہ وہ دوپٹے سے سر ڈھانپے ہوئے تھی اس کی لمبی چوٹی قمیض کے پچھلے دامن کو چھو رہی تھی، وہ ایک دلکش سراپے کی مالک خوبصورت لڑکی تھی وہ ساکت رہ گئے تھے، وہ معصب کی پسند تھی یا ان کی بہن کی، وہ الجھ سے گئے تھے، مگر اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ انہیں پسند آئی تھی، وہ اس سے ہلکی پھلکی گفتگو میں مصروف ہو گئے اور یہ جان کر انہیں خاصی خوشی ہوئی تھی کہ وہ ایک پراعتماد پڑھی لکھی اور قابل لڑکی تھی، ان کو خاصا اطمینان ہوا تھا کہ وہ شائستہ مزاج کی حامل تھی۔

مگر جب ستارا کو ان کی آمد کا مقصد پتا چلا تو اس کے چہرے پہ ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا، وہ بہت مضطرب نظر آنے لگی تھی، جبکہ اماں بھی بوکھلا کر رہ گئی تھیں۔

بھلا کبھی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا کرتا ہے، وہ خاصے اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے، انہیں بے ساختہ ایک مثال یاد آئی تھی جس کا مطلب کچھ یوں تھا کہ "اونٹوں سے دوستی رکھنے کے لئے گھر کے دروازے اونچے کرنے پڑتے ہیں۔" مگر یہ سب ان کے اپنے خیالات تھے، حیدر کی ممی نے بہت آس و امید لئے معصب کا پرپوزل ان کے سامنے رکھا تھا کہ اماں مزید تذبذب میں پڑ گئی تھیں۔

"آپ ستارا کے والد سے بات کر لیں، معصب کو تو آپ نے دیکھ رکھا ہے، ہمیں امید ہے فیصلہ یقیناً بہتر ہی ہو گا۔" وہ بڑی مطمئن و خوش تھیں۔

ستارا سپاٹ چہرے کے ساتھ ان کی بات سنتی رہی، واقعہ اتنا عجیب تھا کہ اس کا ذہن تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا، صرف دو سرسری ملاقاتوں کے بعد ایکدم یوں شادی کا پیغام کتنا عجیب تھا، مگر پاکستان میں ہوتے ہوئے نہیں، یہاں صرف ایک نظر دیکھنے بعد ہی لوگ شادی کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔

رات کو جب ابا نے اس سے بات کی اور مرضی جاننے کی کوشش کی تو وہ کافی دیر چپ رہی تھی۔

"مجھے شادی نہیں کرنی ابا، کسی سے بھی نہیں۔" وہ بڑی ٹھہری ہوئی آواز میں بولی تھی۔

"بہت گھسی پٹی بات ہے بیٹا، مجھے کوئی مضبوط وجہ بتاؤ۔" وہ دوٹوک بولے۔

"میرے پاس آپ کو بتانے کے لئے ایک ہی بات، ایک ہی وجہ کافی ہے ابا، مجھے اور کوئی جواز نہیں دینا، سوائے اس کے۔" وہ آہستہ سے کہہ رہی تھی۔

"میں ایک دفعہ یہ تجربہ کر چکی ہوں وہی کافی ہے، مجھے دوبارہ ایسی کسی گیم اور تماشے کا حصہ نہیں بننا۔"

"میں تمہیں ایک جذباتی لڑکی نہیں سمجھتا ہوں ستارا، ایک انتہائی فضول اور احمقانہ بات کر رہی ہو، پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی اور پھر ہمیں کبھی نہ کبھی تو یہ فیصلہ لینا ہے تو ابھی کیوں نہیں، وہ اچھے لوگ ہیں ضروری نہیں دوبارہ بھی ہمیں ایسے لوگ ملیں۔" وہ تفصیل سے گویا ہوئے تھے، وہ ایک بار پھر چپ ہو گئی، اسے زندگی میں پہلی بار اندازہ ہوا تھا کہ وہ والدین سے بحث کرنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے، وہ کچھ دیر مزید اس ٹاپک پہ بات کرتے رہے مگر جلد ہی ستارا نے جان لیا تھا کہ وہ ان سے دلائل میں جیت نہیں سکے گی۔

"ایک فیصلہ میں نے اور تمہاری ماں نے کیا تھا تمہارے لئے، وہ غلط ثابت ہوا اب دوسرا فیصلہ تم کرو گی، اس کا مکمل اختیار تمہارے پاس ہے میں تم پہ کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالوں گا، مگر تم اس سے ایک بار مل لو پھر جو بھی تمہارا فیصلہ ہو گا مجھے منظور ہو گا مگر اس طرح نہیں، جو بھی کرنا خوب سوچ سمجھ کر کرنا ستارا، اگر تمہیں لگے کہ اس میں ایسی کوئی بھی خوبی نہیں کہ گزارہ کیا جا سکے تو میں پھر مان لوں گا۔" وہ اسے سمجھا رہے تھے، ستارا نے اپنے آپ کو بے حد بے بس محسوس کیا تھا۔

"ابا! آپ نے ٹھیک کہا مگر میں فی الحال شادی کے لئے تیار نہیں ہوں، مگر پلیز یہ مت سوچیں کہ قصور آپ کا تھا، قصور آپ میں سے کسی کا نہیں تھا بلکہ میری قسمت کا تھا ابا......" وہ افسردگی سے بولی۔

"تم اس سے ملو گی نا؟" وہ آس سے بولے، ان کا چہرہ ایک مجبور باپ کا چہرہ تھا جس پہ فیصلے کی ناکامی رقم تھی اور آنے والے دنوں کا خوف مترشح تھا، وہ اپنی بیٹی کو پھر سے بستا دیکھنا چاہتے تھے، ستارا کے اندر مجبوری کی ایک زنجیر مضبوط ہو گئی، وہ ان کی آس ختم نہیں کر سکی تھی اور بجھے دل سے ہی سہی مان گئی تھی، ان کے پاس کتنے بے شمار دلائل تھے، معاشرے کا خوف، لوگوں کی باتیں، اکیلی عورت کی نا بے بسی، وہ خاموشی سے سنتی رہی تھی اور بالآخر متفق ہو گئی تھی کہ اس کے ابا بالکل درست کہہ رہے تھے وہ اکیلی لڑکی مرد کے اس معاشرے میں بغیر مرد کے زندگی کا گاڑی نہیں چلا سکتی تھی، مگر وہ اس بات پہ متفق نہیں ہوئی تھی کہ شادی "معصب شاہ" سے ہی کر لینی چاہیے، وجہ......؟ پتا نہیں کیوں......! مگر شادی بعض چیزوں کے بارے میں وضاحتیں یا جواز نہیں دیئے جا سکتے، مگر پھر بھی وہ اس سے ایک بار ملنے کا ارادہ حقیقتاً رکھتی تھی، پھر اس کے بعد جو بھی ہوتا دیکھا جاتا۔

☆☆☆

یہ "شاہ کلینک" تھا وہ اس وقت فارغ بیٹھا ہوا اپنے کلائنٹ کا انتظار کر رہا تھا جب اس نے ستارا کو افراتفری میں اندر آتے دیکھا۔

"سر! وہ باہر آپ کی گاڑی کے ساتھ ایک اور گاڑی رکی ہوئی ہے اور اس کی پچھلی سیٹ پہ کوئی آدمی گرا ہوا ہے، یوں لگتا ہے بے ہوش ہے۔" وہ ابھی ابھی آئی تھی اور آتے ہوئے اس نے وہ گاڑی اور اس میں موجود آدمی کو مارک کیا تھا۔

"گاڑی اور بے ہوش آدمی؟" وہ حیرانی سے بڑبڑایا۔

"جب میں صبح آیا تب تو وہاں کچھ نہ تھا، بہرحال میں دیکھتا ہوں۔" وہ اٹھ کر باہر نکل گیا، اس نے گاڑی کا ایک نظر جائزہ لیا، یہ بلیک B-M تھی، اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور بے ترتیبی سے پڑے شخص کو سیدھا کیا، اگلے ہی لمحے اس کو کرنٹ لگا تھا، وہ اس کو کیسے بھول سکتا

تھا؟ کیسے پہچاننے میں غلطی کر سکتا تھا؟ وہ شاہ بخت تھا۔

اس نے اس کا چہرہ دیکھا جو بری طرح خون آلودہ، ورم زدہ تھا اور وہ شدید زخمی لگ رہا تھا، اس نے سیدھا ہوئے ہوئے گاڑی کا دروازہ بند کر دیا اور اگلے دروازے کو کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پہ براجمان ہو گیا، چابی اگنیشن میں موجود تھی، اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو ستارا اسے اپنی طرف آتی نظر آئی۔

"ستارا! میں اسے لے کر ہاسپٹل جا رہا ہوں، آپ ایس پی صاحب کی ٹائمنگ چینج کر دیجئے گا اور آج شام تک کی کوئی اپائنٹمنٹ رکھ لیجئے گا۔" وہ تیزی سے گاڑی ریورس کر رہا تھا، ستارا سر ہلا کر واپس اندر کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے گاڑی ڈاکٹر سلطان کے کلینک کی طرف موڑ لی، کیس ایسا تھا کہ وہ سرکاری ہسپتال جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا اور ڈاکٹر سلطان سے اس کی پرانی شناسائی تھی، اکثر سیمینار اور ڈسکشنز وغیرہ میں ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ انہیں سائیکاٹری میں بے حد دلچسپی تھی اور حیدر سے اکثر وہ اپنے کسی پیشنٹ کو ڈسکس کیا کرتے تھے، شاید وہ ان کا کوئی خاص پیشنٹ تھا۔

انہی سوچوں میں گم اس نے گاڑی روکی اور اسے کلینک میں شفٹ کروانے لگا، ڈاکٹر سلطان اسے کوری ڈور میں مل گئے۔

"ارے حیدر! تم یہاں؟" وہ بے حد حیران ہوئے۔

"جی سر! ایک ایمرجنسی ہے پلیز آپ اسے فوراً ایڈمٹ کریں۔" وہ تیزی سے بولا۔

"وہ تو کر لوں گا مگر مجھے بتاؤ تو سہی کون زخمی ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"بس دوست ہی سمجھ لیں، ہوا کیا ہے یہ تو میں بھی نہیں جانتا، آپ چیک اپ کر کے بتائیں مجھے، بظاہر تو زخمی لگ رہا ہے۔" اس نے بتایا۔

"عجیب بات ہے بھئی تمہیں تو خود کچھ نہیں پتا، خیر میں چیک اپ کر کے بتاتا ہوں کیا معاملہ ہے؟" وہ آگے بڑھ گئے جہاں شاہ بخت کے اسٹیچر کو وارڈ بوائز گھسیٹتے ہوئے روم میں شفٹ کر چکے تھے، حیدر وہیں کھڑا ہو گیا، وہ عجیب شش و پنج میں پڑ گیا تھا کہ اس کے گھر والوں سے رابطہ کرے یا نہ کرے، کیا وہ اب تک بے خبر تھے؟ وہ کچھ سوچ کر باہر کی سمت آ گیا، گاڑی تو پتا نہیں اس کی تھی یا نہیں مگر دیکھ لینے میں کیا حرج تھا، ہو سکتا تھا کہ اسے اپنے مطلب کی کوئی چیز مل جاتی جس سے وہ یہ جان سکتا کہ آخر قصہ کیا تھا؟ اور کتنی عجیب سی بات تھی کہ گاڑی کی ظاہری حالت سے قطعاً ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ اس کا کوئی ایکسیڈنٹ ہوا تھا، دوسری عجیب چیز شاہ بخت کا پچھلی سیٹ پہ گرا ہونا تھا، کہیں کوئی دشمنی کا چکر تو نہیں اس نے گاڑی کی تلاشی لینے کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے ٹھٹک کر سوچا تھا، جس کا ثبوت یہ بھی تھا کہ گاڑی کی ہر چیز نارمل حالت میں تھی یہاں تک کہ ڈیش بورڈ پر موبائل فون، والٹ اور گلاسز تک موجود تھے، اس نے فون اٹھا لیا، یہ ٹچ سسٹم تھا اور بڑے اعلیٰ برانڈ کا، اس نے دائیں انگلی سے اسکرین کو چھوا اگلے ہی لمحے اسکرین روشن ہو گئی اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔

دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے وہ بے نیازی سے کرسی پہ براجمان تھی اور اس کے نیچے آخر کے کونے پہ سفید رنگ کا Princess Alina لکھا ہوا تھا، ہاں وہ شہزادی ہی تو تھی، مگر اس شہزادی کے چہرے پہ خراشیں اور دراڑیں کیوں تھیں؟ یہ کون سا حادثہ تھا؟ آخر کیا ہوا تھا؟ اگر یہ

شاہ بخت کا موبائل تھا تو اس میں علینہ کی تصویر کیوں تھی؟ اس نے موبائل سے چھیڑ چھاڑ کرنا چاہی مگر اس کی اسکرین اسٹل ہوگئی تھی، اس نے لب بھینچ کر والٹ اٹھایا اور اندر جھانکنے لگا، کارڈز، کیش اور وہی سب جو کسی کے والٹ میں ہوسکتا تھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا، اس کے سیل کی گھنٹی بجنے لگی، اس نے فون اٹھایا تو سر تھے۔

''حیدر! تم کہاں ہو؟ فوراً میرے پاس آؤ۔'' وہ مرتعش آواز میں بولے تھے، حیدر چونکا۔

''کیا ہوا سر؟ خیریت میں آرہا ہوں۔'' وہ فوراً بولا اور دروازہ کھولا اور کلینک کی طرف چل پڑا، ڈاکٹر سلطان اسے اپنے روم میں ملے تھے، ان کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ بے حد مضطرب نظر آرہے تھے۔

''حیدر! تم شاہ بخت کو کیسے جانتے ہو؟'' وہ لپک کر اس کے پاس آئے۔

''براہ راست تو نہیں جانتا مگر ایک آدھا بار ہوا کیا؟ آپ نے اسے دیکھ لیا؟ اتنی جلدی؟'' وہ پوچھنے لگا۔

''تم نے اس کے گھر میں انفارم کیا؟'' وہ اس کے سوال نظر انداز کر کے پوچھنے لگے۔

''نہیں ابھی بس کرنے والا تھا۔'' حیدر نے الجھ کر کہا۔

''مگر ہوا کیا ہے بتائیں تو سہی۔'' وہ جھلا گیا۔

''ابھی پتہ چل جاتا ہے۔'' انہوں نے اپنا سیل فون نکالا اور کوئی نمبر ملانے لگے، کچھ دیر بعد کال پک کرلی گئی۔

''سلطان بات کر رہا ہوں، وقار شاہ بخت کہاں ہے؟'' انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''شاہ بخت کل رات سے لاپتا ہے ڈاکٹر، ہم پاگل ہو چکے ہیں اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر، سارے ہاسپٹل، سارے پولیس اسٹیشنز چیک کر لئے مگر وہ کہیں نہیں ہے۔'' وقار رو دینے والے تھے۔

''کوئی جھگڑا ہوا آپ کے ساتھ؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وقار نے نفی کی۔

''اس وقت کہاں ہیں آپ؟''

''پولیس اسٹیشن جا رہا ہو گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے۔'' وہ بے حد رنجیدہ تھے۔

''اس کی ضرورت نہیں، آپ میرے کلینک آجائیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ ٹھٹک گئے۔

''مغل ہاؤس'' میں کل رات سے کہرام برپا تھا، شاہ بخت گھر نہیں آیا تھا، وہ سب پاگلوں کی طرح اسے ہر ممکنہ جگہ کھوج چکے تھے، نیلم چچی کا بی پی ٹینشن کی وجہ سے اتنا لو ہوگیا تھا کہ انہیں ہاسپٹل لے جانا پڑا تھا اور اب وقار کو آنے والا ڈاکٹر سلطان کا فون۔

''آپ کے پاس آجاؤں کیوں؟'' ان کی چھٹی حس بیدار ہوگئی۔

''شاہ بخت یہاں ہے۔''

''کیا؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ آپ کے پاس ہے؟'' وقار چلا اٹھے۔

''ہاں میرے پاس ہے۔''

''لیکن کیوں؟ کیا ہوا ہے اسے وہ ٹھیک تو ہے نا؟'' وقار تیزی سے سوال پہ سوال کر رہے تھے۔

''بس آپ آجائیں۔'' انہوں نے فون بند کر دیا، وقار نے گاڑی فل اسپیڈ پہ چھوڑ دی۔

(باقی آئندہ)

سبز موسم میں وہ زرد آنکھوں والی لڑکی کتنی اداس لگ رہی تھی اس کی آنکھوں اور چہرے پر کسی کے ہجر کی زردی کھنڈ گئی تھی اور اس کی درندہ درگاہ محبت کو جو ہجر لاحق ہوا تھا اس کا تسلسل ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا اور گزشتہ چھ سال سے تنہا ہجر جھیل رہی تھی بعض اوقات ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں انگ انگ میں درد بڑھا دیتیں تو وہ بے چین ہو کر وہ چھت پر آ جاتی لیکن بے قرار نگاہیں اس کے گھر پر پڑتیں تو بے کلی اور بڑھ جاتی اس بے فیض محبت کا شگوفہ تو بیک وقت دونوں کے دل میں پھوٹا تھا اور اس کی آنکھیں ہی نہیں قدم بھی بے قرار ہو گئے تھے جو بار بار چھت کے چکر لگاتا تو وہ بھی اس کو دیکھنے کی چاہ میں اوپر آ جاتی اور پھر ایک دوسرے کو دیکھنے کی چاہ میں وہ دونوں پہروں چھت پہ بیٹھا کرتے صرف دیکھتے رہنا ہی ان دونوں کی ضرورت بن گیا تھا بات کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔

☆☆☆

کہ اشعر گردیزی کے قدموں کی بے قراری نائلہ آفندی کے دل سے لپٹ گئی وہ ایک قدم بڑھاتا تو وہ چار قدم بڑھ آئی تھی اظہار کر دیا اقرار محبت کر دیا بے قراری کے قصے بیان کر دیئے اپنا دل کھول کر بیان کر دیا ان خطوط یا چٹھیوں کے ذریعے جو وہ اپنے چھت پہ کھڑی ہو کر چھوٹے سے پتھر سے باندھ کر پھینکا کرتی اور وہ تھی منتظر رہتا تھا مگر خاموش ایک چپ تھا نہ اقرار نہ اظہار اور نہ ہی بے اختیار ہوا تھا، اس کے قصے پڑھ کر مسکرا دیا کرتا اور وہ اس کی اس مسکراہٹ کو اپنے دل کے تہہ خانے میں سنبھال کر رکھ لیتی ہاں اس کی محبت میں بے قراری کی منزل نہ آئی تھی: مگر نائلہ آفندی بے اختیاری کے زینے طے کرنا چاہتی تھی اشعر اسے منزل لگنے لگا تھا اور وہ تو شاید پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا کبھی کبھی وہ بے اعتبار ہو جاتی لیکن اس کی سبز آنکھیں نائلہ آفندی کو محبت کے جذبوں سے سرشار دکھائی دیتیں تو وہ ہر خوف کو سوچ کی قبر میں اتار کر آسودہ ہو جاتی مگر سچ تو یہ تھا جب سے وہ اشعر کی محبت میں مبتلا ہوئی تھی سوائے بے چینی، بے تابی اور اذیت کے کچھ نہ ملا تھا۔

انہی دنوں جب صحن میں بوگن ویلیا کی بیل پر سفید اور گلابی پھول لہرائے تو ایسے میں اماں ابا نے نائلہ آفندی کو اس کے خالہ زاد وزرون سے بیاہنے کا عندیہ ظاہر کر دیا تو وہ چپ اور اداس ہو گئی ایکدم اسے سارا زمانہ ویران اور مضمحل دکھائی دینے لگا، گالوں پہ گلاب کھلتے نہ تو آنکھوں جگنو چمکتے دل اندر ہی اندر کہیں پاتال میں گرتا رہا ابھی تو دل نے دھڑکنا سیکھا تھا ابھی تو پلکوں نے جھکنا اور اٹھنا شروع کیا تھا ابھی تو دل نے کسی کو اپنا مانا تھا اور راتیں اس کے تصور سے روشن کیں تھیں کتنے خواب دیکھ ڈالے تھے اس نے۔

"وہ اور اشعر گردیزی۔"

"اشعر گردیزی اور وہ۔"

بے بسی اپنی انتہاؤں پر تھی کہ زارون چلا آیا، وہ اپنے کمرے میں سفید ملگجا لباس پہنے اداس اور مضمحل لیٹی ہوئی تھی کمرے میں نیم تاریکی تھی یا نیم روشنی ایک سکوت تھا جو مکمل تھا اس نے دروازے پہ دستک دی اور اجازت ملنے پر اندر چلا آیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور وہ قریب پڑی کرسی پر خود ہی بیٹھ گیا۔

"نائلہ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" وہ بنا تمہید کے بولا تھا وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ بھی

کھڑا ہو گیا نائلہ کو اس کی موجودگی سے حد درجہ بیزاری ہونے لگی کمرے میں ایکدم گھٹن کا احساس بڑھ گیا تو آگے بڑھ کر اس نے کھڑکی کے پٹ وا کر دیئے خوامخواہ ہی باہر دیکھنے لگی۔

"اُف میں اس کے ساتھ کیسے ایک عمر کا سفر طے کروں گی جس کے سنگ پل گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔" اس نے آنکھوں میں آئے آنسو بمشکل ضبط کیے۔

"نائلہ میں سمجھ سکتا ہوں، میری ان باتوں سے تمہارے دل پر کیا بیتے گی مگر یہی سچ ہے اور ہمیں اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔" اور وہ سانس روکے اپنی پشت پہ ابھرتی آواز کے مدوجزر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔" زارون نے ادھورا فقرہ مکمل کیا تو اس کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

"تو......" وہ اتنا ہی بول پائی۔

"تو یہ کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں اسی سے شادی کروں گا میں تین تین زندگیاں تباہ نہیں کر سکتا، تمہاری میری اور اس کی جسے میں چاہا میں جانتا ہوں میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکوں گا اور نہ تم خوش رہ پاؤ گی اسی لئے بہتر ہے کہ ہم ابھی سے اپنے راستے جدا کر لیں اگر تم نے ہمارے تعلق سے متعلق کوئی خوش فہمی پال لی ہے تو پلیز اسے دل سے نکال دو۔"

"زارون تم میری طرف سے بے فکر ہو جاؤ اور شادی سے بے شک انکار کر دو۔" اس نے اندرونی خوشی چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا وہ بے آواز قدموں سے واپس مڑ گیا اور اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے نائلہ آفندی کا ایقان اشعر گردیزی کی محبت پر اور مضبوط ہو گیا اسے ذرا بھی معلوم نہ تھا کہ کسی اور کی زلف کا اسیر زارون اس سے شادی کے لئے خود انکار کر دے گا اور پتہ نہیں کیسے اس نے بات کی تھی کہ گھر میں اس کے اماں ابا نے کوئی بات نہ کی تھی اور پھر وقت کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ایک دن وہ محفل میلاد میں ان کے گھر گئی تھی سفید براق لباس پہنے سر پر سفید دوپٹہ اچھی طرح اوڑھے وہ بہت سوں سے منفرد لگ رہی تھی اس کی معصومیت اسے سب میں نمایاں بتا رہی تھی۔

وہ کچن میں پانی پینے آئی تو سامنے اسے چائے پیتے دیکھ کر اچانک دل زور سے دھڑکا تھا کتنی مدت کے بعد پہلی بار وہ اتنا قریب تھے کہ حیا نے مسکرا کر اس رخ کا احاطہ کر لیا تھا بوتل سے گلاس میں پانی انڈیلتی نائلہ آفندی کا چہرہ اس کی نظروں کی حدت سے تپ اٹھا۔

"آپ کو کیسے خبر ہوئی کہ سفید رنگ مجھے بے تحاشا پسند ہے۔" شاید اشعر کا دل اس کی قربت سے پگھلا جا رہا تھا اور اشعر گردیزی کی بات سن کر اس کا رنگ پل میں متغیر ہوا تھا مگر اگلے لمحے وہ سرعت سے باہر نکل گیا اور وہ جیسے ہوش میں آئی اس کی واحد دوست ثانیہ اسے کہتی۔

"تم اسے دیکھ کر اتنا خوش ہوتی ہو اگر کہیں وہ سچ مچ تمہارا ہو گیا تو کیا ہو گا جس دن اس نے اپنی زندگی میں میرے ہونے کا اقرار کیا تو میں خوشی سے مر ہی جاؤں گی۔" اس کی آواز جذبوں سے چور تھی۔

"اتنی دیوانگی اچھی نہیں۔" ثانیہ کسی قدر خوفزدہ ہو گئی۔

"اس سے کم پہ دل مانتا ہی نہیں۔" وہ اس کے ماتھے پہ آئی لٹک کو مزے سے

چھیڑتے ہوئے بولی۔

"دل تو بے ایمان ہوتا ہے۔" اس نے ایک اور دلیل دی، میں نے دل ہی نہیں اپنے جسم وروح کے کہنے پر اسے تسلیم کیا ہے اپنا مانا ہے۔

تجھے کیا خبر میرے حال کی
وہ کٹورے پانیوں سے بھر گئے
میرے درد کی میرے ملال کی
یہ جنون منزل عشق ہے
جنہیں تیری دید کی پیاس تھی
جو چلے تو جاں سے گزر گئے

☆☆☆

ویلنٹائن ڈے پہ نائلہ نے اسے پرفیوم گفٹ کیا تھا، جسے اشعر آفندی نے بخوشی قبول کرلیا تھا تو وہ جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی اور پھر اگلے چند دن بہت خوشگوار گزرے تھے پھر جانے کیا ہوا وہ بدل گیا اس سے کترانے لگا اوپر آنا کم ہو گیا اس کے گھر کے پاس سے خاموش بنا آہٹ کیے گزرنے لگا وہ اسے پردے کی اوٹ سے دور جاتا دیکھتی تو تڑپ اٹھی وہ نہ سمجھ پائی کیا کوئی اتنی جلدی کسی کو بھول سکتا ہے۔

"نہیں وہ بھولا نہیں بس ایسے ہی، کیا بس ایسے ہی تم بھی اسے بھول جاؤ۔" تانیہ اسے کہتی۔

"تانیہ میں نے پہلے محبت کو صرف دور سے دیکھا تھا لیکن جب سے میں نے اسے قریب سے محسوس کیا ہے محبت میرے روئیں روئیں میں بس گئی ہے میری رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرتی ہے میں اس کی محبت کو کیسے خود سے جدا کروں۔" وہ اس لمحے ہار سی جاتی اور پھر اس کے دل میں موہوم سی امید جاگی۔

بارہ اپریل کو اسکا برتھ ڈے تھا اس نے سوچا وہ اس کو وش کرے گی سو اس نے ایک خوبصورت سا شیشے کا فریم پیک کروایا اور بہانے سے اس کے گھر جا کر اشعر کے روم میں رکھ دیا اور اس کے کمرے کو غور سے دیکھا سفید حسین ریشمی پردے، سفید دبیز بیڈ شیٹ صوفہ کور بھی سفید حتی کہ اس کے کمرے میں سفید رنگ ہر چیز میں نظر آرہا تھا اور اس اپنے لباس کو دیکھا وہ بھی سفید تھا جس سے اشعر گردیزی نے سفید رنگ سے محبت ظاہر کی تھی اس دن سے اکثر سفید لباس ہی زیب تن کیا کرتی پھر وہ خاموشی سے چلی آئی دوسرے ہی دن وہ کالج سے واپسی وین سے اتر کر آرہی تھی کہ اچانک وہ سامنے آگیا تھا اسے سامنے پا کر ابھی خوش بھی نہ ہو پائی تھی کہ اس نے گفٹ پیک اس کے سامنے کردیا آج کے بعد ایسی حرکت کبھی نہ کرنا۔

"خدا کے واسطے میرا پیچھا چھوڑ دو۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر قدرے اونچی آواز میں کہا تھا تو نائلہ آفندی کے چہرے کا رنگ ایکدم ہی متغیر ہوا تھا اور اس کے ہاتھوں سے وہ گفٹ نیچے گر گیا اور چکنا چور ہو گیا وہ جا چکا تھا مگر اس کے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھی تھی آنکھوں سے کانٹے اگ آئے تھے اک عجیب سی کیفیت سے اسے جکڑ لیا تھا مسترد ہونے کا ذائقہ بہت کڑوا ہوتا ہے شاید موت سے بھی زیادہ وہ محبت کے در سے راندہ درگاہ ہوئی تھی وہ ٹھکرائی گئی تھی اسے اپنا آپ بہت حقیر سا لگا زمین پر رینگنے والے چھوٹے چھوٹے حشرات الارض سے بھی زیادہ کتنی ہتک کتنی تحقیر کی تھی اس نے ایک پل میں آسمان سے

زمین پر لا پھینکا تھا وہ قدم گھسیٹتی بڑی مشکل سے گھر پہنچی تھی اور اپنے کمرے میں جا کر بے تحاشا روئی اور پھر کتنے ہی دن وہ اپنے آپ سے لڑتی رہی کتنی ہی راتیں جاگ کر گزار دیں۔

☆☆☆

آداب! اشعر گردیزی بعض فیصلے کرنے بہت مشکل ہوتے ہیں آج میں نے بھی ایک فیصلہ کیا ہے مشکل سہی لیکن عمل تو کرنا پڑے گا آپ سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کٹھن ہے کیونکہ اتنا لمبا عرصہ خوش فہمی میں گزارنا آسان نہیں ہوتا آپ سے دستبردار ہو، جیوں گی ضرور مگر زندہ نہیں رہ پاؤں گی جب زندہ دلی مر جاتی ہے تو چلتا پھرتا وجود زندہ لاش بن جاتا ہے اب میری مسکراہٹ کے پیچھے بہت سارے زخم ہوا کریں گے اور میری ہنسی فریب ہو گی دھوکہ ہو گی سو دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے مسکرانا پڑے گا آج دنیا میں ایک اور دھوکہ باز کا اضافہ ہو جائے گا محبت کا احساس کتنی خوبصورت دلکش مگر جان لیوا ہوتا ہے یہ تو آپ سے محبت کرنے کے بعد پتہ چلا میں یا میری محبت اتنی ارزاں نہیں تھی اشعر گردیزی جتنا آپ نے بے مول کر دی محبت میں انا نہیں ہوتی مگر وقار ضرور ہوتا ہے اور میں اپنے وقار کو شکست سے دوچار نہیں کر سکتی آئندہ کبھی آپ مجھے اپنے راستوں میں نہیں پائیں گے، فقط نائلہ آفندی۔"

خط کو طے کر کے مٹھی میں سختی سے بھینچ لیا گھر سے باہر نکلی اس کے گھر تک جانا تھا مگر قدم من من بھر کے ہو رہے تھے قدم آگے بڑھاتی تو پیچھے پڑتا اس کے گھر کے برابر میں ایک گھر چھوڑ کر اس کا "گردیزی ہاؤس" تھا لیکن اسے لگا جیسے وہ صدیوں کا سفر طے کر آئی ہو سفید ماربل کی سیڑھیاں عبور کر کے ہلکے سبز رنگ کا آہنی گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر اندر چلی آئی تو سامنے ہی واش بیسن پہ ہاتھ دھوتا نظر آگیا نائلہ کا دل زور سے دھڑکا تھا قدموں کی چاپ پر اشعر نے مڑ کر دیکھا تو سبز آنکھوں میں تحیر کا سمندر امڈ آیا کہ وہ اب کیوں آئی تھی نائلہ آفندی کے لبوں پر صدیوں کی پیاس اتر آئی اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری ابھی سوچ رہی تھی کہ اسے یہ خط کیسے دے کہ اس کی ماں چلی آئی۔

"ارے نائلہ بیٹی تم آؤ آگے آؤ۔" انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تھا اور وہ جلدی سے موقع غنیمت جانتے ہوئے کھسک گیا۔

"آنٹی ریان (چھوٹے دس سالہ بھائی) کا پوچھنے آئی تھی پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے کافی دیر سے نظر نہیں آیا، وہ اکثر ادھر آجاتا تھا۔" نائلہ کو جھوٹ بولنا دوبھر لگ رہا تھا۔

"نہیں ریان تو ادھر نہیں آیا مگر تم تو اندر آؤ میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گی۔"

"نہیں آنٹی پھر کبھی سہی۔" وہ واپس مڑ گئی گھر آ کر خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اندر گھٹن بڑھ گئی سرعت سے اٹھ کر اس نے کھڑکی کے پٹ وا کر دیئے تو تازہ ہوا کا جھونکا اس کے چہرے کو چھو گیا کچھ باتیں ان کہی رہیں تو بہتر ہوتا ہے کچھ اسرار نہ کھلیں تو اچھا ہے پھر اس نے دن اور رات کے چکر سے بے نیاز ہو کر جینا شروع کر دیا۔

ایک جھلک دیکھنے کو بے قرار دل درد تکمیل پا گیا تو اب دل میں چھپی تصویر ہی کل متاع حیات تھی کیا جذبہ محبت اتنا سٹرونگ ہوتا

ہے کہ انسان کی روح کو اپنے بس میں کر لیتا ہے پھر رہائی نہیں ملتی مجھے بھی رہائی کیوں نہیں مل رہی وہ مجھے ملا نہیں اور محبت مجھے چھوڑتی نہیں میں کیا کروں وہ بے بسی سے اپنی دوست کے سامنے دست سوال دراز کرتی اور بے تحاشا روتی اور پھر یوں ہوا موسم بدلنے لگے، نائلہ آفندی نے اشعر گردیزی کے روز شب کا حساب رکھنا چھوڑ دیا اس کی آہٹ پر عجلت سے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا کب آتا ہے کب جاتا ہے مگر وہ اسے بھلا نہ پائی۔

☆☆☆

یوں تو غم ملے بے شمار اس دشت حیات میں
بس تیرے ملنے کی اک خوشی ہی نایاب ہو گئی

اس نے چھ سال مسلسل اذیت میں گزار دیئے تھے لیکن درد آج بھی اس کی آنکھوں سے پہلے دن کی طرح بسا تھا تم کہو تو میں اس سے بات کروں تمہاری محبت یوں بے مول کرنے کے لائق تو نہ تھی، تم اس سے ان لمحوں کا کچھ تو حساب مانگو، تانیہ اسے تڑپتے نہ دیکھ پاتی تو کہتی ”ہم تو سدا کے بے مول ٹھہرے تانیہ یہ بھی سن لو محبت انسان کو فقیر تو کر دیتی ہے مگر بھکاری نہیں۔“

”وہ اتنا خاص تو نہ تھا کہ تم اس کی خاطر جوگ لے لیا۔“ تانیہ چڑ کر کہتی۔

”وہ سب سے خاص سب سے مختلف تھا تبھی تو اسے میں نے چاہا کوئی اور ان آنکھوں میں کیوں نہیں جچا کسی اور نے دل میں نقب کیوں نہیں لگائی، وہ چاہے جانے کے قابل تھا تبھی میں نے اسے چاہا لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اس کے کسی لمحے میں موجود ہوں کیونکہ محبت پر میرا یقین اسی بات کی دلیل ہے۔“

لیل و نہار یونہی اجڑے اجڑے سے گزر رہے تھے کہ تانیہ نے ایک جان لیوا خبر سنا دی۔

کل اشعر کی منگنی ہے سنا ہے اس کی پسند سے ہو رہی ہے۔

پھر تو نائلہ آفندی نے دل میں غضب کا درد اٹھا تھا کہ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی اسے جلدی سے ہوسپٹل پہنچایا گیا اسے جب ہوش آیا تو گھر کے سارے فرد اسے باری باری ملے تھے سب سے آخر میں تانیہ رہ گئی تھی اس کی محرم راز یہ سب کیا ہے نائلہ اتنی دیوانگی۔

”ایسا پاگل پن میں نے آج تک نہیں دیکھا تم بھول کیوں نہیں جاتی ہو اس بے وفا شخص کو۔“ وہ قدرے نیچی آواز میں دبے دبے غصے سے بولی تھی۔

”تم مجھے ایسے مشورے کیوں دیتی ہو جن میں عمل نہیں کر سکتی، کاش! وہ ایک بار کہہ دیتا اسے بھی مجھ سے محبت ہے ایک بار اپنی چاہتوں کا یقین دلا دیتا تو میں تمام عمر اسی یقین کے سہارے کاٹ لیتی، اب کیا فائدہ جینے کا۔“ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی۔

”اس کی محبت میری سانسوں پر لکھی جا چکی ہے اب اس کی محبت نہیں تو پھر یہ سانسیں کیسے چلیں گی۔“ وہ نقاہت زدہ لہجے میں دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔

”ایسی باتیں مت کرو نائلہ آفندی تم اس کے لئے خود کو ضائع کیوں کر رہی ہو، مجھے یقین ہے وہ تمہیں بھول چکا ہوگا۔“ تانیہ چڑ سی گئی۔

”محبت کرنے والے ہر دور میں محبت پر قربان ہوتے آئے ہیں تو ایک میں بھی سہی میرا نام بھی محبت کے شہیدوں میں لکھا جائے گا۔“ اس پل وہ کتنی ہاری ہوئی لگ رہی تھی کہ اچانک وہ چلا آیا۔

”دشمن جاں، مژدہ زندگی“ اشعر گردیزی ان کے درمیان کتنے لمحے خاموش گزر گئے تو وہ ہی بولا تھا۔

”یہ سب کیا ہے نائلہ۔“ نرم لہجے کی پھوار برسی تھی۔

”کیا تم نہیں جانتے؟ کیا آج بھی مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہے، کیا آج بھی مجھے اپنے جذبوں کا یقین دلانے کے لئے لفظوں کا سہارا لینا پڑے گا، نائلہ تمہاری محبت پہ ایمان تو مجھے پہلے ہی دن سے تھا مگر میں خود کو دھوکہ دیتا رہا، ان ذات پات کے بتوں کو پوجنے والوں کے ڈر سے جھوٹے سماج کی بودی رسموں سے میں ڈرتا تھا نائلہ جرم میں برابر کا شریک میں بھی ہوں مگر میں جانتا ہوں وار پر تمہیں لٹکایا جانا تھا لیکن آج میں اظہار کروں گا نائلہ۔“ وہ اس کے کمزور لرزتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے اس کے قریب پائنتی پہ ہی ٹک گیا اور اس وقت جذبے اس کے روشن چہرے سے پھوٹ رہے تھے اظہار آنکھوں سے خود بول رہا تھا کم از کم نائلہ کو تو یہی لگا تھا۔

”تم نے سارے کے سارے اشعر گردیزی کو چوری کر لیا ہے نائلہ آفندی تم نے اپنا اسیر کر لیا ہے مجھے۔“ گمبھیر لہجہ اس کی سماعتوں میں رس گھول رہا تھا اور پھر اس نے اپنی لمبی پلکوں والی خوبصورت آنکھوں میں اس کا وجیہہ سراپا سموتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں اسیر تو میں ہوئی ہوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ میری ساری عمر سمٹ کر اس لمحے میں محدود ہو جائے زندگی اڑنا بھول جائے اپنے پر سمیٹ لے اپنی پرواز مختصر کر کے اس لمحے کی گود میں سر رکھے ہمیشہ کے سو جائے۔“ وہ بھیگی بھیگی نقاہت زدہ آواز میں بول رہی تھی۔

”کاش میں تمہیں اپنا دل چیر کر دکھا سکتا کہ تم کہاں تک میرے اندر اتر چکی ہو مجھے کیا خبر تھی کہ تم یوں میری رگ و جاں میں اتر جاؤ گی تو میں بہت پہلے آ گیا ہوتا۔“ اشعر گردیزی کے اقرار کی خوشی درد بن کر اس کے رگ جاں میں پھیل رہی تھی مگر شدت ضبط سے کام لے رہی تھی پھر اس نے پاس کھڑی تانیہ کو مخاطب کیا تھا۔

”تانیہ تم میری شدتوں سے واقف تھیں تم ہی میرے خوابوں کی گواہ اور میرے جذبوں کی امین ہو تم نے ایک دن کہا تھا اگر میں نے اشعر گردیزی کو پا لیا تو کیا ہوگا اور میں نے جو جواب دیا تھا تم جانتی ہو تو میں نے اشعر کو پا لیا ہے تم گواہ رہنا۔

نہیں نائلہ تم یہ کیا کہہ رہی ہو خدا نہ کرے کچھ ایسا ہو جو تم نے کہا تھا۔“ تانیہ اور قریب آ کر اس کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی تھی مگر درد ضبط کی ساری حدیں توڑ کر باہر نکل آیا تھا اور اس کے لبوں سے ایک کراہ نکلی اشعر کو ایکدم انہونی کا احساس ہوا کیونکہ اس کے گرم ہاتھوں میں نائلہ کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے تانیہ ڈاکٹر کو بلاؤ وہ بلبلایا وہ بھاگ کر نکلی تھی مگر دیر ہو چکی تھی، زندگی نے اپنے پر سمیٹ لئے تھے اپنی پرواز مختصر کر لی تھی، ڈاکٹر کے آنے تک وہ اپنے آخری منزل تک پہنچ چکی تھی نائلہ نے تو اپنا نام محبت کے شہیدوں میں لکھوا لیا تھا اور اشعر کو تمام عمر کے لئے پچھتاؤں کی گہری کھائیوں میں چھوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

قربانی کی راہ میں

سعدیہ عابد

"امی میں نے نہیں جانا ہے۔" وہ روتے ہوئے مستقل انکاری تھی۔

"ابی کی جان، بس کچھ دنوں کی ہی تو بات ہے چلی جاؤ، میں فون کرتا رہوں گا۔"

"میں نہیں جاؤں گی، وہاں میں کسی کو بھی نہیں جانتی۔"

"پلیز مریم، میں پہلے یہ بہت پریشان ہوں تم میری پریشانی کو مت بڑھاؤ۔" اس کا انکار، اس کا رونا وہ کوفت کا شکار ہو گئے تھے۔

"منیب شام تک آجائے گا، تم نے اس کے ساتھ چلے جانا ہے، وہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی، زوہیب کی فیملی بہت اچھی ہے، اس کی مدر، سسٹرز وغیرہ تمہارا بہت خیال رکھیں گی، وہاں جا کر تمہیں اچھا لگے گا۔" وہ اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لئے نرمی سے سمجھا رہے تھے۔

"مجھے آپ کے بغیر کچھ اچھا نہیں لگتا۔" بے بسی سی بے بسی تھی۔

"آپ میرے ساتھ چل رہے ہوتے تو میں کہیں بھی چلی جاتی، آپ خود تو جا نہیں رہے اجنبی، انجان لوگوں میں مجھے بھیج رہے ہیں اور ویسے تو ایک دن کی بھی مجھے چھٹی کرنے نہیں دیتے کہ نقصان ہوگا اور اب پورے ایک مہینے کے لئے مجھے بھیج رہے ہیں، پورا ایک ماہ چھٹی کروں گی تو میرا نقصان ہوگا۔" وہ سوسوں کرتی بولی تھی اور وہ مسکرا اٹھے تھے۔

"کالج میں فی الحال تمہاری لیو دے دوں گا، تم اٹھو اور خالہ بی سے اپنا ضروری سامان پیک کروالو، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا میں بازار سے لا دوں گا، اب انکار بالکل مت کرنا، میں بہت مجبور ہوں اس وقت دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے اس لئے تمہیں زوہیب پر بھروسہ کر کے اس کے گھر بھیج رہا ہوں، کس دل سے بھیج رہا

مکمل ناول

میں ہی جانتا ہوں کہ تمہیں کبھی اک پل کے لئے بھی کہیں اکیلے نہیں بھیجا، اجنبی انجان لوگوں میں بھیج رہا ہوں اس سے ہی میری مجبوری کا اندازہ کرلو۔" وہ اس کو منہ کھولتے دیکھ، چہرہ ہاتھوں میں تھام کر نرمی سے بول رہے تھے اس کے آنسو گرنے لگے۔

"میں بہت جلد تمہیں خود لینے آؤں گا، فون تو صبح و شام کروں گا۔" آزردہ ہوتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے تھے۔

"میں نہیں جانتی کہ آپ کی کیا مجبوری ہے، مگر آپ کہہ رہے ہیں تو چلی جاؤں گی، لیکن مجھے آپ جلدی لینے آئیں گے۔" وہ ان کے چوڑے سینے پر سر ٹکائی روتے ہوئے بول رہی تھی۔

"انشاءاللہ۔" اس کے سر پہ لب رکھے تھے اور وہ اس کے بعد بڑی خاموشی سے جانے کی تیاری کرتی رہی تھی، ساری پیکنگ بوڑھی ملازمہ ساجدہ نے کی تھی، انہوں نے جب اسے پچاس ہزار کی کثیر رقم دی تھی تو وہ چونک اٹھی تھی کہ وہ ان معاملات میں کافی سخت تھے اور کہاں ہزار دو ہزار بھی مکمل انفارمیشن کے بعد کہ کیا کرنا ہے؟ دیتے تھے ایکدم اتنی بڑی رقم وہ حیران اور پریشان رہ گئی تھی۔

"ابی اتنے سارے پیسوں کا میں کیا کروں گی؟"

"احتیاطاً دے رہا ہوں تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو پریشانی نہیں ہوگی کہ وہاں کس سے لوں گی؟ اور یہ سیل فون اپنے پاس رکھنا، اس میں، میں نے اپنے تمام نمبرز سیو کر دیئے ہیں۔" انہوں نے اسے نیا چمچماتا مہنگا ترین موبائل فون دیا تھا اور وہ جسے مسرت سے تھام گئی تھی کہ کالج میں اس کی تمام کلاس فیلو اور دوستوں کے پاس اپنا سیل فون تھا، مگر اسے انہوں نے فون نہیں دلایا تھا اس کے بہت بار ضد اور ریکوسٹ کرنے پر بھی نہیں۔

"تم اپنی کسی دوست سے کوئی رابطہ نہیں کرو گی اور نہ ہی کسی کو یہ بتاؤ گی کہ تم کہاں جارہی ہو؟ یا کہاں ہو؟" موبائل کو دیکھتے ہوئے وہ بری طرح چونکی تھی اور الجھن آمیز نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"ابی آپ کی باتیں اور احتیاطیں میں کچھ سمجھ نہیں پاتی، آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں؟"

"مریم کچھ باتیں ایسی ہیں کہ مجھے احتیاط کرنی پڑتی ہے، وجوہات تمہیں بتا نہیں سکتا، بس تم اپنے ابی پر بھروسہ رکھو اور جب میں ہوں سب کچھ سنبھال سکتا ہوں تو تمہیں کیوں بتا کر پریشان کروں، تم وہاں یہ سوچ کر نہ جاؤ کہ میں تمہیں بہت مجبوری میں بھیج رہا ہوں، بس یہی سمجھو کہ وہاں آؤٹنگ کے لئے جارہی ہو، مگر وہاں بہت محتاط ہو کر رہنا کہ اپنے گھر کی بات ہی اور ہوتی ہے، ان لوگوں کو مزاج نہ جانے کیسا ہو؟ تم کو وہاں اپنا خیال خود ہی رکھنا ہوگا، کہ لڑکیوں کو اپنی حفاظت کرنی آنی چاہیے، میری بات سمجھ رہی ہو نہ؟" وہ اثبات میں سر ہلا گئی کہ کم عمر ہے نادان نہیں ہے اور اس سے زیادہ اچھی طرح سے ساجدہ اسے ان کی ہدایت پر پہلے ہی سمجھا چکی تھی اس لئے اس نے نگاہ جھکا کر گردن کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

"وہاں وقت پر کھانا کھا لینا، میں جانتا ہوں کہ تم کھانے کے معاملے میں کافی چوزی ہو لیکن۔" وہ اسے لے کر بے حد مضطرب تھے، اس کے لئے فکر بھی تھے۔

"ابی میں ینج کرلوں گی، آپ پریشان ہو، میں وہاں کسی کو بھی تنگ نہیں کروں گی۔" وہ ان کی پریشانی محسوس کرتی مدبر سے بولی تھی اور وہ مسکرا دیئے تھے۔

"ہاں جانتا ہوں میرا بچہ بہت اچھا ہے، وہ اپنے ابی کی مجبوریوں کو سمجھتا ہے، جاکر آرام کرلو، سفر کافی لمبا کرنا ہے تھک جاؤ گی۔" اس کی پیشانی چوم لی تھی اور وہ بھیگی پلکوں سے مسکراتی ان کے برابر سے اٹھ گئی تھی اور جس وقت منیب اسے لینے آیا وہ تیار ہی تھی اور دھوپ ڈھلنے ہی والی تھی، شام کا آغاز ہوا ہی چاہتا تھا وہ جلدی سے نیچے آئی تھی اسے ابی کے ساتھ ایک اجنبی خوبرو نوجوان بیٹھا تھا، اس نے باآواز بلند سلام کیا تو وہ دونوں ہی باتیں کرتے چونکے، منیب نگاہ اٹھی تو اٹھی رہ گئی، لمبا قد، گوری رنگت، چھریرا بدن، وہ تعریف کے لائق تھی مگر اس کی نگاہ میں ستائش کی جگہ ناگواری نے بڑی سرعت سے لی تھی کہ وہ ڈھیلی سی پنک شرٹ اور نیلی جینز پہنے ہوئے تھی۔

"منیب یہ ہے میری بہن مریم شاہ اور مریم یہ منیب ہے، میرے دوست زوہیب کا بھتیجا۔" وہ چلتی ہوئی ان کے برابر آ بیٹھی تھی اور وہ تعارف کروانے لگے تھے، وہ مروت میں مسکرائی تھی مگر وہ مروت بھی نبھا نہ سکا تھا اور وہ الجھن آمیز نگاہوں سے تنے تنے نقوش والے حسین چہرے کو دیکھنے لگی تھی کہ وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

"اجازت دیں کہ کچھ کاموں میں ایسا الجھا کہ مجھے آنے میں دیر ہوگئی، ہمیں راستے میں بھی کافی وقت لگے گا۔" اس کا سارا سامان وہ پہلے ہی گاڑی میں رکھوا چکے تھے اور وہ ہینڈ بیگ لینے چلی گئی تھی اور منیب نے سوچا تھا کہ وہ کوئی چادر وغیرہ لے کر آئے گی مگر اسے یونہی واپس آتے دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں تھیں کہ وہ اپنے چاچو کی وجہ سے اس سب کے لئے مجبور ہو گیا تھا ورنہ اپنے ساتھ کسی لڑکی کو لے جانے کا تصور بھی نہ کرتا، وہ لب بھینچے اسے علی شاہ کے سینے سے لگے پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ رہا تھا۔

"ابی میں آپ کو بہت زیادہ مس کروں گی۔" ان کی بھی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"مس یو ٹو مائی چائلڈ۔" نرمی سے کہہ کر اس کے آنسو پونچھے اور اسے خیال رکھنے کی ہدایت کی اور کندھے پر بازو پھیلائے اسے باہر لے آئے، منیب کے ایک اشارے پر ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا تھا۔

"فی امان اللہ۔" پیشانی چومی تھی اور وہ آنسو رگڑتی آگے بڑھی تھی کہ ان کا سیل بجنے لگا، زوہیب شاہ کا فون ہے، بتاتے ہوئے وہ مخاطب ہوئے۔

"زوہیب میری مریم کا خیال رکھنا، تم تو میرے ہم راز ہو، مجبوریوں کو سمجھتے ہو۔"

"بے فکر رہو، مریم کو میرے گھر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی، تمہاری بہن، میری بہن ہے، میرے پیر میں فریکچر نہ ہوا ہوتا تو میں خود مریم کو لینے آتا، تم اب مریم کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ، وہ اب میری ذمہ داری ہے۔" زوہیب شاہ نے اس کے بھرپور انداز میں تسلی دی تھی اور وہ کچھ مطمئن سا ہو کر رابطہ منقطع کر گئے تھے کہ منیب ان کے بات ختم کرنے کے انتظار میں ہی کھڑا تھا، اسے مصافحہ کرکے فرنٹ سیٹ پر بیٹھا اور گاڑی بڑے سے سیاہ گیٹ کے کھلتے ہی نکلتی چلی گئی اور وہ پیچھے دعائیں کرتے رہ گئے۔

☆☆☆

وہ پورے راستے بور ہی ہوتی رہی تھی کہ منیب آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا اور اس نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش بھی نہ کی تھی اور

گاڑی میں سیاہ شیشے لگے تھے اس لئے وہ باہر کے مناظر سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتی تھی اسے اپنی اٹھارہ سالہ زندگی کا پہلا سفر یوں خاموشی سے اور علی شاہ کے بغیر کیا تھا، اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں، اسے کافی دیر سے پیاس لگی تھی مگر اس کے پاس پانی نہ تھا اور اسے مخاطب کرنے کی نہ ہمت ہوئی اور نہ اسے گوارا ہوا کہ جس شخص نے اسے یکسر نظر انداز کیا تھا وہ اس سے کچھ کہتی، گاڑی بہت تیزی سے چل رہی تھی، اسے گاڑی میں بیٹھے تقریباً تین گھنٹے ہو گئے تھے، اتنا ہی وقت مزید لگنا تھا مگر یہ اس کو معلوم نہ تھا کہ وہ پہلی دفعہ انجان راستوں پر گامزن تھی۔

''ایکسکیوز می۔'' وہ سیٹ کی پشت سے آنکھیں موند کر بڑے آرام دہ انداز میں بیٹھا تھا کہ وہ یہ سفر ہر پندرہ دن میں ایک بار ضرور کرتا تھا، وہ نسوانی آواز پر چونکا، آنکھیں کھول کر بیک مرر میں دیکھا اور مرر میں اس کا گلابی چہرہ دکھائی دینے لگا اور اس نے ایک سرد سانس خارج کر کے تھوڑا سا ٹرن ہو کر گردن موڑ کر اسے دیکھا جسے وہ یکسر بھلائے ہوئے تھا۔

''اینی پرابلم۔'' اس کی بھیگی پلکیں اس کی جانب اٹھی تھیں اور اسے شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی کہ اسے اس سے کم از کم کچھ تو بات کرنی ہی چاہیے تھی۔

''مجھے واش روم......'' وہ جھجک کی وجہ سے بول نہیں سکی تھی اور اس نے سیدھے ہوتے ہوئے ڈرائیور کو کچھ ہدایت دی تھی اور اس نے کچھ دور جا کر ایک ہوٹل کے سامنے گاڑی روک دی تھی اور وہ اسے کچھ دیر انتظار کرنے کی ہدایت کرتا گاڑی سے اترا ہوٹل میں جا کر روم ریزروڈ کروایا اور واپس لوٹ کر اس نے بیک ڈور کھول دیا، وہ بڑی خاموشی سے گاڑی سے اتری تھی، اس نے اسے ایک نظر دیکھا، اس کا سراپا قیامت خیز تھا، وہ کچھ سوچ کر مڑا، گاڑی کی بیک سیٹ پر رکھے اپنے بیگ کی زپ کھولی، سیاہ شال نکالی اور بیگ یونہی کھلا چھوڑ کر شال اس کی طرف بڑھائی وہ نافہم انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

''آپ کیا اور کیسے پہنتی ہیں، یہ میرا ہیڈک نہیں ہے، لیکن اس وقت آپ میرے ساتھ ہیں میری ذمہ داری ہیں، اس لئے شال اوڑھ لیں کہ میں نہیں چاہوں گا کہ آپ پر غلط نظریں اٹھیں۔'' اس نے چند ثانیے اسے دیکھا اور شال لے کر دائیں شانے پر ڈال کر آگے سے کھینچ کر بائیں شانے پر پھیلا لی، وہ آگے بڑھ گیا تو وہ اس کے پیچھے چلنے لگی۔

''آپ فریش ہو کر آجائیں میں یہیں آپ کا ویٹ کر رہا ہوں۔'' اس نے روم کا دروازہ کھولا اور اسے مخاطب کیا وہ اندر چلی گئی وہ وہیں ٹھہر گیا تھا وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد لوٹی تھی تو وہ زوہیب شاہ سے بات کر رہا تھا۔

''چلیں؟'' سیل فون جیب میں منتقل کر کے اسے دیکھا تھا۔

''ابھی مزید کتنا سفر باقی ہے؟'' وہ جھجک کر پوچھ رہی تھی کہ اس طرح کسی غیر مرد کے ساتھ سفر کرنے بات کرنے کا پہلا موقع تھا، وہ اندر سے کچھ ڈری ہوئی تھی باہر سے خود کو نارمل ہی پوز کر رہی تھی، مگر وہ اتنا زیرک تو تھا کہ اس کی کیفیت بھانپ گیا تھا۔

''تقریباً دو گھنٹے کا سفر مزید باقی ہے، آپ تھک گئی ہیں تو ہم یہاں کچھ دیر اسٹے کر سکتے ہیں، میں آل ریڈی روم ریزرو بھی کروا چکا ہوں، کوئی پرابلم نہ ہو گی۔'' اس نے نہ چاہتے ہوئے آفر کی تھی مگر اس کے انکار پر ریلیکس ہو گیا تھا کہ دس تو بج ہی گئے تھے۔

''نہیں، اٹس اوکے، میں تو اس لئے پوچھ رہی تھی کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے، مجھے بھوک لگ رہی ہے، ایک گھنٹہ میں تو شاید میری جان ہی نکل جائے، پیاس سے حلق تو خشک ہو ہی گیا ہے۔'' وہ روانی میں بولتی چلی گئی تھی اور اسے شرمندگی سی ہوئی تھی کہ اس نے اس سے پانی تک کا نہ پوچھا تھا کہ خود وہ دوران سفر کھانے پینے سے گریز ہی کرتا تھا۔

''آئی ایم سوری، مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔'' اور اس نے اس کی مرضی کا کھانا آرڈر کر دیا تھا جبکہ اپنے لئے صرف بلیک کافی منگوائی تھی۔

''آپ کھا لیجئے، میں ساتھ نہیں دے پاؤں گا کہ کچھ کھا کر سفر کرنے سے میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے، اسی لئے میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔'' وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی تھی، کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے نگاہ اس کے چہرے پر پڑی، گلابی رنگت کا کتابی چہرہ، کھڑی چھوٹی سی ناک، شنگرفی لب، سیاہ خمدار گھنیری پلکیں جھکی ہوئی تھیں کہ اس کی ساری توجہ کھانے کی طرف تھا کہ وہ کافی مگن انداز میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی، سیاہ لٹیں بے فکری سے ماتھے پر جھول رہی تھیں، نوالہ منہ تک لے جاتے ہوئے وہ یکدم چونکی اور اس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہوتا اس کے گلابی مخروطی انگلیوں والے ہاتھ سے نگاہ ہٹا گیا تھا، وہ کچھ کنفیوژ ہو گئی تھی اور اس کے بعد اس سے کھانا کھایا ہی نہیں گیا، اس نے خفت مٹانے کو چائے، کافی کا پوچھا تھا۔

''میں چائے، کافی نہیں لیتی، مینگو شیک لوں گی۔'' وہ ہر کھانے کے ساتھ جوس پینے کی عادی تھی، وقت بے وقت الگ، وہ کھانے سے فارغ ہو کر اس کے پیچھے ہی چل پڑی تھی، سیٹی کی آواز پر اس کے اٹھتے قدم رکے تھے اور اس نے ان دو نوجوانوں کو ایسی نگاہوں سے دیکھا تھا کہ ان کو بھاگتے ہی بنی تھی اور وہ خود سے دور رہ جانے والی مریم سے کچھ دور عین سامنے رکا۔

''آپ تھوڑا تیز نہیں چل سکتیں۔'' شال ایک شانے سے ہوتی زمین پر جھول رہی تھی، اس کا غصہ بڑھا تھا مگر وہ لب بھینچ کر آگے بڑھ گیا۔

''اف کیسے غصے سے دیکھتے ہیں یہ بندے کی جان ہی نکل جائے۔'' جھرجھری لے کر سوچا اور اس کے پیچھے تیزی سے بڑھی، سوچ اور جلدی کے سبب وہ سیدھی اس کی پشت سے جا ٹکرائی، وہ جو غصہ سے کھولتا چل رہا تھا اس افتاد پر تھما یکدم ہی پلٹا اور وہ جو اس کی پشت سے ٹکرائی تھی اس کے پلٹتے ہی لڑکھڑا گئی اور اس نے بازو تھام کر اسے گرنے سے بچا لیا، دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں تھیں اور وہ ذرو جھجک سے نگاہ چرا گئی تھی اور وہ اس کا بازو آزاد کرتا گاڑی کا دروازہ اوپن کر گیا اور اس کے بیٹھتے ہی اس نے فرنٹ سیٹ سنبھال لی۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب سیاہ پجیرو خاموشی و نیم تاریکی میں ڈوبی شان سے کھڑی سفید حویلی میں داخل ہوئی تھی اور وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بے خبر سو رہی تھی، اس کو کیا کہہ کر مخاطب کر کے کیسے جگائے؟ وہ اس شش و پنج میں تھا اور کچھ سوچ کر اس نے ہارن پر ہاتھ رکھ کر ہٹا لیا اور وہ ہڑبڑا کر آنکھیں کھول گئی تھی، کچھ ثانیے تو سمجھی ہی نہ جیسے ہی حواس بیدار ہوئے وہ گاڑی سے اتر آئی۔

''السلام علیکم!'' زوہیب شاہ کو اس نے سلام کیا تھا اور وہ اس کی خیر خیریت دریافت کرتے اسے لئے اندر آ گئے جہاں انعم اور ارم اس کے ہی انتظار میں جاگ رہی تھیں کہ حویلی میں تو نو بجے ہی سب بے خبر سو جاتے تھے،

زوہیب شاہ نے صرف خود جاگتے رہے بھتیجیوں سے بھی کہا تھا اسی لئے وہ دونوں جاگ رہی تھیں کہ وہ دونوں جڑواں تھیں اور زوہیب شاہ کی لاڈلی تھیں، ارم نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا تھا۔

"آئی ایم سوری، میری وجہ سے آپ سب پریشان ہوئے اور آپ کی نیند بھی خراب ہوئی۔"

"نیند خراب ہوئی ہے، پریشان نہیں ہوئے۔" انعم دوستانہ انداز میں بولی تھی اور وہ اس کی شرارت پر اس کے ساتھ ہی مسکرا دی تھی۔

"تم فریش ہو کر آؤ، میں بوا سے کھانا لگواتی ہوں۔" یہ ارم بولی تھی۔

"میں تو کھانا کھا چکی ہوں، کیا آپ لوگ کھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے؟" وہ شرمندگی سے پوچھ رہی تھی۔

"انعم، بہن کو کمرے میں لے جاؤ، مریم جا کر آرام کر لو، باقی باتیں صبح ہوں گی۔" زوہیب نے محبت سے کہا اور وہ انعم کے ساتھ کمرے میں آ گئی تھی۔

"میں سفر سے بہت زیادہ تھک گئی ہوں، شاور لوں گی۔" وہ اسے اپنے اور ارم کے مشترکہ روم میں لے آئی تھی۔

"ٹھیک ہے میں ملازمہ کے ہاتھ تمہارا سامان بھیج دیتی ہوں، یہ میرا اور ارم کا کمرہ ہے، تم ہمارے ساتھ بھی رہ سکتی ہو اور الگ کمرے......"

"نہیں یہی ٹھیک ہے کہ ویسے تو مجھے اکیلے رہنے کی عادت ہے لیکن نئی جگہ پر اکیلے مجھے ڈر لگے گا۔" اس کو کافی تفصیل سے بات کرنے کی عادت تھی اور وہ باہر آ گئی اس نے محض زوہیب شاہ کے کہنے پر کھانا کھایا تھا ورنہ بھوک تو مر چکی تھی۔

"مجھے پتہ ہوتا کہ آپ لوگ کھانا نہیں کھائیں گے انتظار کریں گے تو میں فون کر کے بتا دیتا۔" وہ صرف ان لوگوں کے خیال سے صرف منہ دھو کر کھانا کھانے آ گیا تھا ورنہ وہ آ کر پہلے نہاتا اور پھر سیر ہو کر کھاتا تھا۔

"اٹس او کے یار، کبھی کبھی یہ سب چلتا ہے۔" وہ اس سے سفر کی بابت پوچھنے لگے تھے۔

"آپ کا پاؤں اب کیسا ہے؟" باتوں کے دوران خیال آنے پر پوچھا تھا۔

"اوہوں ٹھیک ہے۔" مختصراً بولے تھے۔

"گر کیسے گئے تھے آپ؟" وہ پوچھ رہا تھا اور انعم کی دبی دبی ہنسی ان کا خجل ہو کر بھتیجی کو گھورنا وہ الجھ کر سوال دہرا گیا تھا مگر وہ اسے ڈپٹ گئے تھے۔

"خاموشی سے کھانا ختم کرو اور جا کر آرام کر لو۔" اب کے ارم بھی دھیمے سے ہنس دی تھی۔

"بات کیا ہے آخر؟" اس نے بہن کو دیکھا تھا۔

"بتا دوں چاچو؟" انعم نے شرارت سے آنکھیں گھمائیں تھیں۔

"بتا دو، آفت کی پرکالہ، کہ بتائے بغیر کون سا تم کو چین آنا ہے۔" وہ کرسی کھسکا کر اٹھے اور اسٹک کے سہارے دھیمی چال چلتے وہاں سے نکل گئے کہ تین دن قبل وہ ان دونوں کے ہی پیچھے پڑنے پر تفریح کے لئے گئے تھے، لائبہ (ان کی منگیتر) بھی ساتھ تھی، کسی پتھر سے ٹھوکر کھا کر وہ گرنے کو تھی کہ وہ کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے اس کی کلائی تھام گئے تھے، مگر عجلت کے سبب پیر رپٹ گیا تھا، ڈس بیلنس بھی ہوئے تھے مگر خود کو سنبھال گئے تھے، درد تو اس وقت بھی محسوس ہو رہا تھا مگر دھیان نہیں دیا تھا گھر آنے تک تکلیف اور سوجن بڑھ گئی تو ڈاکٹر کو دکھایا اور پتہ چلا کہ فریکچر

ہو گیا ہے اور جب سے ہی ان دونوں نے ان کا ریکارڈ لگایا ہوا تھا کہ چاچی کو بچاتے بچاتے چاچو اپنا پیر تڑوا بیٹھے، ان دونوں نے نہ نہ کرتے بھی سب کو خبر کر دی تھی۔

"بری بات ہے انعم، تم لوگوں کو سب کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔" اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"میں بتانا نہیں چاہتی تھی بھا، لیکن چاچو کو تنگ کرنے میں مجھے ہمیشہ ہی بہت مزہ آتا ہے اور لائبہ، وہ تو اس سب سے اتنی کنفیوژ ہو چکی تھی کہ اس دن سے وہ یہاں آئی ہی نہیں۔" وہ راستے بھر بھی تو اسے چھیڑتی رہی تھیں۔

"رات کافی ہو گئی ہے، جا کر سوؤ، صبح اٹھنے میں دیر کرو گی تو اماں سے ڈانٹ کھاؤ گی۔" وہ دونوں کھانے سے فارغ ہو کر آئیں تو وہ سو چکی تھی اور وہ دونوں کافی دیر تک دھیمی آواز میں گفتگو کرتے ہوئے ہی سو گئی تھیں کہ ان دونوں کو بستر میں گھس کر دنیا جہان کی باتیں کرنے کی عادت تھی اور اسی عادت کی وجہ سے سونے میں دیر ہو جاتی تھی صبح نماز کے لئے ارم تو پھر بھی اٹھ جاتی تھی لیکن انعم، خالدہ سے صلواتیں سن کر ہی اٹھتی تھی۔

☆☆☆

"السلام علیکم۔" اس نے ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی سلامتی بھیجی تھی، اس وقت گھر کے سب ہی افراد موجود تھے، منیب شاہ نے باقی سب کی طرح نگاہ اٹھائی تھی اور اس کو دیکھ اس کی اور زوہیب شاہ کی نگاہ جھک گئی تھی جبکہ خواتین بھی اس کو نائٹ ڈریس میں دیکھ خجالت و شرمندگی کا شکار ہو گئی تھیں اور سلام کا جواب نہ پا کر وہ اپنی جگہ پر جم گئی تھی کہ ڈائننگ ہال میں اس کے آنے سے قبل کافی شور ہنگامہ ہو رہا تھا اب بالکل سکوت

چھایا ہوا تھا، اسے یہی لگا کہ اس کا وہاں آنا کسی کو اچھا نہیں لگا۔

"آئی ایم سوری، شاید آپ لوگوں کو میرا آنا برا لگا ہے، میں تو خود نہیں آنا چاہتی تھی، لیکن ابی، میں واپس چلی جاؤں گی۔" وہ کچھ بتاتے بتاتے رکی پھر جانے کی بات کہی اور آنکھوں میں آنسو لئے پلٹنے لگی تھی کہ نورین بیگم کرسی دھکیل کر اٹھیں اس کو آواز دے گئیں۔

"یہاں کسی کو بھی تمہارا آنا برا نہیں لگا ہے، تم زوہیب کے دوست کی بہن ہو، زوہیب تمہیں انعم ارم سے کم نہیں سمجھتا، تمہارا اتنا ذکر کرتا ہے کہ ہم سب کو تم سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا، آ جاؤ ناشتہ کر لو، پھر میں سب سے تمہارا تعارف کروا دوں گی۔" وہ اپنے مخصوص نرم و شیریں لہجے میں بول رہی تھیں۔

"لل...... لیکن مجھے لگا کہ......"

"نہیں بیٹا، ایسی کوئی بات نہیں ہے، تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہے ورنہ تمہارے آنے سے پہلے ہم تمہاری ہی بات کر رہے تھے۔" زوہیب شاہ نے درمیان میں ہی اس کی بات کاٹ کر کہا تھا اور نورین کے کہنے پر وہ ان کے برابر چیئر پر بیٹھ گئی تھی، اس کے بیٹھتے ہی اس کے عین سامنے چیئر پر بیٹھا منیب شاہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا، اس نے نورین کو دیکھا تھا۔

"ڈونٹ وری، منیب ناشتہ کر چکا ہے۔" وہ بیٹے کے جانے کی وجہ کو سمجھتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لے گئی تھیں، اس کے بعد ناشتہ خاموشی سے کیا گیا تھا اور ناشتہ سے فراغت کے بعد انہوں نے سب کا تعارف کروایا تھا، حویلی میں کل دو مرد زوہیب شاہ اور منیب شاہ تھے، منیب شاہ کے فادر کی ڈیتھ ہو چکی تھی، یہ جو بہن بھائی تھے، منیب بڑا تھا کراچی میں ملٹی نیشنل کمپنی میں بطور انجینئر

ملازم تھا، ارم اور انعم جڑواں تھیں اور حال ہی میں گریجویشن کیا تھا، زوہیب شاہ خود بھی تین بہن بھائی تھے، سب سے بڑے اورنگزیب شاہ تھے اور پھر وہ خود اور ان سے چھوٹی نوین شاہ تھی، زوہیب شاہ کے والد نے دو شادیاں کی تھیں اورنگزیب پہلی بیوی سے تھے جب وہ اٹھارہ برس کے تھے جب ان کی والدہ کی ڈیتھ ہوئی تھی اور شاہ زیب شاہ نے محض چھ ماہ بعد ہی دوسری شادی کر لی تھی، دوسری بیوی سے دو اولادیں زوہیب و نوین تھیں، اورنگزیب شاہ کی شادی 23 برس کی عمر میں ہوئی تھی، اس وقت ان کا بھائی زوہیب شاہ دو برس کا اور بہن نوین چھ ماہ کی تھی، نورین ان کی سگی پھپھو کی بیٹی تھی، شادی کے دو سال بعد منیب ہوا تھا اور وہ اپنے چچا سے صرف چار سال چھوٹا تھا اور انعم ارم چھ سال چھوٹی تھیں، اورنگزیب کے فادر اور سوتیلی ماں کی ڈیتھ چھ سال قبل ایک حادثے میں ہو گئی تھی جبکہ اورنگزیب شاہ کی وفات کو محض ڈیڑھ سال ہوا تھا، نوین اپنے خالہ زاد سے انگیجڈ تھی جو یو کے میں رہائش پذیر تھا، اسی سال ان کی واپسی پر شادی متوقع تھی۔

زوہیب کی منگنی ان کی پسند پر چھ ماہ قبل ہی نورین کی اکلوتی بہن کی اکلوتی بیٹی لائبہ سے ہوئی تھی، ارم اپنے ماموں کے بیٹے ہاشم سے منسوب تھی، نورین تین بہن بھائی تھے، نورین سب سے چھوٹی تھی، قاسم بڑے تھے اور امبرین کے بعد نورین تھیں اور انہوں نے رشتے آپس میں طے کیے ہوئے تھے، بیٹے کے لئے البتہ لڑکی کی تلاش میں تھیں کہ لائبہ ان کے میکے میں اکلوتی تھی، قاسم شاہ کے صرف دو بیٹے تھے، ہاشم اور حشام، حشام تعلیم کے حصول کے لئے بیرون ملک گیا ہوا تھا، حشام کے لئے سب کا ارادہ انعم کے لئے تھا، جبکہ انعم کچھ اور ہی سوچے ہوئے تھی۔

''ہم صرف دو بہن بھائی ہیں، ابی مجھ سے پورے گیارہ سال بڑے ہیں، میری پیدائش سے چھ ماہ قبل ہی بابی کی ڈیتھ ہو گئی تھی، ابی بتاتے ہیں بابی کو کینسر تھا اور ماما مجھے دنیا میں لا کر خود دنیا سے ناطہ توڑ گئی تھیں، میری پرورش ابی اور خالہ بی نے کی ہے، خالہ بی ہماری پرانی ملازمہ ہیں، بابی اور ماما کے جانے کے بعد ہم دونوں کا خیال انہوں نے ہی رکھا تھا، خالہ ہی تو میری ماں کی طرح ہیں کہ ماما تو تھی نہیں، ماما کے سارے فرائض انہوں نے ہی ادا کیے ہیں وہ ابی اور مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں اور میں بھی، اس دنیا میں سب سے زیادہ محبت ابی اور خالہ ہی سے کرتی ہوں، وہی میرا سب کچھ ہیں۔'' ان کے تعارف کروا دینے کے بعد مریم نے اپنے بارے میں تفصیل بتائی تھی، بتاتے بتاتے آخر میں آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے تھے۔

''اوہوں یہاں اتنے سارے لوگ ہیں، تمہیں یہاں بہت اچھا لگے، انعم، ارم اور نوین سے تمہاری بہت اچھی دوستی ہو جائے گی۔'' انہیں وہ بہت سادہ اور معصوم لگی وگرنہ کچھ دیر قبل پہلا تاثر بڑا غلط لگا تھا کہ وہ لوگ روایات کی پاسداری کرنے والے لوگ تھے، سروں پر گھر کی تمام خواتین دوپٹہ لیتی تھیں اس لئے اسے بغیر دوپٹے کے نائٹ ڈریس میں دیکھ شرمندہ ہو گئی تھیں۔

''آنی، مجھے تو آپ بھول ہی گئی ہیں۔'' اسی دم لائبہ نے شوخ سی انٹری دی تھی۔

''میں بھانجی کو بھول سکتی ہوں، دیورانی کو نہیں کہ کچھ سالوں میں حکمرانی بھی تو کرنی ہے نہ دیورانی پر۔'' وہ بھرپور شرارت سے بولی تھیں، ان سب کی دبی دبی ہنسی، وہ جھجل سی ہو گئی تھی۔

''آج یہاں کا راستہ کیسے بھول گئیں ظالم

لڑکی، تم ہی ہو نہ جس نے ہمارے ہینڈسم سے چاچو کی ٹانگ توڑ دی ہے۔" انعم نے مصنوعی غصہ دکھایا تھا اور وہ اسے گھورنے لگی تھی۔

"میں نے کوئی کسی کی ٹانگ نہیں توڑی، معمولی سا فریکچر۔"

"معمولی سا فریکچر۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگی تھی کہ وہ تینوں کورس میں چیخی تھیں ار گڑبڑا گئی تھی، چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"بس بھئی، میری بھانجی کو زیادہ تنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" نورین، انعم کو کچھ بولتے دیکھ اسے شرارت سے ٹوک گئی تھی اور کوئی کچھ کہتا کہ نورین نے لائبہ کا تعارف ان لوگوں کو دلچسپی سے دیکھتی مریم شاہ سے کروایا تھا، وہ کچھ کہتی کہ ملازمہ جو انعم کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی اس کا بجتا ہوا سیل فون لے آئی تھی اور وہ ابی کی کال ہے بتاتی ہوئی اور ایکسکیوزمی کہہ کر ان لوگوں کے درمیان سے اٹھ گئی اور نورین بیٹے کو ناشتہ دینے کے ارادے سے اٹھ گئی تھیں۔

"تم اتنے دن سے کہاں غائب تھیں؟" انعم نے اسے آڑے ہاتھوں لینا چاہا تھا۔

"کوئی بکواس مت کرنا، منگنی کیا ہوئی ہے، تم لوگ تو میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہو، بوا آپ بھی ان دونوں فضول لڑکیوں کے ساتھ مل گئی ہیں اور تو اور آنی بھی، میں گھر میں کتنا بور ہو رہی تھی مگر اس سب کی وجہ سے آئی ہی نہیں اور اس انعم کی بچی کا تو دل کر رہا ہے کہ میں گلا ہی دبا دوں، وہ بات سب کو بتانے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ مسکراتی ہوئی انعم کو گھورنے لگی تھی۔

"کون سی بات۔" وہ معصوم بنی تھی۔

"وہی مجھے گرنے سے بچانے کی کوشش میں چاچو، اپنا پاؤں۔"

"چاچو نہیں، ڈیئر چاچی، زوہیب جانو، کہنے کی عادت ڈال لو۔" وہ دونوں کورس میں بولی تھیں۔

"لاحول ولاقوۃ۔" وہ بری طرح نروس ہو گئی تھی اور وہ دونوں تو اس کے پیچھے ہی پڑ گئی تھیں اس لئے اس نے وہاں سے اٹھ جانے میں ہی عافیت جانی۔

"چاچو، کمرے میں ہیں جا کر ان کی خیریت دریافت کر لو۔" انعم نے اس کے اٹھنے پر شرارت سے کہا تھا اور وہ اس کو گھورتی آگے بڑھی تھی کہ منیب شاہ سے ٹکراتے ہوئے بچی تھی۔

"آگے پیچھے دیکھ کر چلا کریں چاچی صاحبہ، کیوں سب کے ہاتھ پیروں کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔" منیب شاہ کی معنی خیز بات انعم کا قہقہہ، ان دونوں کی ہنسی، وہ سرخ پڑ گئی تھی۔

"تم سب پاگل ہو گئے ہو۔" خجالت مٹانے کو تپ کر بولی اور کچن میں چلی گئی کہ وہ ناشتہ کر کے نہیں آئی تھی، اس کی زوردار ہنسی کی وجہ سے منیب شاہ نے اسے گھورا تھا، مریم نے تقریباً آدھے گھنٹے علی شاہ سے بات کی تھی اور کپڑے تبدیل کر کے لوٹی تھی تو وہ ہال کمرے میں بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا، اس کو پہلا خیال یہی آیا تھا کہ وہ اس نے صرف اس کی وجہ سے ناشتہ نہیں کیا تھا، لیکن کیوں؟ کتنے ہی سوال اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے۔

"انعم، چائے کمرے میں۔" وہ اس کو دیکھ چپ ہو گیا تھا، جو بلیو شرٹ وائٹ ٹراؤزر میں کسی سوچ میں ڈوبی کھڑی تھی۔

"بھا آپ کی چائے۔" انعم کی آواز پہ وہ چونکی اور وہ ان دونوں کو دیکھنے لگی، منیب بہن کے ہاتھ سے چائے کا مگ لئے کمرے کی جانب بڑھ گیا اور وہ بھی بڑی تیزی میں وہاں سے نکلی تھی، اور جاتے ہی اپنا فون اٹھا کر ڈائل کیا۔

"ابی پلیز مجھے لینے آ جائیں، میں یہاں نہیں رہ سکتی ہوں، میری وجہ سے یہ لوگ ڈسٹرب ہو گئے ہیں، مجھے یہاں بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔" وہ پریشان ہو گئے تھے کہ کچھ دیر قبل وہ سب کی تعریف کر رہی تھی اور اب ایکدم۔

"کسی نے تم سے کچھ کہا؟"

"نہیں، مگر زبان سے کہنا ہی تو ضروری نہیں ہوتا، رویے بھی بہت کچھ سمجھا دیتے ہیں، منیب شاہ نے ناشتہ نہیں کیا تھا ان کی مما نے کہا کہ وہ ناشتہ کر چکے ہیں، انہوں نے صرف میری وجہ سے ناشتہ نہیں کیا تھا، مجھے سب سمجھ آ گیا ہے ابی، میں انہیں پسند نہیں آئی ہوں، پورے راستے انہوں نے مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا تھا، انہوں نے مجھے بری طرح نظر انداز کیا تھا، آپ نے مجھے زبردستی مجھے یہاں بھیج کر اچھا نہیں کیا، یہ سب لوگ مروت میں چپ ہیں اور مجھے یہاں نہیں رہنا ہے، مجھے عادت بھی نہیں ہے اور یہ لوگ میری وجہ سے ڈسٹرب ہو گئے ہیں۔" وہ رونے لگی کہ ان کے بغیر پہلی دفعہ کہیں وہ بھی انجان لوگوں میں آئی تھی کہ زوہیب سے بھی چند بار ہی ملاقات ہوئی ہو گی وہ بھی سلام دعا کی حد تک، وہ یہاں آنے پر ذہنی طور پر ہی تیار نہ تھی مزید ڈسٹرب ہو گئی تھی کہ اتنے سارے لوگوں میں کوئی بھی تو شناسا نہیں تھا۔

"ابی کی جان، رونا بالکل نہیں بچے کچھ دن کی تو بات ہے میں تمہیں لینے آ جاؤں گا، تم سب کے رویوں کو چھوڑ کر خود سے پہل کرو، زوہیب کی بہن سے دوستی کر لو، وہ لوگ بہت اچھے ہیں، تمہیں ان کی طرف سے غلط فہمی ہو گئی ہے، جیسے وہ سب تمہارے لئے اجنبی ہیں، تم بھی تو ان کے لئے اجنبی ہو، دھیرے دھیرے ہی تم انہیں وہ تمہیں جانیں گے۔" وہ نرمی سے اسے سمجھا رہے تھے، وہ پہلے ہی بہت بڑا رسک لے چکے تھے، وہ ان کی فکر بڑھا رہی تھی۔

"میں کچھ نہیں جانتی مجھے واپس بلائیں، مجھے یہاں نہیں رہنا ہے۔" لائن کاٹ کر وہ رو پڑی تھی، انعم دروازے سے ہی پلٹ گئی تھی اور اس نے ماں کو اس کی سوچ بتا دی تھی اور انہوں کو اس کی حساسیت سمجھتے ہوئے ان سب کو ہی اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ہدایت کی تھی کہ وہ کافی مہمان نواز خاتون تھیں اور مریم کی باتیں جان کر دکھی بھی ہوئی تھیں کہ جانے انجانے میں وہ لوگ اس کو ہرٹ کر گئے تھے، ان کے دل میں تو کوئی بات پہلے ہی نہ تھی وہ مزید محتاط ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

"دیکھو بھئی نورین، تمام بچے ہی شادی کے قابل ہیں، تم کب تک سوچ بچار ہی کرتی رہو گی؟ ہم آج شادی کی تاریخ لئے بغیر نہیں جائیں گے، کہ منگنی کو دو سال ہو گئے ہیں ہمیں صرف ارم کے گریجویشن مکمل ہونے کا انتظار تھا۔" سندس آج لگی لپٹی کے بغیر بولی تھیں۔

"سندس نے بالکل ٹھیک کہا ہے نورین اور ایک بات اور کہ حشام کے لئے ہم لوگوں کو انعم بہت مناسب لگتی ہے تم اقرار کرو تو ہم دونوں بچیوں کو ساتھ ہی رخصت کروا لیں۔" دل کی بات آج زبان سے کہہ دی تھی اور وہ زوہیب کو دیکھنے لگی تھیں کہ اورنگزیب کے بعد ہر طرح کی ذمہ داری انہوں نے ہی اٹھائی ہوئی تھی۔

"ارم آپ کی امانت ہے، جب چاہیں رخصت کروا لیں، رہ گئی انعم تو ہمیں سوچنے کے لئے کچھ وقت چاہیے۔" وہ بڑے سبھاؤ سے بولے تھے۔

"حشام گھر کا ہی بچہ ہے، سوچ بچار کس

لئے؟"

"بھابھی، لڑکی والے ہیں، یوں بیٹھے بٹھائے تو فیصلہ نہیں کر سکتے اور ویسے بھی انعم کے لئے ہم نے ابھی سوچا نہیں ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ پہلے زوہیب کی شادی ہو جائے، اس لئے ارم اور زوہیب کی شادی ساتھ کرنے کا ارادہ ہے، انعم کی سال ڈیڑھ سال بعد منیب کے ساتھ کریں گے۔" وہ تو جیسے ساری پلاننگ کیے ہوئے تھیں، زوہیب نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر وہ اشارے سے منع کر گئیں تھیں اور نورین کے بھائی بھاوج، انعم، ارم کی شادی کی ڈیٹ لے گئے تھے کہ وہ تیاری تو کر ہی چکی تھیں مگر نوین سے پہلے ارم کی شادی کرنا نہیں چاہ رہی تھیں اس لئے تامل کا شکار تھیں پھر کچھ سوچ کر راضی ہو گئیں کہ رات ان کی نوین کی خالہ اور ہونے والی ساس سے بات ہوئی تھی کہ ان لوگوں کا فی الحال آنا ممکن نہیں تھا، اس لئے وہ لوگ اگلے سال آئیں گے اور وہ ایک نوین کی وجہ سے کتنی شادیاں ڈیلے کرتیں کہ لائبہ کے پیرنٹس بھی شادی پر زور ڈال رہے تھے کہ وہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو کر حج ادا کرنے جانا چاہتے تھے، جمادی الثانی تو چل ہی رہا تھا اس لئے وہ اسی آنے والی عید پر شادی کرنے پر زور ڈال رہے تھے اس لئے انہوں نے ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے اپنی بھاوج کی مرضی و خوشی کے مطابق اگلے مہینے کی ڈیٹ دے دی۔

☆☆☆

"بھابھی، نوین سے پہلے میں شادی کیسے کر سکتا ہوں؟"

"میں نے فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر لیا ہے زوہیب، کہ ایکدم سب بچوں کی شادیاں نہیں کر سکتے اور جب تک شرجیل اور اس کی فیملی یو کے سے نہیں آ جاتی، ہم نوین کی شادی نہیں کر سکتے اسی لئے میں نے ارم اور تمہاری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔" وہ رات سے اب تک خالدہ سے ہوئی گفتگو بتا نہیں سکی تھیں۔

"ایسی ہی بات ہے تو آپ فی الحال ارم اور انعم کی ایک ساتھ کر دیں۔" ساری بات جان کر بولے تھے۔

"تمہیں شادی کرنی ہی ہے نہ تو ابھی کرنے میں کیا حرج ہے؟ ویسے بھی میں حشام کو دیکھنا، پرکھنا چاہتی ہوں، چار سالوں سے باہر ہے، جانے سمجھے بغیر میں اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتی ہوں کہ میں نوین کو لے کر ہی پریشان ہوں، تمہیں وہاں جا کر شرجیل سے ملنا چاہیے، کوئی دوسری بات ہی نہ ہو کہ جب اورنگزیب اور بابی نے یہ رشتہ طے کیا تھا میں اس وقت بھی اس کے حق میں نہ تھی کہ خالدہ شروع سے ہی یو کے میں رہی ہیں، ہم ان کے رہن سہن کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور اب آ رہے ہیں، نہیں آ رہے، میں اس سب سے کافی پریشان ہو چکی ہوں۔" وہ کافی صاف گوئی سے بول رہی تھیں کہ انہیں نوین، انعم اور ارم سے کم عزیز نہیں تھی۔

"یہ سب باتیں تو مجھے بھی پریشان کرتی ہیں بھابھی، لیکن اس سب میں ہم کر ہی کیا سکتے ہیں؟" فکر مندی سے بولے تھے۔

"تمہاری خالہ کے مزاج کے سبب ہی میں نے وہاں جا کر صورتحال دیکھنے کو خواہش کے باوجود نہیں بھیجا، کہ وہ اس سب کو غلط انداز میں ہی نہ لے لیں، اس لئے میں چاہتی ہوں کہ تم شادی کر لو کہ شادی تو ایک دن تم نے کرنی ہی ہے، شادی کے بعد لائبہ کو لے کر سیر کے بہانے چلے جانا، بات بھی خراب نہ ہو گی اور صورتحال بھی پتہ چل جائے گی۔" انہوں نے کافی سمجھداری

سے ہر ایک بات کا جائزہ لے کر اس سے بات کی تھی۔

"واہ بھابھی، آپ کی عقل کی تو داد دینی پڑے گی۔" اس نے بھابھی کو سراہا تھا۔

"جناب ہم تو شروع سے ہی ذہن و عقلمند ہیں ہاں آپ اپنے فائدے کے وقت تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں تو الگ بات ہے۔" انہوں نے چھیڑا تھا اور وہ جھینپ گئے تھے۔

پھر یکدم ہی سفید حویلی میں نئے ہنگامے جاگ اٹھے تھے، منیب اگلے ہی دن واپس چلا گیا تھا کہ اسے آفس جانا ہوتا تھا وہ سیچر ڈے نائٹ کو آتا تھا، سنڈے نائٹ لوٹ جاتا تھا، لیکن اس دفعہ تو منڈے کو نکلا تھا، خوامخواہ میں ایک دن کی چھٹی ہوگئی تھی کہ وہ ماں کے روکنے پر رک گیا تھا، مریم کو یہاں آئے ہوئے تقریباً پندرہ دن ہو گئے تھے، اس کی ارم، انعم اور نوین سے کافی اچھی دوستی ہوگئی تھی، شادی کی تیاریوں میں ان سب نے اس کو گھر کے ایک فرد کی طرح ہی شامل کیا ہوا تھا، حیدر آباد کی تمام مشہور جگہیں وہ اسے دکھا چکے تھے کہ انعم کو گھومنے پھرنے کا بے حد شوق تھا، ہر دوسرے دن وہ زوہیب کو آؤٹنگ پر جانے کے لئے راضی کر لیتی تھی اور آج کل لائبہ کی جگہ مریم ان کے ساتھ ہوتی تھی کہ تاریخ پکی ہونے کے بعد لائبہ نے سفید حویلی آنا چھوڑ دیا تھا یہ اور بات تھی کہ جب انعم اسے ہر بات بڑھا کر چڑھا کر بتاتی تو اس کا دل مچلنے لگتا کہ وہ بھی گھومنے پھرنے کی بے حد شوقین تھی، مریم اس سب کو بہت انجوائے کر رہی تھی کہ علی شاہ اسے ہر ویک اینڈ پر گھمانے لے جاتے تھے، مگر یہاں انعم کی شرارتیں ان سب کی نوک جھونک ان تمام چیزوں کو اس نے بہت مس کیا تھا کہ اپنوں کی کمی اسے بے حد محسوس ہوتی تھی کیونکہ لے دے کر علی شاہ ہی اس کا سب سے اہم رشتہ تھے اور وہ سنجیدہ مزاج تھے۔

ایک حد تک ہی بہن کا ساتھ دیتے تھے اور یہاں اسے ڈھیر سارے اپنائیت بھرے رشتے مل گئے ہیں، وہ یہاں آنے سے جتنا بے زار تھی اب یہاں آ کر اتنی ہی خوش ہوگی۔

☆☆☆

"مما میں آپ کی کچھ ہیلپ کروں؟" وہ تینوں زوہیب شاہ کے ساتھ شاپنگ پر گئی ہوئی تھی، اس کا موڈ نہ تھا اس لئے منع کر دیا، عصر کی نماز ادا کیا اور کچن میں آ گئی اور نورین سے بولی جو ملازمہ کے ساتھ رات کے کھانے کی تیاری کروا رہی تھیں وہ انہیں انعم کی طرح مما، نوین کو بوا اور زوہیب کو چاچو کہنے لگی تھی۔

"اچھا تم کیا کرو گی۔" وہ مسکرائی تھیں۔

"جو آپ کہیں گی؟ میں وہ کر لوں گی۔" وہ جوش میں آ گئی تھی۔

"تم نے کبھی کوکنگ کی ہے؟" انہوں نے اسے دیکھا، پنک ٹی شرٹ، بلو جینز میں اونچی سی پونی ٹیل بنائے وہ بڑی بڑی روشن آنکھوں اور سرخ و سفید رنگت والے چہرے پر اشتیاق سجائے ان کے سامنے کھڑی تھی۔

"نہیں لیکن مجھے شوق بہت ہے، خالہ بی نے کہا تھا کہ وہ مجھے انٹر کے ایگزامز کے بعد کوکنگ سکھائیں گی، لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ مجھے کچھ نہیں آتا۔" وہ اس کو غور سے سنتیں اس کے معصومیت سے کہنے پر مسکرائی تھیں اور وہ جوش سے انہیں جو کچھ آتا ہے وہ بتانے لگی تھی۔

"مجھے ایگ بوائل کرنا آتا ہے، فرائز بنانا آتا ہے، فرنچ ٹوسٹ بنانے آتے ہیں، شامی کباب بھی بنا لیتی ہوں، چائے، کافی اور تمام جوسز میں با آسانی بنا لیتی ہوں، کیونکہ جوس میں

اور چائے کافی ابی شوق سے پیتے ہیں اور مما مجھے کیک، بیک کرنا آتا ہے اور پیزا تو میں اتنا مزے کا بناتی ہوں کہ ایک پیزا میں اور ابی آرام سے کھا لیتے ہیں، خالہ بی کے لئے تو بچتا ہی نہیں ہے۔" وہ کافی کھنکتے لہجے میں انہیں یہ سب بتاتی ہنس دی تھی، نورین اس کی معصومیت پر خود بھی ہنس دیں۔

"پھر تو میں تم سے پیزا ضرور بنواؤں گی، منیب کو بہت زیادہ پسند ہے اور کل تم سے ناشتہ میں انڈے فرائی کرواؤں گی، دیکھوں گی تو سہی کہ تمہیں انڈہ فرائی کرنا آتا بھی ہے کہ نہیں۔" وہ اس کے پھیکے پڑ جانے والے چہرے کو کچھ حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے مما۔" وہ بدقت تمام مسکرائی تھی کہ وہ منیب کے نام پر خاموش ہو گئی تھی اس کا رویہ اسے سمجھ نہیں آیا تھا اور اس کا مستقل نظر انداز کرنا وہ ہرٹ ہوئی تھی۔

"ابھی بتائیے نہ میں کیا کروں؟" وہ ان کو دیکھنے لگی تھی جب بھی انہیں دیکھتی تھی اسے بہت اپنائیت محسوس ہوتی تھی اور دل میں خیال آتا تھا کہ اس کی مما ہوتیں تو شاید وہ بھی ایسی ہی ہوتیں، جیسے وہ انعم و ارم کا خیال رکھتی تھیں، اس کی مما اس کا خیال رکھتیں۔

"مریم کیا ہوا ہے بیٹا میری کوئی بات بری لگ گئی ہے؟" اس کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسو انہیں پریشان کر گئے تھے۔

"نن...... نہیں آپ تو بہت اچھی ہیں، میری مما ہوتیں نہ تو وہ بالکل آپ کی طرح ہوتیں۔" وہ ان کے ہاتھ تھام گئی تھی۔

"میں یہاں نہیں آنا چاہتی تھی کہ ابی کے بغیر کہیں جانے کی مجھے عادت نہیں ہے، مگر یہاں آ کر مجھے بہت اچھا لگا آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں، میں یہاں سے جب چلی جاؤں گی تو آپ سب کو خاص، آپ کو بہت بہت زیادہ یاد کروں گی، کیا آپ مجھے یاد کریں گی؟" اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

"ہم سب تمہیں، خاص میں تمہیں بہت یاد کروں گی۔" وہ نرمی و پیار سے بولی تھیں اور وہ کھل اٹھی تھی اور بے ساختگی میں ان کا گال چوم لیا تھا، پھر احساس ہوتے ہی خجل ہو گئی تھی اور جھجک کر انہیں دیکھا تھا وہ مسکرا دی تھیں۔

"میں عصر کی نماز پڑھ لوں، وقت تنگ ہو رہا ہے، تم باہر آ جاؤ، ابھی تمہاری ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے کہ تم ابھی بہت چھوٹی ہو اور ان کاموں کے لئے تو عمر پڑی ہے، انعم کو تو خیر شوق ہی نہیں ہے، ارم کو میں زیادہ گھسنے نہیں دیتی کہ لڑکیوں کو کام آنے سب چاہیے اس لئے اس کو سکھا سب دیا ہے کہ اسے شوق بھی بہت ہے، مگر کام فی الحال کرواتی محض ضرورت کے وقت ہوں اس لئے ابھی تم سے بھی نہیں کرواؤں گی۔" وہ اس کا گلا تھپتھپا کر اس کا ہاتھ تھامے کچن سے نکل آئی تھیں اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں تو وہ لان میں آ گئی کہ جانتی تھی کہ وہ اب مغرب کی نماز پڑھ کر ہی لوٹیں گی کہ عصر کی نماز کے بعد مختلف تسبیحات پڑھتی تھیں۔

لان میں ٹہلتے ہوئے اسے بوریت کے ساتھ علی شاہ یاد آنے لگے تھے اور اس لئے وہ اندر آ گئی ملازمہ سے روم سے سیل فون منگوایا اور ہال کمرے میں صوفے پر بیٹھ گئی، اس نے علی شاہ کا نمبر ملایا تیسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

"وعلیکم السلام بیٹا اس وقت میں میٹنگ میں ہوں فارغ ہوتے ہی کال کروں گا اپنا خیال رکھنا۔" وہ سلام کا جواب دے کر نرمی سے بولے تھے اور وہ او کے کہہ گئی تھی۔

"آخر ابی کی ایسی کیا مجبوری ہے جو انہوں نے مجھے اجنبی انجان لوگوں میں بھیج دیا؟ نہ جانے کیا بات ہے؟ جو ابی مجھ سے چھپاتے ہیں؟ بچپن سے ہی میری ایکسٹرا حفاظت کی، جیسے میرے کھو جانے کا ڈر ہو، کبھی مجھے کہیں اکیلے جانے نہیں دیا، ہمیشہ میرا سایہ بنے رہے اور اب ایکدم ہی مجھے اتنی دور اکیلے بھیج دیا، کوئی بات ہے تو ابی مجھے بتا کیوں نہیں دیتے اور بات ہو کیا سکتی ہے؟ ابی کس بات کو لے کر پریشان اور خوفزدہ ہیں، ہاں ابھی مجھے میرے معاملے میں خوفزدہ ہی لگتے ہیں اسکول اور پھر کالج میں بھی ان کی کتنی کالز آتی تھیں، مجھے خود چھوڑنا خود پک کرنا، کہیں آنے جانے نہ دینا، آخر کیا بات ہو سکتی ہے؟" وہ بہت گہری سوچوں میں تھی اس لئے قدموں کی چاپ پر بھی نہیں چونکی تھی جبکہ منیب کی نگاہ پڑی تھی تو وہ اسے دیکھے گیا، وہ خیالوں میں ڈوبی کسی شاعر کی غزل لگ رہی تھی، اداس پریشان کھوئی کھوئی غزل اور غور سے دیکھنے پر اسے معلوم ہوا تھا، اس کی گلابی رنگت سرخ ہو رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو آنسو قطرہ قطرہ گر رہے تھے اور رخساروں کو تر کرتے جا رہے تھے، وہ صوفے پر پاؤں چڑھائے گھٹنوں پر ہاتھ اور ہاتھوں پر ٹھوڑی ٹکائے وہ اس کو مبہوت کر گئی تھی، اسے بیٹھے اور اسے دیکھتے یونہی پانچ منٹ گزر گئے اس کی لو دیتی آنکھوں کی تپش بالآخر اس کو خیالوں سے نکال لائی، اس نے چہرہ اونچا کر کے اسے دیکھا اور وہ اس کی جھیل سی آنکھوں میں اپنا آپ ڈوبتا محسوس ہی کرنے لگا تھا کہ اس نے نگاہ جھکالی، صوفے سے اتری اور آنسو رگڑے وہ پنک ہاف سلیوٹی شرٹ اور بلو جینز میں سانچے میں ڈھلے قیامت خیز سراپے کے ساتھ اس کے سامنے تھی، کمرے میں خاموشی تھی اور اس نے

گڑبڑا کر سلام کر دیا اور اس نے نگاہ ہٹا کر خود کو کمپوزڈ کرتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور گھر والوں کے بارے میں پوچھا۔

"مما نماز پڑھ رہی ہیں، باقی سب شاپنگ پر گئے ہوئے ہیں۔" اس نے بالوں کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بتایا تھا اور پاؤں میں سلیپر پہنتی وہاں سے نکلی تھی، اسے ملازمہ کہیں نظر ہی نہیں آئی اور وہ خود ہی اس کے لئے پانی لے کر آئی تو وہ وہاں نہ تھا اور وہ واپس کچن میں آ گئی، چائے بنائی، ٹرے میں چائے کا کپ اور پانی کا گلاس اٹھائے سیڑھیاں چڑھتی اس کے کمرے کا دروازہ بجانے لگی۔

"آپ نے کیوں زحمت کی، یہ بوا کہاں ہیں؟" اس کو ٹرے تھامے دیکھ کر بولا تھا۔

"بوا نماز پڑھ رہی تھیں اس لئے میں لے آئی۔" وہ سادگی سے بولی تھی اور وہ ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے "تھینکس" کہہ کر ٹرے تھام گیا اور وہ دروازے سے ہی پلٹ گئی اس کے ذہن میں تھا کہ وہ اس سے کھانے کا پوچھے گی لیکن اس کی بے رخی بے حد کھلی تو ارادہ بدل گئی۔

منیب کا نہانے کا ارادہ تھا لیکن مزیدار اسٹرانگ چائے نے ساری جیسے تھکن ہی اتار دی مگر وہ لیٹا تو کچھ ہی دیر میں سو گیا، رات کے ساڑھے نو بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی اور فریش ہو کر وہ نیچے آ گیا کہ اسے بے حد بھوک لگی تھی، صبح نو بجے کے دو سلائس کھائے ہوئے تھے۔

☆☆☆

"بس اب اٹھ جاؤ لڑکیوں اور جا کر سوؤ، باقی پیکنگ کل کر لینا۔" ارم کے لئے اور لائبہ کے لئے وہ جو کچھ خرید کر لا رہے تھے ساتھ ہی پیک بھی کرتے جا رہے تھے کہ، ان چاروں کو ہدایت دیتیں آگے بڑھیں اور بیٹے کو دیکھ والہانہ انداز

میں اسے دیکھتیں اس کی طرف آ گئیں۔

"ارے بیٹا تم کب آئے؟" کچھ حیرانگی سے پوچھا تھا۔

"میں تو شام کو ہی آ گیا تھا مما، جب آپ نماز پڑھ رہی تھیں، آپ کو انہوں نے نہیں بتایا؟" اس نے ماں کو سلام کر کے ان کو بازوؤں کے گھیرے میں لیتے ہوئے مریم کو دیکھا تھا جو گڑبڑا گئی تھی کہ وہ سب ہی اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"وہ میرے ذہن سے نکل گیا تھا ورنہ میں آپ لوگوں کو بتا دیتی۔" اسے اس پر نہ جانے کیوں غصہ تھا اس لئے اس نے غصہ میں انہیں نہیں بتایا تھا کہ وہ ویسے بھی یہ سوچ نہیں پائی تھی کہ اس کے آنے کا کیسے بتائے؟ کیا کہہ کر اسے مخاطب کرے، اس لئے اس نے کھانے پر اس کا ذکر ہونے کے باوجود بھی کچھ نہیں کہا تھا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے، منیب کون سا کہیں کا پرائم منسٹر ہے کہ بندے کے یہ ذہن پر ہی سوار ہو جائے۔" نوین نے بھتیجے کو چھیڑا تھا۔

"پھپھو میں آپ کے پرائم منسٹر صاحب سے کہیں گناہ اچھا ہوں کہ کم از کم سزا یافتہ تو نہیں ہوں۔" وہ بھی شوخی سے بولا تھا اور وہ سب ہی مسکرا دیئے تھے سوائے مریم شاہ کے، وہ وہاں سے بھاگنے کا سوچ رہی تھی۔

"مما کچھ کھانے کو دے دیں، مجھے سخت بھوک لگی ہے، آتے ہی سو گیا تھا، اب بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔" وہ مریم کے کنفیوژ ہو جانے والے چہرے سے نگاہ ہٹا کر بولا تھا۔

"بھابھی آپ جا کر آرام کر لیں، منیب کو کھانا میں دے دوں گی۔" نوین اٹھتے ہوئے بولی تھی اور وہ سونے چلی گئی تھیں۔

"بیٹھو تم کہاں چل دیں؟" انعم نے مریم کو روکنا چاہا تھا مگر وہ رکی نہیں تھی۔

"میں اب سوؤں گی مجھے نیند آ رہی ہے۔" نوین نے کھانے کے بعد اسے چائے دی تھی اور اس کے کھانا کھانے تک شادی کی تیاری کی تفصیل بتاتی رہی تھی۔

"چاچو، جلدی سو گئے ہیں ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بھائی شادی کی تیاریوں کے ساتھ آفس میں ریگولر جا رہے ہیں، صبح آفس، شام شاپنگ اس سب سے تھک جاتے ہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

"جی مجھے اندازہ تھا اس لئے میں آفس سے ایک ماہ کی چھٹی لے کر آیا ہوں چاچو، کی شادی ہے میں چاہتا ہوں کہ وہ بھرپور طریقے سے انجوائے کریں نہ کہ ذمہ داریوں تلے پھنسے رہیں، اب سارے انتظامات میں سنبھال لوں گا۔" وہ اس کی اتنی پرواہ پر مسکرا دی تھی، اس کے بعد سارے انتظامات اس نے سنبھال لئے تھے، فرنیچر سے لے کر کراکری تک اور کپڑے بھی کہ وہ ہر روز ان لوگوں کو نہیں لے جا سکتا تھا اور اس پر ارم کو تو کوئی اعتراض نہ تھا کہ منیب کی چوائس نہایت اعلیٰ تھی اس کے لائے ہوئے کپڑے سب ہی کو بے حد پسند آئے تھے مگر انعم کا منہ بنا ہوا تھا کہ وہ ہر چیز اپنی پسند کی لینے کی عادی تھی اور اس کے واویلوں اور رونے سے تنگ آ کر ہی انہوں نے منیب سے کہا تھا کہ وہ ان لڑکیوں کو ایک دفعہ لے جائے۔

"مما اس نے کون سا ایک ہی دفعہ میں، ساری شاپنگ کر لینی ہے، ہر اچھی بھلی چیز کو بڑی آسانی سے ریجیکٹ کر دیتی ہے، اس کے تنگ کرنے کی وجہ سے ہی تو میں اسے ساتھ......"

"میں چاچو کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" وہ

تپ کر بولی تھی۔

"تمہیں بگاڑنے میں چاچو کا ہی ہاتھ ہے۔" وہ کچھ غصہ سے بولا تھا۔

"مما......" وہ ٹھنکی تھی۔

"منیب تم اسے ساتھ لے جاؤ مشکل سے ہفتہ بھی نہیں رہ گیا ہے، سب کی تیاری آل موسٹ کمپلیٹ ہو گئی ہے اسے خود جائے بغیر چین نہیں آئے گا، اس لئے تم انعم اور مریم کو لے جاؤ، اس بچی نے بھی تو شاپنگ کرنی ہے، اتنی دفعہ وہ ساتھ گئی مجال ہے جو ان لوگوں نے اسے کچھ دلایا ہو۔" وہ قدرے غصہ سے بولی تھیں۔

"بھابھی مریم نے ہمارے بہت کہنے پر بھی کبھی کچھ نہیں لیا، کہ وہ انعم سے کہیں زیادہ چوزی لگتی ہے مجھے۔" نوین نے اپنا دفاع بھرپور انداز میں کیا تھا۔

"آئی ایم سوری مما، وہ جس طرح کی ڈریسنگ کرتی ہیں میں انہیں مارکیٹ ساتھ لے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہوں، آپ انعم اور انہیں چاچو کے ساتھ ہی بھیج دیجئے گا۔" وہ دو ٹوک انداز میں بولا اور ان کی سنے بغیر کمرے کی طرف بڑھ گیا اور وہ کچن کی دہلیز پر ہی جمی رہ گئی تھی، آنسو قطرہ قطرہ آنکھوں سے گرنے لگے تھے اور اس کے ذہن و دل میں یہ بات پختہ ہو گئی تھی کہ وہ اسے ناپسند کرتا ہے، مگر وجہ جاننے سے وہ قاصر ہی تھی کہ وہ اس پر بھی الجھ گئی تھی، کہ وہ ایسی کس طرح کی ڈریسنگ کرتی تھی جو اس نے اس طرح سے کہہ دیا؟ وہ صرف قمیض شلوار ہی تو نہیں، پہنتی وگرنہ اس کا لباس عامیانہ اور گھٹیا تو ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ شرٹس اور ٹی شرٹس بھی کافی ڈھیلی ہی پہنتی تھی۔

☆☆☆

"پلیز چاچو میرا موڈ نہیں ہے۔" زوہیب کے پیار و شفقت سے فورس کرنے پر اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔

"مریم کیا ہوا ہے؟ آپ کو کسی نے کچھ کہا۔" وہ چند ہی دنوں میں اسے کافی اپنائیت محسوس کرنے لگے تھے، وہ انعم اور نوین کی طرح ہی انہیں عزیز ہو گئی تھی۔

"مجھے ابی بہت زیادہ یاد آ رہے ہیں، وہ میری تو سن ہی نہیں رہے، آپ ان سے کہیں نہ مجھے وہ لینے آ جائیں۔" آواز بھرا گئی تھی۔

"اس کی کچھ مجبوریاں ہیں مریم بیٹا، بس کچھ دنوں کی بات ہے پھر وہ آپ کو لے جائے گا، ڈونٹ وری۔" وہ اس افتاد پر گھبرائے اور متحیر بھی رہ گئے تھے لیکن انہوں نے نہ خود کو نہ اس کو کچھ محسوس ہونے دیا اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ایسی کیا مجبوریاں ہیں ان کی، وہ مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں ہیں۔" اس نے سر اٹھا کر انہیں شاکی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"وہ آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتا بس اس لئے اور آپ رونا بند کرو اور تیار ہو کر آ جاؤ کہ یہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا میری ایک بہن تو میری شادی میں اچھی لگے اور ایک، نہیں میں انعم سے زیادہ اچھی تمہیں شاپنگ کرواؤں گا۔" انہوں نے انعم کی طرح اس کا گال تھپتھپایا تھا اور انعم چیخ پڑی تھی۔

"وہ کس خوشی میں چاچو، یہ مت بھولیں کہ میں آپ کی لاڈلی بھتیجی ہوں۔" وہ صوفے سے اٹھ کر ان کے سامنے آ گئی تھی۔

"تم بھتیجی ہو تو کیا ہوا یہ میری بہن ہے اور بہنوں کا حق زیادہ ہوتا ہے۔"

"نہیں جی میرا حق زیادہ ہے۔" وہ ٹھنک کر کہتی اس کے کندھے سے جا لگی تھی۔

"تم چاروں ہی میرے لئے بہت اہم ہو، اس لئے ایسا کرو چاروں ہی چلو میں تم سب کو شاندار سی شاپنگ کرواؤں گا وہ بھی اپنی پسند سے۔" انہوں نے اس کی ناک کھینچی تھی۔

"میں جو کچھ لوں گی اپنی پسند سے لوں گی۔" وہ فوراً ہی بولی تھی اور وہ مسکرا دیے تھے اور وہ جس وقت تیار ہو کر کمرے سے نکلی اس کو دیکھ کر منیب شاہ بیٹھے سے کھڑا ہو گیا تھا کہ وہ بلیک عبایہ میں اسکارف سے سر اچھی طرح ڈھانپے کافی پاکیزہ لگ رہی تھی، مگر وہ اسے نظر انداز کرتی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی، اس نے نورین کا عبایہ پہنا ہوا تھا، جو انہوں نے اسے فرسٹ ٹائم ان سب کے ساتھ آؤٹنگ پر جاتے ہوئے یہ کہہ کر دیا تھا کہ "مریم بیٹا، باقی سب بچیاں عبائے میں جائیں گی اور تم نہیں تو کچھ عجیب لگے گا اس لئے تم میرا عبایہ پہن جاؤ یہ پرانا نہیں ہے، میں نے صرف دو دفعہ ہی پہنا ہے۔"

"ممی آپ کی کوئی بھی چیز یوز کرنا مجھے بے حد اچھا لگے گا، میں نے کبھی عبایہ پہنا نہیں ہے، آپ کہہ رہی ہیں تو میں عبایہ پہن کر ہی جاؤں گی۔" اس نے اگر ان کو منہ سے ماں کہا تھا تو انکا احترام بھی کر رہی تھی کہ شرٹ اور جینز میں وہ کافی اچھی بھی لگتی تھی اور نمایاں بھی ہوتی تھی کہ وہ کوئی اسکارف وغیرہ بھی نہیں لیتی مگر انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ دھیرے دھیرے اسے مشرقی لباس کی طرف لے آئیں گی کہ وہ مغربی لباس ضرور پہنتی تھی، مگر گھٹیا نہیں، اس کے بعد وہ ان لوگوں کے ساتھ کہیں بھی گئی تھی تو عبائے میں ہی گئی تھی۔

"منیب تم کہیں جا رہے ہو؟" ان دونوں کے بیٹھنے کے بعد انہوں نے ڈرائیونگ ڈور کھولا ہی تھا کہ انہیں منیب آتا دکھائی دیا اور وہ اسکے قریب آتے ہی پوچھ بیٹھے۔

"جی چاچو وہ احمد کی طرف جا رہا ہوں۔" اس نے بچپن کے دوست کا نام لیا تھا جس سے اب جب ہی مل پاتا تھا جب چھٹی گزارنے حیدر آباد آتا تھا۔

"یار! احمد کی طرف کل چلے جانا، ابھی تم انعم کو مارکیٹ تک لے جاؤ سچ اس وقت بہت تھکا ہوا ہوں، مگر انعم کو انکار نہیں کر سکا تھا۔" اس نے ان کے خوبرو چہرے پر تھکن کے آثار دیکھے تھے۔

"اور میں آپ کو انکار نہیں کر پا رہا ہوں، مگر اپنی لاڈلی سے کہہ دے جو خریدنا ہو جلدی خریدے۔" اس نے ان کو انکار کرنا ہی نہیں تھا کہ ان دونوں میں چاہے بہت زیادہ بے تکلفی تھی مگر وہ ان کا بہت احترام کرتا تھا، زوہیب شاہ کی گاڑی سے اترتے ہوئے اس نے بھائی کی بات سن تھی۔

"چاچو! اپنے بڑے ہوئے بھتیجے سے کہہ دیں کہ چلنا ہے تو چلیں، میں کوئی چیز جب تک پسند نہیں آئے گی میں نہیں خریدوں گی اور نہ ہی شاپنگ کیے بغیر واپس آؤں گی۔" وہ جانتی تھی کہ اب وہ غصہ سے پیچ و تاب تو کھا سکتا ہے جانے سے انکار نہیں کر سکتا، اس لئے بے نیازی سے کہتی اس کی گاڑی میں جا بیٹھی تھی، (وہ گاڑی جو اس کے استعمال میں رہتی ہے اس کے بابی کی ہے)۔

"چاچو! میرا دل نہیں کر رہا، اس لئے میں نہیں جا رہی۔" اچانک مریم نے جانے سے معذرت کی تھی۔

"میں ساتھ چلوں گا تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ گڑبڑا گئی تھی۔

"مجھے کسی کے بھی ساتھ جانے میں اعتراض ہیں ہے مگر کسی کو مجھے ساتھ لے جانے میں اعتراض ضرور ہو سکتا ہے، بس یہی سوچ کر ارادہ بدلنا چاہا تھا، مگر آپ بضد ہیں تو میں چلی

جاتی ہوں۔" وہ نرم لہجے میں کہتی ان دونوں کو ہی چونکا گئی تھی اور ایک غصیلی نگاہ منیب شاہ پر ڈالتی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔

"تم نے مریم کو کچھ کہا ہے؟ میں نے فیل کیا ہے کہ تمہیں اس کا آنا برا لگا۔"

"مجھے کسی کے آنے نہ آنے سے فرق نہیں پڑتا، اس لئے مجھے برا نہیں لگا ہے ہاں، آپ کی نئی نویلی بہن کی ڈریسنگ مجھے ضرور بری لگتی ہے اور اسی لئے میں انہیں ساتھ لے جانا نہیں چاہتا تھا۔" وہ سنجیدگی سے کہتا گاڑی میں جا بیٹھا تھا۔

"ایک تو یہ لڑکا مجال ہے جو اپنے اصولوں کے خلاف چلا جائے، جو خود سوچ لے بس وہی ٹھیک، اس کے بعد دوسرے کیا سوچتے ہیں موصوف کو فرق ہی نہیں پڑتا۔" وہ سخت جھنجلاتے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گئے۔

"تم شادی میں پہننے کے لئے کیا لوگی کچھ سوچا ہے؟"

"میں نے تو کچھ نہیں سوچا کہ میں نے کبھی کوئی شادی اٹینڈ ہی نہیں کی، اس لئے آئیڈیا بھی نہیں ہے ہاں مما نے آتے ہوئے کہا تھا کہ مہندی کے لئے فراک کے ساتھ پاجامہ، ویڈنگ کے لئے شرارہ اور ولیمہ کے لئے لانگ شرٹ اور ٹراؤزر لے لوں، تو بس یہی سب لوں گی۔"

"تم تو مما کی کافی فرمانبردار بیٹی بن گئی ہو۔" وہ مسکرائی تھی۔

"میں نے ہمیشہ وہ کام کیا جو ابی کو پسند ہے اور مما سے تو مجھے اتنی زیادہ اپنائیت اور محبت محسوس ہوتی ہے کہ میرا دل کرتا ہے کہ مما مجھے کہتی جائیں اور میں سن کر عمل کیے جاؤں، مما بہت زیادہ اچھی ہیں، میں گھر جا کر سب سے زیادہ مما، کو مس کروں گی۔" اس نے ماں کی کمی بے حد محسوس کی تھی اور نورین کی بے لوث محبت اور اپنائیت نے جیسے کمی کا مداوا کرنا شروع کر دیا تھا، بناوٹ سے پاک پرخلوص لہجہ اس نے اسے مڑ کے دیکھا تھا، وہ نرمی سے مسکراتی بہت خاص لگی تھی۔

بہت جلدی بھی کرتے ان دونوں نے پوری شاپنگ تقریباً چار گھنٹوں میں کی تھی اور اس نے جس طرح صبر و برداشت کا مظاہرہ کیا تھا یہ تو بس وہی جانتا تھا وہ دونوں خود بھی بہت تھک گئی تھیں اور رات کے نو بج گئے تھے، گزرتے ہوئے اس کی نگاہ شیشے سے بنے گھر پر پڑی تھی اور وہ بے ساختہ ہی رک گئی اور اس نے بے ساختگی میں ہی شاپ کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"مریم جلدی چلو نہ، بھا کافی آگے نکل گئے ہیں۔" اس کے چلتے ہوئے جیسے ہی احساس ہوا کہ مریم اس کے ساتھ نہیں چل رہی وہ کہتی ہوئی رکی مگر وہ کہیں نہ تھی اس کے بعد ان دونوں نے اس کو وہیں کافی ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہ تھی، کیونکہ وہ رائٹ سائیڈ سے شاپ میں داخل ہوئی تھی وہ ہاؤس خریدا تھا اور لیفٹ سائیڈ سے شاپ سے نکل گی تھی اس کا خیال تھا کہ وہ وہیں ہوں گے اس کو اندازہ نہ تھا وہ لوگ الگ اسٹریٹ پر ایک دوسرے کو ڈھونڈ رہے ہیں، کافی دیر وہ نہیں ملی تو وہ بہن پر غصہ کرنے لگا۔

"مجھے کیا پتہ تھا بھا، کہ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بھی کہیں کھو جائے گی۔" وہ رو پڑی تھی۔

"تم گاڑی میں جا کر بیٹھو میں دیکھتا ہوں۔" وہ اس کو روتے دیکھ دھیما پڑ گیا تھا، وہ اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے بیک سائیڈ پر آیا اور وہ ستون سے ٹیک لگائے نظر آ گئی وہ تقریباً دوڑ کر اس تک آیا اور وہ اس کو دیکھ بچوں کی طرح روتے ہوئے اس کے کندھے سے آ لگی۔

"آپ کہاں چلے گئے تھے؟ میں کتنا ڈر گئی تھی، آپ لوگ مجھے مل ہی نہیں رہے تھے میں نے ابی کو بھی فون کر دیا۔" وہ اس کے سینے سے لگی روتے ہوئے کہہ رہی تھی اس کی بے اختیار حرکت پر وہ بھونچکا کھڑا تھا کہ اس کی بات پر اس کے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔

"دماغ خراب ہے آپ کا، آپ نے علی بھائی کو فون گھما دیا، وہ کتنا پریشان ہو گئے ہوں گے۔" بازو سے تھام کر اسے کچھ دور کیا اور اسے بری طرح ڈپٹا۔

"تو میں کیا کرتی، مجھے کتنا ڈر لگ رہا تھا۔" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

"بچی نہیں ہیں آپ جو اتنی سی بات پر ڈر گئی تھیں، عقل کا استعمال کرتے ہوئے پارکنگ تک آ سکتی تھیں، لیکن عقل ہو تو کوئی بات ہے نا اور آپ یہاں کیسے آ گئیں؟" وہ کسی لحاظ کے بغیر اسے ڈپٹ رہا تھا۔

"وہ میں یہ لینے رک گئی تھی۔" اس نے زمین پر رکھے بڑے سے ڈبے کی جانب اشارہ کیا تھا۔

"پچھلے چار گھنٹے سے خریداری کرنے کے بعد بھی آپ کا دل نہیں بھرا تھا اور کچھ لینا ہی تھا تو بتایا تو جا سکتا تھا، اتنی سی دیر میں، میں کتنا پریشان ہو گیا تھا۔" وہ اسے بخشنے کو تیار نہ تھا۔

"میں نے انعم کو آواز دی تھی اور میں یہی سمجھی تھی کہ وہ میرے پیچھے آ گئی ہے۔" اس کے رونے میں اضافہ ہونے لگا تھا۔

"وہ جب وہاں نہیں تھی تو آپ کو واپس اسی وقت پلٹنا چاہیے تھا لیکن آپ نے خریداری کرنا زیادہ ضروری سمجھا۔" وہ اس کو رعایت دینے کو ہرگز تیار نہ تھا کہ اس کا سیل گنگنا اٹھا۔

"منیب! مریم کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ ہی ہیں، ہم گھر آ رہے ہیں۔" لہجہ زوہیب کی آواز پر دھیما کر لیا تھا۔

"لیکن مجھے علی کا فون آیا تھا کہ......"

"وہ کھو گئی تھیں، مل گئی ہیں، گھر آ کر بات کروں گا۔" اس نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اسے آنے کا کہتا اس کے ہاتھ سے پیک لیتا تیزی سے آگے بڑھا اور کافی ریش ڈرائیونگ کرتا گھر پہنچا، سب گھر والے ہی پریشان سے ان کے منتظر تھے، وہ نورین سے لپٹ کر بری طرح رونے لگی۔

"مما میں نے کچھ جان کر نہیں کیا تھا، وہ جگہ میرے لئے نئی تھی مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جاؤں؟ مجھے یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ پارکنگ کہاں ہے۔"

"رونے اور فون کھڑکانے میں جو انرجی ضائع کی تھی اس کی جگہ عقل کا استعمال کرتے ہوئے کسی سے پوچھ کر پارکنگ تک جا سکتی تھیں آپ، مگر نہیں آپ تو سب سے زیادہ ویران حصے میں بڑے مزے سے کھڑی تھیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر نہایت غصہ سے بولا تھا۔

"میں مزے سے نہیں کھڑی تھی، مجھے بہت زیادہ ڈر لگ رہا تھا اور جب وہ لڑکا گھٹیا گفتگو کرتا مجھے ساتھ چلنے کی آفر کرنے لگا تب میں نے ابی کو فون کیا تھا کہ میرے سیل میں ابی کے علاوہ کسی کا نمبر فیڈ نہیں ہے، مجھے فون کرتے دیکھ کر وہ چلا گیا تھا اور اسی وقت آپ آ گئے تھے اور مجھے کتنا ڈانٹا تھا، غلطی تھی میری کہ میں اکیلے شاپ میں کیوں گئی، مگر مجھے ڈانٹنے، میری انسلٹ کرنے اور مجھ پر الزام لگانے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے، آپ کو میرا یہاں آنا پسند نہیں آیا، میں آج ہی واپس چلی جاؤں گی۔" وہ ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہتی تقریباً دوڑ کر وہاں سے چلی گئی اور ماں اور چاچو کی ملامتی نگاہیں اس کی شرمندگی یکدم بے حد

بڑھ گئی۔

"آئی ایم سوری مما آپ تو جانتی ہیں نہ غصہ مجھ سے کنٹرول نہیں ہوتا۔"

"سوری، مجھ سے نہیں مریم سے کرو، اس بچی کو نہ جانے کتنا ڈانٹ دیا ہے تم نے۔" انہوں نے بیٹے کو خفگی سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"بھا، نے مجھے بھی اتنی بری طرح ڈانٹا تھا، جبکہ میری تو کوئی غلطی بھی نہیں تھی۔" انعم منہ بسور کر بولی تھی۔

"آفت کی پرکالہ، شکایت کی پوٹلی بعد میں نہیں کھول سکتی تھیں، دیکھ رہی ہو میں معصوم پہلے ہی خونخوار نگاہوں کی زد میں ہوں۔" اس نے خجالت مٹانے کو بہن کو گھر کا تھا، مگر وہ کب کسی سے کم تھی۔

"ہاں تو آپ کو بھی تو ڈانٹ پڑنی چاہیے کہ آپ ہر وقت ہی غصہ میں بھرے کسی پر بھی برس جاتے ہیں۔" وہ خفگی سے بول رہی تھی۔

"منیب، تمہیں مریم سے کوئی پرابلم ہے؟" ان کی نگاہیں سوالیہ تھیں۔

"نہیں...... مما...... میں۔" وہ صفائی دیتا کہ زوہیب درشتگی سے بولنے لگے۔

"تمہیں پرابلم ہے، اس کی موجودگی میں تم نے سب کے ساتھ کھانا پینا چھوڑا ہوا ہے، آج تم نے اسے ساتھ لے جانے سے منع کر دیا، اس پر غصہ ہونے، یا ڈریسنگ پر سوال اٹھانے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم دنیا سنوار نہیں سکتے، تم مریم کو تبدیل ہونے کے لئے نہیں کہہ سکتے، ہاں تم خود اپنی نگاہ و کردار کی حفاظت کر سکتے ہو کے تمہارا خود پر بس چل سکتا ہے نہ کہ دوسروں پر۔" وہ کافی درشتگی سے اور کافی صاف گوئی سے بولے تھے کہ وہ بے حد نرم مزاج کے حامل شخص تھے مگر جب غصہ آتا تھا، تو مقابل کو بالکل نہیں بخشتے کہ اس سے سو پہلے ہی خفا تھے کہ جب مریم نے علی شاہ سے واپس بلانے کی التجا سی کی تھی اور وہ تو بہت مجبوری میں اسے انجان لوگوں میں بھیج چکے تھے منیب رویہ عجیب لگا بھی تھا تو وہ درگزر کر رہے تھے مگر آج برداشت جواب دے گئی تھی کہ وہ مریم کو زیادہ نہیں جانتے، مگر جتنا جان پائیں ہیں وہ کافی نرم خو لگی اور اس کا غصہ میں آنا، انہیں یہی لگا کہ وہ اس کے رویے سے ہی ڈس ہارٹ ہو گئی تھی۔

"چاچو! مجھے اپنی ناگواری و غصہ چھپانا نہیں آتا، بس اس لئے میں اپنے گرم مزاج کے سبب مریم کے ساتھ بہت برا رویہ اختیار کر گیا، وگرنہ آپ نے اور مریم نے ٹھیک کہا کہ انہیں کچھ کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے، میرے رویے سے آپ سب کو ایسا لگا کہ میں ان کے آنے سے خوش نہیں ہوں تو میں اپنے رویے پر غور کرتے ہوئے تبدیلی لانے کی کوشش کروں گا۔" وہ بہت ضبط سے بول رہا تھا کہ انہوں نے اس سے اتنی درشتگی سے پہلی ہی دفعہ بات کی ہو گی، وہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے والے انسان نہیں تھے، غصے میں نرمی سے ہی پیش آتے تھے، لیکن اس وقت وہ اس لئے بھی کنٹرول کھو گئے کہ جب علی شاہ نے ان سے فون کر کے مریم کے فون کا بتایا تھا وہ کافی پریشان ہو گئے تھے کہ انہوں نے دوست کی مجبوری سمجھتے ہوئے اس کی محبت میں بہت بڑی ذمہ داری اٹھائی تھی اور کہاں کا غصہ کہاں اور کیسے نکل گیا تھا، وہ مزید کچھ کہتا کہ زوہیب شاہ کا فون بج اٹھا اور انہوں نے علی شاہ کے نمبر پر لگائی مخصوص رنگ ٹون کی آواز پر پہلی فرصت میں کال ریسو کر لی۔

"ڈونٹ وری علی، مریم مل گئی ہیں۔" وہ چھوٹتے ہی بولے تھے۔

"آئی نو، اس سے بات ہوئی ہے میری، بہت رو رہی تھی، ضد کر رہی تھی کہ میں اسے لینے آ جاؤں، وہ ٹھیک ہے نہ زوہیب؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں، نئی جگہ تھی انعم وغیرہ کا ساتھ چھوٹا تو کچھ ڈر سی گئیں، تم پریشان نہ ہو۔" دوست کو بھرپور انداز میں تسلی دی تھی۔

"میں پریشان کیسے نہ ہوں زوہیب، یہاں قیامت ٹوٹی ہوئی ہے ان لوگوں نے گھر پر حملہ کیا تھا، خالہ بی سے مریم کا ایڈریس پوچھ رہے تھے کہ وہ کہاں ہے؟ اور خالہ بی کے نہ بتانے پر انہوں نے خالہ بی کو کافی زدوکوب کیا ہے، خالہ بی آئی سی یو میں ہیں، مریم کا فون آیا تو میں ہاسپٹل میں تھا، میں یہاں پہلے ہی بہت پریشان ہوں اوپر سے مریم کی واپسی کی ضد، میں سمجھ نہیں پا رہا کہ کیا کروں؟ وہ وہاں کمفرٹ فیل نہیں کر رہی تو میں واپس۔"

"واپسی کا سوچنا بھی مت جب تک معاملات کچھ کنٹرول نہیں ہو جاتے اور تم اپنا خیال رکھو، مریم کی فکر چھوڑ دو، بہن کہا ہے تو بھائی کے تمام فرائض بھی ادا کروں گا، مریم میری ذمہ داری ہیں میں بات کر کے سمجھاؤں گا انہیں، تم پریشان نہ ہو۔" انہوں نے دوست کو بھرپور انداز میں اپنے ساتھ کا یقین دلایا تھا اور تسلی دے کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

"تمہاری وجہ سے مریم نے واپسی کا سوچ لیا ہے، اس لئے تمہیں ان سے سوری کرنا ہو گی کہ میں چاہتا ہوں کہ وہ یہاں رہیں اور تم سوری نہیں کر سکتے تو جب تک مریم یہاں ہیں، تم کراچی میں ہی رہو، یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بہت دیر سے ان دونوں کو الجھتے صفائیاں مانگتے اور صفائیاں دیتے دیکھ اور سن رہی تھیں، زوہیب شاہ کی بات پر بھونچکا رہ گئی تھیں۔

"چاچو آپ مجھ سے معافی مانگنے کو کہتے تو میں مانگ لیتا، آپ کی شرط کے بعد میں ایسا اب ہرگز نہیں کروں گا۔"

"منیب۔" ماں کی آواز پر وہ لب بھینچ گیا تھا۔

"میں نے تم سے پہلے معافی مانگنے کو ہی کہا تھا شرط تو بعد میں رکھی، لیکن میں بھول گیا تھا کہ تم بہت بڑے ہو گئے ہو، خود فیصلے کر سکتے ہو، ہمارے کیے فیصلوں کو رد کر سکتے ہو، تم ابھی اسی وقت لاہور واپس چلے جاؤ، وگرنہ مجھے مریم کو لے کر وہاں جانا پڑے گا۔" وہ کافی درشتگی سے ٹھوس لہجے میں بولے تھے۔

"زوہیب۔" اتنی سختی کی انہیں زوہیب شاہ سے کہاں امید تھی۔

"بھابھی معافی چاہتا ہوں کہ آپ سے صلاح مشورہ کیے بغیر، آپ کی اجازت کے بغیر اتنا بڑا فیصلہ لے چکا ہوں، مگر مریم کی ذمہ داری آپ کی اجازت سے قبول کی تھی اور میں اب اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا ہوں، مریم میری ذمہ داری ہیں۔"

"چاچو میں بھی آپ کی ہی ذمہ داری ہوں۔" وہ دکھ و خفگی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا تھا وہ ہرٹ ہوا تھا کہ اس کے چاچا نے اس پر ایک انجان لڑکی، جس کو جمعہ جمعہ چار دن قبل بہن بنایا تھا فوقیت دے رہے تھے۔

"جانتا ہوں، مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اپنی ذمہ داری کا احساس ہے اسی لئے۔"

"اسی لئے مجھے گھر سے جانے کو کہہ رہے ہیں، مجھے گھر سے نکال رہے ہیں، تو ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں اور اب یہاں تب ہی قدم رکھوں گا جب آپ اپنی نام نہاد ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں گے۔" وہ ساکت کھڑے رہ گئے تھے اور وہ ماں کے روکنے پر بھی نہیں رکا تھا

اور وہ دیور سے کچھ کہہ بھی نہیں پائی تھیں کہ وہ بیگ اٹھائے آ گیا تھا اس نے لاہور سے آنے کے بعد بیگ کھولا ہی نہ تھا اس لئے پیکنگ کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

"مغیب دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، زوہیب نے ایسا کیا کہہ دیا ہے جو تم یوں منہ اٹھا کے جا رہے ہو۔" انہیں بیٹے کا اقدام سخت برا لگا تھا۔

"مما آپ موجود تھیں، اس لئے مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"بکواس بند کرواپنی، یہ تو نہ ہوا کہ زوہیب کے کہنے پر معافی مانگ لیتے جا کر، الٹا اکڑ دکھا کر جا رہے ہو۔" انہیں بیٹے پر شدید غصہ آ رہا تھا کہ انہیں اس کی باپ سی منہ زور طبیعت و فطرت ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

"جی کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے چاچو کو جانا پڑے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتا باہر نکلتا چلا گیا تھا، انہوں نے تو خیر اسے روکنے کی کوشش نہ کی تھی اور اس نے ماں کی سنی نہیں تھی اور وہ اس کی اتنی بدتمیزی پر بھونچکا رہ گئی تھیں۔

"بھابھی میں نے مغیب سے گھر چھوڑ دینے کو تو نہیں کہا تھا۔"

"آئی تو تمہیں صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہے، میں موجود تھی، میں نے مغیب کی بدتمیزی دیکھی ہے، تم نے اسے ایسا کچھ نہیں کہا جو اس نے اتنا برا ری ایکٹ کیا، تم اس کی طرف سے پریشان نہ ہو اور جا کر آرام کر لو، مریم سے میں بات کرتی ہوں، مریم صرف تمہاری نہیں، میری بھی ذمہ داری ہے اور میں جانتی ہوں کہ تم مریم کو لے کر کتنا پریشان ہو، اسی لئے تم مغیب کے ساتھ تھوڑا سا ہائپر ہو گئے تھے، مگر تمہیں اس پر غصہ کرنے کا چاہے اس کی غلطی ہو یا نہیں، پورا حق حاصل ہے، مگر اسے تم سے بدتمیزی کرنے کا کوئی رائٹ نہیں ہے۔" وہ انہیں کمرے میں جانے کی ہدایت کرنے کے بعد مریم کے کمرے میں آ گئیں، وہ بیڈ پر تکیہ میں منہ دیئے لیٹی تھی، اس کو دیکھ ان کے دل کو کچھ ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں اور چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"مریم بیٹا اس طرح نہیں روتے۔" اس کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے بولی تھیں۔

"پلیز ابی سے کہیں، مجھے لینے آ جائیں، میں انہیں بہت مس کر رہی ہوں۔" اس کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔

"تمہیں واپس جانا ہے نہ تو میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گی، لیکن ایسے ناراض ہو کر نہیں، تمہیں مغیب کی بات بری لگی ہے، تو میں اس کی طرف سے سوری کر لیتی ہوں۔"

"نہیں مما آپ سوری نہ کریں، آپ سوری کریں، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو گا، میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔" وہ بہت تڑپ کر بولی تھی۔

"میری ایک بات مانو، رونا بند کر دو اور جانے کا خیال دل سے نکال دو کہ ابھی تو تم نے ارم اور زوہیب کی شادی بھی اٹینڈ کرنی ہے۔"

"نہیں مما، مجھے مت روکیں، وہ مجھے پسند نہیں کرتے، میں آئی انہیں کے ساتھ تھی نا، مگر انہوں نے راستے میں مجھ سے ایک لفظ نہیں کہا تھا اور یہاں آ کر بھی مجھ سے بات نہیں کی، وہ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا نہیں کھاتے، مجھے ساتھ لے جانے پر معترض تھے، انہیں میری ڈریسنگ پر بھی اعتراض ہے، وہ مجھے پسند نہیں کرتے اور یہ گھر ان کا ہے اور مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے، اس سے پہلے کہ ان کی ناگواری کا مکمل اظہار ہو اور وہ مجھے جانے کو کہیں۔"

اس کے جتنے بھی ملنے جلنے والے تھے سب کا رویہ اس کے ساتھ بہت نرم و محبت آمیز ہوتا تھا اور یہاں بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ایک مغیب نے اسے یکسر اگنور کیا تو وہ برداشت نہیں کر پا رہی کہ آج اس نے جیسے ڈانٹا اس طرح تو کبھی علی شاہ نے بھی نہیں ڈانٹا تھا کہ اس میں ضد و بحث کرنے کی عادت نہیں تھی، علی شاہ نے جو کہا خاموشی سے مان لیا اس لئے انہیں اسے ڈانٹنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

"تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے، ہے اگر تو تم جانے کی بات بالکل نہیں کرو گی۔" وہ اس کو اکیلا چھوڑ کر روم سے نکل گئی تھیں ان کے جانے بعد ارم اور انعم روم میں آئی تھیں اور ان دونوں نے بھی اسے پیار سے سمجھایا تو اس نے جانے کا ارادہ بدل دیا اور یونہی ایک ہفتہ گزر گیا اور مہندی کا دن آ گیا، سب ہی کو مغیب کی کمی بری طرح محسوس ہو رہی تھی لیکن نورین نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ اس کو آنا ہو گا تو وہ خود ہی آئے گا اسے بلائے گا نہیں، ارم کا رونا زوہیب سے برداشت نہیں ہوا تھا اور وہ اس کو فون ملا رہے تھے کہ وہ ان کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"زوہیب، تم اسے فون نہیں کرو گے وہ اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ یوں من مانیاں کرنے لگا ہے، انعم پر تو غصہ کرتا ہی تھا، ہم پر بھی غصہ کرنے لگا ہے، اسے یہاں سے کوئی فون نہیں کرے گا، سمجھے تم۔" وہ زوہیب کو ڈپٹ کر بولی تھیں۔

"لیکن بھابھی گھر میں شادی ہے، ارم اس کے لئے رو رہی تھی اور بہرحال غلطی میری ہے۔"

"شٹ اپ غلطی تمہاری نہیں ہے، اب میں بھی تو تمہیں ڈانٹ رہی ہوں، غصہ میں کہہ دوں کہ تم اسے فون نہیں کرو گے، ورنہ گھر سے چلے جاؤ، تو کیا تم گھر سے چلے جاؤ گے؟ نہیں نہ تو پھر وہ کیوں چلا گیا؟ اور چلا بھی گیا تھا تو گزرے آٹھ دنوں میں ٹوٹ بھی تو سکتا تھا، کیا اسے نہیں پتہ کہ اس کی بہن کی، اس کے چاچو کی شادی ہے، اس کی یہاں ضرورت ہے اور جب اسے احساس نہیں ہے تو ہم میں سے کوئی اسے احساس نہیں دلائے گا۔" وہ آنسو پیتی روم سے نکل گئیں تھیں۔

سب ہی شام کی تیاری بڑی بے دلی سے کر رہے تھے کہ وہ چلا آیا تھا اور اس کو دیکھ خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی، اس نے اپنے رویے کی ماں سے معافی مانگی تھی۔

"معافی، مجھ سے نہیں، زوہیب سے مانگو، تم نے اس کو ہرٹ کیا ہے، وہ تم سے محبت کرتا ہے، تمہیں تمہاری غلطی پر ڈانٹنے کا حق رکھتا ہے، مگر تم نے۔" وہ بیٹے کو ناراضگی سے دیکھتے ہوئے بول رہی تھیں۔

"مما مجھے اندازہ ہے اور میں چاچو سے معافی مانگ لوں گا۔"

"اندازہ تھا تو فوراً کیوں نہیں آئے؟" ان کی ناراضگی ختم نہیں ہو رہی اور جو وجہ اس نے بتائی تھی سن کر وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

"ڈونٹ وری مما، وہ اب ٹھیک ہیں۔" وہ ماں کو تسلی دیتا زوہیب شاہ کے کمرے میں چلا آیا، کمپیوٹر پر مصروف آہٹ پر چونکے اور اس نے انہیں سلام کیا تو وہ جواب دے کر واپس کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"آئی ایم سوری چاچو۔" اس نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"سوری فار واٹ، میرے کہنے سے تم کسی سے معافی نہیں مانگ سکتے، تو مجھ سے معافی کیوں؟ مجھ سے معافی مانگتے ہوئے تمہاری انا پر

چوٹ نہیں لگ رہی۔" انہوں نے اسے تیکھے چتونوں سے گھورا تھا۔

"چاچو، میں آپ سے شرمندہ ہوں، مجھے معافی مانگنے پر اعتراض نہ تھا مگر جب آپ نے شرط رکھی تو مجھے لگا کہ آپ انہیں مجھ پر فوقیت دے رہے ہیں، اس لئے مجھے غصہ آ گیا، پلیز مجھے معاف کر دیں۔" اس نے انہیں شانوں سے تھام کر ریکوئسٹ کی تھی۔

"بڑی جلدی خیال نہیں آ گیا۔" اس کے شرمندہ چہرے کو دیکھا اور وہ انہیں تفصیل بتانے لگا۔

"ہاں کچھ دیر قبل میری علی سے بات ہوئی ہے لیکن اسے نے منع کر بھی دیا تھا تو تم مجھے کم از کم بتا تو دیتے۔"

"میں نے بھی نہ بتانا ہی مناسب سمجھا تھا کہ آپ یہاں مصروف تھے اور میں تھا نہ وہاں، میں نے سنبھال لیا تھا، علی بھائی اب ٹھیک ہیں۔" وہ نرمی سے بتا رہا تھا، علی شاہ کو گولی لگی تھی، زندگی تھی تو موت کے منہ سے باہر آ گئے تھے۔

"تم جا کر فریش ہو جاؤ، کھانا وانا کھاؤ، پھر میرے کمرے میں آنا میں نے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" علی شاہ نے ان سے ایک ریکوئسٹ کی تھی اور انہیں ماننے میں کوئی اعتراض نہ تھا، نورین سے بھی ان کی مرضی پوچھی تھی اور وہ تو جیسے اس سب کے لئے پہلے ہی راضی تھیں انہوں نے منیب سے بات کر لینے کو کہہ دیا اور جب انہوں نے منیب سے بات کی تو وہ لحہ بھر کو خاموش رہ گیا اور ان کے استفسار پر صرف انکار کر دیا وہ لحہ بھر کو کچھ بول نہ سکے پھر خود کو کمپوزڈ کر کے بولے۔

"مریم میں کیا برائی ہے؟"

"بات برائی کی نہیں ہے، میں نے اس طرح نہیں سوچا۔"

"تو اب سوچ لو، مریم ہر لحاظ سے تمہارے لئے پرفیکٹ ہے۔"

"سوری چاچو میں ایسا نہیں سمجھتا، اول تو میں انہیں جانتا نہیں ہوں، جتنا جان پایا ہوں، ہمارے مزاج پسند ناپسند بالکل نہیں ملتی، میں ایک پریکٹیکل بندہ ہوں اور میں ایکسٹرا ایموشنل لڑکی کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے عمر میں بھی کافی چھوٹی ہے، ان کا مزاج طرز زندگی کچھ بھی مجھ سے میل نہیں کھاتے اس لئے معذرت کہ میں ویسے بھی اپنی کولیگ سے کمٹمنٹ کر چکا ہوں۔" اس کے واضح انکار کے بعد لاسٹ بات پر جیسے کچھ کہنے کو بچا ہی نہیں تھا اور وہ الجھے سے بیٹھے تھے کہ اس کا انکار علی شاہ کی ریکوئسٹ ذہن میں گڈمڈ ہو رہے تھے اور ان کا سیل بج اٹھا۔

"تایا جان کو پتہ چل گیا ہے زوہیب کہ مریم تمہارے گھر پر ہے، وہ حیدر آباد آ رہے ہیں، تم سے میں نے مریم کے رشتے کی بات کی تھی، آئی سے ریکوئسٹ یوز زوہیب تم تایا جان کے وہاں پہنچے سے پہلے پہلے ہی مریم کا نکاح منیب سے کر دو، یہ تمہارا مجھ پر احسان ہو گا کہ میں نہیں چاہتا کہ تایا جان، مریم کو لے جائیں، تم میری دوستی کی خاطر مجھ پر یہ احسان کر دو مریم۔"

"جو تم چاہتے ہو وہی ہو گا، تم پریشان نہ ہو اور مریم سے بات کر کے ان سے خود کہہ دو کہ انہیں تمہاری ضرورت ہو گی کہ تم سے ان کا واحد قریبی رشتہ ہے۔" انہوں نے منیب کے انکار کے باوجود حامی بھر لی تھی اور نورین کو بتا کر فوراً ہی نکاح خواں کا انتظام کر لیا تھا، اس کو پتہ چلا تھا تو اسے غصہ آ گیا تھا کہ اس کے انکار کی پسند کی جیسے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔

"مریم بہت اچھی لڑکی ہے منیب، تم اس کے ساتھ بہت خوش رہو گے۔" اس کو غصہ میں دیکھ نورین نے نرمی سے سمجھانا چاہا تھا۔

"مما جب میں نے مریم سے شادی ہی نہیں کرنی تو پھر یہ سب کیوں، میری پسند ناپسند کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"میں علی کو زبان دے چکا ہوں۔"

"زبان تو میں نے بھی اریبہ کو دی ہے، اس سے میں نے کمٹمنٹ کی ہے، آپ کو اپنی زبان کا پاس ہے میرے لئے کی میرے انکار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"ہے بیٹا لیکن وقت کی نزاکت کو بھی تو سمجھو، کیا تم کسی کو مصیبت سے نہیں بچا سکتے۔"

"مما دنیا میں کتنے ہی مصیبت زدہ لوگ ہیں، اب سب کو مصیبتوں سے نکالنے نکل پڑوں تو کس کس سے کروں گا میں شادی......؟" وہ چبا چبا کر بولا تھا۔

"بھابھی میرا دوست مشکل میں ہے اور اس کے مشکل وقت میں کام آنا میں اپنی دوستی کا حق سمجھوں گا، میں نہ منیب کو مجبور کر سکتا ہوں، نہ ہی کروں گا کہ مجھے اپنے دوست کی عزت نفس کا بھی خیال رکھنا ہے اور مریم میں کوئی برائی نہیں ہے کہ علی کو اس کی شادی کے لئے کسی سے التجائیں کرنی پڑیں، ہاں اس وقت وہ مشکل میں تھا اسے یہ سب مناسب لگا تو کہہ دیا ایسا کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑا، مریم سے یہ شادی نہیں کرے گا، علی یہاں ہوتا تو وہ خود اپنی بہن کی شادی اس سے نہیں کرتا وہ مجبور ضرور ہے بے غیرت نہیں ہے اور اپنے دوست کو میں کٹھن وقت میں ہرگز اکیلا نہیں چھوڑوں گا، مریم کو میں نے اپنی ذمہ داری سمجھا تھا، میرے دل ونگاہ میں کوئی کھوٹ نہیں تھی، مگر ضرورت اسی چیز کی ہے تو میں یہ بھی کروں گا، مریم سے میں شادی کر لوں گا۔"

ان دونوں پر جیسے کوئی آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

"زوہیب یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" نورین ناگواری سے بولی تھیں۔

"بھابھی اس کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔"

"لائبہ کا کیا ہو گا، پرسوں اس سے نکاح ہے تمہارا۔"

"لائبہ کو رشتوں کی کمی نہیں ہے بھابھی، کہ رشتوں کی کمی تو مریم کو بھی نہیں ہے، یہ آپ بھی جانتی ہیں اور علی کی مجبوریوں سے بھی واقف ہیں اس لئے میں یہ فیصلہ لینے پر مجبور ہوں۔" وہ یہ سب طوفانوں سے گزرتے کہہ رہے تھے۔

"ایسا کوئی فیصلہ نہ لو زوہیب جس پر پچھتانا پڑے۔"

"بھابھی پچھتاتے تو وہ لوگ ہیں جن کے دلوں و نیت کھوٹ سے بھرے ہوتے ہیں، میرا دل و نیت صاف ہیں، آگے اللہ بہتر کریں گے۔"

"لیکن لائبہ، تم اس سے محبت۔"

"دوستی پر محبت قربان کر دوں، یہی دوستی کا تقاضہ ہے۔"

"آپ کو اپنی محبت قربان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں شادی کے لئے راضی ہوں۔" منیب کی چپ بالآخر ٹوٹ گئی تھی۔

"اس احسان کی ضرورت نہیں ہے منیب شاہ اور ویسے بھی تمہاری تو اریبہ سے کمٹمنٹ ہے۔" نورین تلخی سے بولی تھیں کہ بیٹے نے ان کو بہت مایوس کیا تھا اتنی بدتمیزی کی تو انہیں امید تھی ہی نہیں۔

"میری جسٹ کمٹمنٹ ہے، اریبہ مجھے اچھی لگی تھی اس لئے میں نے شادی کا فیصلہ کیا تھا، لیکن لائبہ، چاچو کی محبت ہے۔" وہ ماں کی سرد

مہری محسوس کر کے وضاحتی انداز میں بولا تھا۔
""تمہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تم صرف اپنے بارے میں سوچو۔" وہ سچ ہوئے تھے کہ اس پر مان تھا کہ وہ مان جائے گا اس لئے دوست سے حامی بھر لی تھی مگر اس نے مایوس کیا تھا۔
""آپ لوگ اس طرح ری ایکٹ کیوں کر رہے ہیں، انکار کا مجھے حق تھا میں نے کیا، مگر آپ ایک غلط فیصلہ لے رہے ہیں تو میں اس حق میں بہ خوشی دست بردار ہو کر آپ لوگوں کی بات ماننے کو تیار ہوں تو آپ لوگ کیوں اس طرح کر رہے ہیں۔" وہ الجھ کر رہ گیا تھا۔
""اس لئے کہ ہم نہیں چاہتے کہ تم زبردستی ایک فیصلہ لو اور نہ خود خوش رہو اور نہ ہی مریم کو رکھ سکو۔"
""مما تو کیا گارنٹی ہے کہ چاچو اسے خوش رکھیں گے۔"
""ہاں رکھے گا یقین ہے مجھے کیونکہ زوہیب صاف دل سے یہ قدم اٹھا رہا ہے جبکہ تم غصہ میں اور یہ تو ہم چاہیں گے ہی نہیں نہ کہ تم یا مریم خوش نہ رہو۔"
""چاچو خوش رکھنے کی کوشش کریں گے اور یہ کوشش میں کرنے کو تیار ہوں۔" وہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔
زوہیب اپنی سکیم کے کامیاب ہونے پر خوش ہو گیا، مگر وہ فکر مند بھی تھا۔
""زوہیب نکاح ہو جانے دو، ابھی غصہ ہے، مگر دھیرے دھیرے سیٹ ہو جائے گا کہ مریم لاکھوں میں ایک ہے اور ویسے بھی اسے دیکھ میں یہی سب سوچے بیٹھی تھی، میں مناسب وقت پر خود منیب سے بات کر کے علی شاہ سے ان کی بہن کا رشتہ طلب کرتی، مگر اللہ کو یہ سب اسی طرح منظور ہے تو ہمارے تمام اعتراضات بے معنی ہیں۔"

☆☆☆

علی شاہ نے مریم کو فون کر کے بتایا تھا، وہ سنتے ہی انکاری ہو گئی تھی، انہوں نے اسے سمجھایا مگر یہ سب اس کے لئے شاکنگ تھا، وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی، نورین نے اسے ایک ماں کی طرح سمجھایا تھا اور ان کا ساتھ اور دیا ہوا حوصلہ ہی تھا کہ اس نے زندگی کے اتنے اہم موڑ کو اپنے ایک واحد رشتے کی غیر موجودگی میں نئے رشتے کو تسلیم کر لیا تھا، نکاح نامے پر سائن کرتے ہوئے ہاتھ کانپ رہے تھے، ذہن اور دل میں عجیب سی بے چینی و خوف سا محسوس ہو رہا تھا، آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور مبارک سلامت کے شور میں ہی انہوں نے بہو کے سر پر ہاتھ رکھ کے گلے سے لگایا تھا اور وہ بچوں کی طرح بلک اٹھی تھی کہ اسے چپ کرانا بھی مشکل ہو گیا تھا اور وہ اس سب کو لب بھینچے دیکھتا یکدم وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا، اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی تھی اور دو مسلح بردار افراد اور ایک بڑی بڑی مونچھوں والا بارعب شخص کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گئے تھے، انعم ان کو دیکھ کر اتنا ڈر گئی تھی کہ انہیں روکنے یا کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی اور وہ دروازے کی سائیڈ پر ہی جمی تھی کہ ایک شخص اندر داخل ہوا، جس کو دیکھ حیرت کی زیادتی سے اس کی آنکھیں پھیل سی گئیں جبکہ اس نے کافی بے باک نگاہوں سے اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا تھا۔
سفید بے داغ چہرہ بڑی بڑی جھیل سی سبز آنکھیں، پنکھڑی سے نازک گلابی لب، بھرے بھرے رخسار، داہنے رخسار پر چمکتا سیاہ تل، نازک سراپا، جو سبز فراک اور پاجامے میں، داہنے شانے پر ہم رنگ لہراتے آنچل کے ساتھ کافی

قیامت خیز لگ رہا تھا، اس کی بے باک نگاہوں میں ایسا کچھ تھا کہ وہ اپنی بے اختیاری سے نکل کر ڈرا، جھکاتی آنچل دونوں شانوں پر برابر کرنے لگی تھی اور وہ اس کی کانپتی انگلیوں، لرزتی پلکوں کو دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔
""کافی خوبصورت ہیں آپ۔" وہ دلکشی سے بولا تھا اور اس نے گڑبڑا کر اسے دیکھا اور اس کے مسکراہٹ اچھالنے پر اس کی گڑبڑاہٹ میں اضافہ ہوا تھا اور اسی وقت کھلے دروازے سے علی شاہ داخل ہوئے تھے اور انہیں دیکھ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا اور وہ ایک کے بعد ایک اجنبی چہرے کو دیکھ کر الجھ گئی تھی۔
""علی شاہ، زوہیب کا فرینڈ، مریم کا بھائی۔" وہ اس کی سوالیہ نگاہیں محسوس کرتے کہنے لگے تھے کہ اندر سے چیخنے کی آوازیں آئی تھیں اور وہ تایا کی آواز پہنچانتے بڑی تیزی سے اندر کی طرف بڑھے تھے۔
""آپ کو دیکھ دل ہار بیٹھے ہیں، ایک دو ملاقاتیں ضرور کرنا چاہیں گے۔" وہ اندر کی طرف بڑھنے لگی تھی کہ وہ اس کی کلائی تھام کر روکتا دلکشی سے بولا تھا اور وہ اس کی حرکت و بات پر ساکت رہ گئی تھی، یہاں تک کہ ہاتھ چھڑانے کی بھی کوشش نہ کی تھی اور اس نے تین انگلیاں داہنے رخسار پر پھیریں تھیں اور وہ جیسے ہوش میں آ گئی تھی اور ہاتھ چھڑا کر وہاں سے بھاگی تھی اور وہ مسکراتا ہوا اس کے پیچھے آ گیا تھا۔
""تایا جان یہاں آپ تماشہ نہ لگائیں۔" وہ آتے ہی ان سے بولا تھا اور وہ دوڑ کر ان کے کاندھے سے جا لگی تھی۔
""ابی۔"
""ہمیں بھی یہاں آنے کا شوق نہ تھا، نہ تم مریم کو یہاں بھیجتے نہ ہمیں زحمت اٹھانا پڑتی اور تماشہ تو ہم لگانا ہی نہیں چاہتے، مریم کو ہمارے ساتھ جانے دو ہم کچھ کہے بغیر یہاں سے چلے جائیں گے۔" وہ سرد مہری سے بولے تھے۔
""مریم کو آپ تو کیا میں بھی نہیں لے جا سکتا ہوں تایا جان۔" وہ روتی ہوئی مریم کا ہاتھ تھام کر بولے تھے۔
""مطلب کیا ہے تمہاری بات کا؟" غصے سے پوچھا تھا۔
""صاف مطلب ہے، مریم اس گھر کی بہو ہے، ہم مریم کو اس کی ساس اور شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں لے جا سکتے۔"
""کیا بکواس ہے یہ؟" وہ بے یقینی سے دھاڑے تھے۔
""بکواس نہیں یہی حقیقت ہے۔" وہ قدرے سکون سے بولے تھے۔
""میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا علی، تم نے ہمیں مریم سے کبھی ملنے نہ دیا تم اسے لے کر فرار ہو گئے تھے، اٹھارہ سال ڈھونڈتے رہے اور جب یہ ملی تو تم اسے کسی اور کا بنا چکے ہو، میں تمہارے ساتھ ساتھ اس لڑکی کو اور یہاں موجود ہر ایک شخص کو جان سے مار دوں گا۔" وہ زخمی ناگ کی طرح پھنکارے تھے۔
""آپ مریم پر سے پسٹل ہٹا لیں تایا جان کہ میں جانتا ہوں، آپ کو مریم عزیز نہیں ہے، مریم کی دولت عزیز ہے اور میں مریم کی ساری دولت آپ کے نام کرنے کو تیار ہوں، اٹھارہ سال آپ سے فرار اسی لئے ڈھونڈتا رہا تاکہ آپ سے ملوں تو مریم کے بالغ ہونے کے بعد تاکہ اس کی ساری دولت آپ کے حوالے کر کے خود اپنی اور مریم کو سکون دے سکوں۔" اور انہوں نے گن نیچے کر لی تھی وہ ساری قانونی کاروائی کر کے آئے تھے اور انہوں نے حیران پریشان

کھڑی مریم سے پیپرز سائن کروائے تھے اور پیپرز ان کے حوالے کر دیئے تھے، انہوں نے ایک پیپر بھی سائن کروایا تھا کہ اب ان کا یہ ان کی فیملی کا مریم سے کسی قسم کا تعلق نہ ہوگا وہ اسے پریشان کرنے کی کوشش کریں گے تو ساری جائیداد چیئریٹی میں چلی جائے گی انہوں نے کافی پکا کام کیا تھا، انہوں نے شادی بھی اسی لئے کروائی تھی کیونکہ وہ انہیں جانتے تھے کہ ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ دولت بھی لیتے اور گن پوائنٹ پر نکاح بھی پڑھواتے کہ یہ تو ان کا گوارا ہی نہ تھا کہ ان کے دونوں بیٹے ہی عیاش فطرت رکھتے تھے اور ان کو دولت دینے پر اعتراض نہ تھا اصل اعتراض ہی مریم کے نکاح پر تھا۔

"میں صرف دولت پر اکتفا نہیں کر سکتا کہ مجھے دولت کی چاہ نہ تھی، مریم میری منگ تھی، آپ نے اس کا زبردستی نکاح پڑھوا دیا ہے میری غیرت کو للکارا ہے۔" خاموش کھڑے ارباز نے منہ کھولا تھا۔

"اب تو کچھ نہیں ہو سکتا ہے، مریم کا نکاح ہو گیا ہے، تمہارے باپ کو دولت کی چاہ تھی ساری دولت اس کے حوالے کر دی ہے بہتر ہوگا کہ آپ لوگ یہاں سے لوٹ جائیں۔" وہ اس کے تیز لہجے سے ہرگز متاثر نہیں ہوئے تھے۔

"میں یہاں اپنی منگ لینے آیا تھا اور لئے بغیر میں نہیں لوٹوں گا۔" وہ ہرگز بھی دھیما نہیں پڑا تھا۔

"ہوش میں رہ کر بات کرو مسٹر، یہ بیوی ہے میری۔" وہ کہاں غصہ برداشت کر سکتا ہے بری طرح دھاڑا تھا۔

"تایا جان بات بگاڑنے سے آپ کا ہی نقصان ہوگا کہ یہ مت بھولیں کے میں نے ساری دولت کن شرائط پر آپ کے نام کی ہے۔" وہ نہایت ترشی سے بولے تھے اور غیب نے سائڈ میں کھڑی انعم اور مریم کو اندر جانے کو کہا تھا کہ انعم باہر سے آ کر وہیں تھم گئی تھی نہ اسے اندر جانے کا خیال آیا تھا نہ ہی زوہیب شاہ کو، مگر وہ جیسے ہی روم میں آیا تھا پہلی ہی نظر اس پر پڑی تھی، وہ سائیڈ سے نکلتی کمرے میں جانے کے لئے نکلی تھی کہ وہ اس کا ہاتھ تھام گیا تھا وہ تو سہم کر رہ گئی تھی، غیب شاہ اشتعال کی زد میں آتا اس کی طرف بڑھا تھا کہ رک جانا پڑا تھا کیونکہ اس نے انعم کی کنپٹی پر گن رکھ دی تھی۔

"ارباز، ریوالور نیچے کرو اور انہیں چھوڑ دو۔" علی شاہ اس سچویشن پر گھبرا کر بولے تھے۔

"تم میری بہن کو چھوڑو، ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" غیب اشتعال کی زد میں آتا اس کی طرف لپکا۔

"دور رہو ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔" وہ دھاڑا تھا اور زوہیب نے ہوش قابو میں کرتے ہوئے اسے بازو سے تھام کر روکا تھا۔

"حواس قابو میں رکھو، اس نے گولی چلا دی تو سوچا ہے کیا ہوگا؟ انعم پہلے ہی کافی ڈری ہوئی ہے۔" انہوں نے لرزتی ہوئی بھتیجی کو دیکھ کر کہا تھا۔

"تایا جان یہ سب ٹھیک نہیں ہے اور دوستی و دشمنی ہمارے درمیان ہے، زوہیب کی فیملی کو انوالو نہ کریں، ارباز کو کہیں وہ......"

"مسٹر زوہیب کی فیملی انوالو ہو گئی ہے اور جب اس نے میری منگ سے شادی کی ہے تو مجھے تو اس کی بہن سے ہی شادی کرنی ہوگی۔" وہ بڑے سکون سے بولا تھا اور کلائی آزاد کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی انعم کو دیکھتے ہوئے اس کی کلائی پر گرفت مضبوط کی تھی اور وہ سسک اٹھی تھی۔

"پلیز چھوڑیں میرا ہاتھ، چاچو، بھا ہیلپ می۔" اس نے ان دونوں کو مدد کے لئے پکارا تھا، غیب آگے بڑھا تھا اور اس نے ہوائی فائر کی تھی اور اس کے ایک اشارے پر مسلح برداروں میں سے ایک نے اسے گرفت میں لے کر دوسرے نے گن تان لی تھی۔

"یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔" وہ خوف سے ان سے لپٹ گئی تھی اور اس کے رونے میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ روتی ہوئی انعم کو دیکھ نتائج کی پرواہ کیے بغیر مریم کو خود سے الگ کر کے ارباز کی طرف بڑھے تھے، ارباز نے دوبارہ ہوائی فائر کیا تھا گولیوں کی آواز پر گھر کی خواتین ہال کمرے میں آ گئی تھیں اور وہ ماں کو دیکھ اور اونچا اونچا رونے لگی تھی۔

"مما پلیز مجھے بچا لیں۔" وہ خوفزدہ انداز میں پریشان سی زوہیب کو دیکھنے لگی تھیں وہ لوگ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کریں تو کیا کہ انعم اور غیب، ریوالور کی زد پر تھے۔

"تم آخر چاہتے کیا ہو؟" علی شاہ بے بس ہوئے تھے۔

"مجھے میری منگ چاہیے تھی، تم نے میری منگ کو زبردستی کسی کی بیوی بنا دیا اور اس کی سزا تو تم سب کو ہی ملے گی اور اس شخص کو خاص طور پر جس نے میری منگ کو بیوی بنایا ہے اور اب میں اس شخص کو بہن کو بیوی بناؤں گا کیونکہ اسی طرح میں بلبلا اٹھنے والی انا کو کچھ قرار ملے گا۔" وہ بے لچک لہجے میں سرد مہری سے بولا تھا اس دوران وہ کچھ نہیں بولے تھے بیٹے کے تیور ہی دیکھتے رہے تھے اور تیور بھانپنے کے بعد انہوں نے اپنے ڈرائیور کو کال ملائی تھی اور اسے ساتھ لائے نکاح خواں کو اندر بھیجنے کی ہدایت کی تھی، غیب بھڑکنے لگا تھا اور جانباز شاہ کے اشارے پر اس آدمی نے غیب کو چھوڑ کر نورین اور نوین پر گنیں تان لی تھیں۔

"تم میں سے کسی نے حرکت کی، یا نکاح کی کاروائی میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی تو یہ عورتیں جان سے جائیں گی۔" جانباز شاہ بولے تھے اور نکاح کی کاروائی شروع ہوئی تھی اور وہ سب جیسے بے بس ہو گئے تھے، مگر وہ کسی بھی بات کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھے تھے اور نکاح خواں سے رجسٹر چھیننا چاہا تھا کہ ارباز شاہ کے اک اشارے پر نوین پر گن تانے شخص نے علی شاہ پر گولی چلا دی تھی جوان کی پسلی میں لگی تھی، رونے کی آوازیں اور چیخیں جیسے کہرام مچ گیا تھا مریم ان کی طرف دوڑی تھی مگر جانباز شاہ بازو جکڑ گئے تھے۔

"کوئی حرکت نہیں کرے گا، وگرنہ یہاں لاشوں کے ڈھیر ہوں گے۔" غیب شاہ کو بڑھتے دیکھ کر انہوں نے وارننگ دی تھی مگر وہ رکا نہ تھا اور ارباز شاہ نے انعم پر تانی ہوئی ریوالور کا رخ غیب شاہ کی جانب موڑا تھا، ٹریگر پر انگلی جمائی ہی تھی کہ وہ چیخ پڑی تھی۔

"آ...... آ...... آپ...... گ...... گولی...... گولی...... نہ...... چلائیے گا، م...... میں...... نک...... نکاح کے لئے تیار ہوں۔" علی شاہ کا تڑپنا اور بہتا خون وہ خوف سے لرزتی اٹک اٹک کر بولی تھی۔

"بابا، انعم پاگل ہو گئی ہو۔" غیب اور نورین ایک ساتھ چلائے تھے۔

"میرے لئے آپ سب بہت اہم ہیں، میں آپ لوگوں کو کھونا نہیں چاہتی۔" وہ ماں کو دیکھتے ہوئے بے بسی سے بولی تھی، مگر غیب و زوہیب کو یہ سب کب گوارہ تھا، زوہیب آگے بڑھے تھے اور ارباز نے گولی چلا دی تھی جوان کے بازو کو چھوتی گزر گئی تھی۔

اس کے بعد تو ان سب کی خوف سے جان نکلنے لگی تھی اور وہ سب ہی خاموش تماشائی بن گئے تھے، نورین نے اپنے حواس بمشکل قابو کیے اور ایک انجان اجنبی شخص سے خود آگے بڑھ کر نکاح پڑھوا دیا، غیب سے گواہان کے دستخط کے خانے میں انہوں نے ہی التجا کر کے دستخط کروائے تھے، نکاح کی کاروائی کے بعد وہ انعم کی کلائی تھامے تقریباً گھسیٹتا ہوا وہاں سے نکلا تھا، وہ سب روتے چیختے رہ گئے تھے۔

غیب باہر کی طرف لپکا تھا کہ "غیب انعم کی فکر چھوڑو اور اپنے چاچو اور علی کو ہاسپٹل لے کر دوڑو۔" اسے بات سمجھ آ گئی تھی زوہیب شاہ تو خطرہ سے باہر تھے مگر علی شاہ کے خون بہت بہہ گیا تھا نورین اور غیب نے انہیں خون دیا تھا، مگر ان کی حالت خطرے میں ہی تھی ڈاکٹرز بھی پر امید نہ تھے کہ ایک گولی ایک ہفتہ قبل لگی تھی وہی ریکوری نہیں ہوئی تھی کہ آج گولی کا لگنا خون کا بہہ جانا، وہ سب پریشانی کے عالم میں ان کے لئے دعا گو تھے۔

"چاچو یہ لوگ اتنے خطرناک تھے تو آپ کو اتنا بڑا رسک لینا ہی نہیں چاہیے تھا، وہ انعم کو نہ جانے کہاں لے گئے ہوں گے؟"

"میں نہیں جانتا تھا، مجھے علی نے صرف یہی بتایا تھا کہ ان کا تعلق جاگیردار گھرانے سے ہے، ان کے فادر اور مدر، کزنز تھے، مدر بڑے بھائی کی منگ تھیں ان کے فادر اور مدر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور انہوں نے بھاگ کر شادی کر لی، جانباز شاہ ان کی جان کے دشمن بن گئے تھے، علی کے پیرنٹس لندن چلے گئے تھے، ان کے پاس سرمایہ وغیرہ کچھ نہ تھا، بس زمینوں کے پیپر تھے جو وہ لندن میں فروخت نہیں کر سکتے تھے اور پیسے کی کمی انہیں واپس پاکستان لے آئی ساری زندگی اپنی فیملی سے ڈرتے رہے لیکن جانباز شاہ نے ان کا سراغ لگا لیا اور بھائی بھاوج کی جان لے لی، پولیس آ گئی تھی اس لئے وہ بھتیجا، بھتیجی کو لے جا نہ سکے اور گھر کی ملازمہ نے چودہ سالہ علی کو صورتحال بتائی اور دونوں بچوں کو لے فرار ہو گئیں، اس وقت مریم محض دو ماہ کی تھی، اس کے بعد وہ ساری عمر چھپتے ہی رہے کہ انہیں لگتا تھا کہ وہ ان دونوں کی بھی جان لے لیں گے اور جب جانباز شاہ نے ان کا سراغ لگا لیا تو انہوں نے مریم کو ہمارے گھر بھیج دیا، کیونکہ جانباز شاہ بھتیجے سے ملے تھے اور انہوں نے زمینوں کے پیپرز مانگے تھے علی نے بے وقوفی کی اور کہہ دیا کہ تمام پیپرز ان کے پیرنٹس ان دونوں کے نام کر چکے ہیں اور انہوں نے اسی وقت فیصلہ سنا دیا کہ مریم کی شادی ارباز سے ہو گی، وہ اپنے والدین کے قاتلوں سے بہن کی شادی نہیں کر سکتے تھے اس لئے اسے یہاں ہمارے گھر بھیج دیا، علی پر انہوں نے قاتلانہ حملہ کروایا اور انہوں نے بہن کو تحفظ دینے کے لئے مجھ سے ریکوئسٹ کی کہ ہم اسے اپنے گھر کی بہو بنا لیں اور اس کے بعد جو کچھ ہوا تم جانتے ہو، میں نے جو کچھ کیا دوستی اور انسانیت کے لئے کیا، ہمارے ساتھ جو ہوا اس میں، میں لیکن علی کو قصوروار نہیں مانتا اور مجھے اللہ پر پورا بھروسہ ہے کہ ہماری نیک نیتی کے ہی سبب ہماری انعم پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔" اس کی آنکھوں میں غصہ و نفرت دیکھ کر نرمی سے بولے تھے۔

"آنچ نہیں آئے گی اور کتنا برا چاہتے ہیں آپ چاچو، ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری بہن کا نکاح ایک انجان شخص سے ہتھیار کی نوک پر ہو گیا، یہ تک نہیں جانتے کہ وہ کہاں رہتا ہے، ہماری انعم کو لے کہاں گیا ہے۔" وہ بری طرح بھڑک اٹھا تھا علی شاہ کومے میں چلے گئے تھے اور وہ کچھ دیر کے لئے گھر آئے تھے کہ مریم نوین اور ارم نے رو رو کر حشر کیا ہوا تھا۔

"جس طرح کی نیچر کے وہ لوگ تھے اس لحاظ سے تو شکر ادا کرو کہ وہ انعم کو جائز طریقے سے ہی لے گئے ہیں، کتنے کمزور پڑ گئے تھے ہم سب اس وقت، ہتھیار کی نوک پر شکر ادا کرو کہ نکاح ہی پڑھوایا، یونہی اٹھا کر نہیں لے گئے۔" نورین روتے ہوئے بے بسی سے بول رہی تھیں۔

نوین اور ارم ان سے لپٹ کر رونے لگی تھیں، اس کی شریانوں میں گرم لہو ٹھوکریں مارنے لگا تھا نورین کی طرف لپک رہی تھی کہ اس نے بازو جکڑ لیا تھا۔

"میرے گھر کے کسی بھی فرد سے تمہیں رشتے داری بنانے کی ہرگز بھی ضرورت نہیں ہے کمرے میں دفع ہو جاؤ اپنی شکل بھی مت دکھانا مجھے، کہ تم ہی اصل فساد کی جڑ ہو، میری بہن کو کچھ ہوا، اسے آنچ بھی آئی تو تم سے جینے کا حق چھین لوں گا۔" اس کی انگلیاں اسے اپنے بازو میں گڑھتی محسوس ہو رہی تھیں، وہ سسک اٹھی تھی اور اس نے ایک جھٹکے سے بازو آزاد کیا تھا اور وہ منہ کے بل زمین پر جا گری تھی۔

"غیب۔"

"مما اب مجھ سے اس لڑکی کی حمایت کوئی نہیں کرے گا، میرے اختیار میں ہوتا نہ تو ابھی اسے جان سے مار دیتا جس نے ہماری پرسکون زندگی میں آگ لگا دی ہے، اس کا محترم بھائی تو ہمیں مشکلات کے حوالے کر کے وہاں ہسپتال میں پڑا ہے، اس سے پوچھیے کہ کہاں ہے اس کے تایا کا گھر، تاکہ ہم انعم کی خبر گیری کو تو جائیں وہ نہ جانے کس حال میں ہو گی۔" اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں اور وہ غصہ سے کف اڑا رہا تھا، زوہیب نے اسے جھک کر اٹھایا تھا۔

"چاچو میں نہیں جانتی مجھے تو آج سے پہلے یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ میرے کوئی تایا بھی ہیں۔" وہ ان کے کاندھے سے لگی سسک اٹھی تھی۔

"میری بہن کا مجھے پتہ نہ چلا تو میں تمہیں تمہارا نام بھی بھلا دوں گا۔" وہ دھاڑا تھا اور وہاں ٹھہرا نہ تھا وہ ایک دوسرے کو کسی قسم کی تسلی بھی نہ دے سکے تھے۔

☆☆☆

"ارباز! تمہارے تیور دیکھتے ہوئے میں نے تمہارا ساتھ تو دے دیا لیکن تمہاری حرکت مجھے پسند بالکل نہیں آئی ہے۔" وہ بیٹے سے خفگی سے مخاطب تھے اور اس کے قہقہہ لگانے پر جس میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"ضرورت ہی کیا تھی اس سب کھڑاک کی، جانتا ہوں حسین عورتیں کمزوری ہیں تمہاری، لیکن اس مصیبت کو گلے کا ہار بنانے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ بیک مرر سے بے ہوش انعم کو دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

"بابی سائیں موقع اچھا تھا تو گنواتا کیوں اور لانے کو تو میں اس لڑکی کو یوں بھی لا سکتا تھا۔" وہ معنی خیزی سے باپ کو دیکھتا ہوا بول رہا تھا۔

"ہاں تو یہی میں کہہ رہا ہوں، بھا گئی تھی یا بدلہ لینا تھا تو نکاح کی راہ کیوں چنی، یہ انتقام نہیں لگ رہا مجھے۔" وہ اک بار پھر قہقہہ لگا گیا۔

"بابی سائیں یہ ان بھلے مانس لوگوں کے لئے تو اذیت ناک ہی انتقام ہے اور میں نے یہ راہ صرف اس لئے چنی کہ میں نے اپنی بے عزتی کا بدلہ تو ہر صورت لینا تھا ہاں ٹریک ذرا بدلا ہے تو صرف اس لئے کہ یہ لڑکی میرے محسنوں میں سے ہے۔" اس نے انعم کے ہوش و خرد سے بیگانہ آنسوؤں اور میک اپ کے مٹے مٹے نشانات

اسے حزین حسین چہرے کو دیکھا تھا۔

"مطلب کیا ہے تمہاری بات کا؟"

"بابی سائیں، کچھ سال قبل میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، مجھے ہاسپٹل لے جانے اور اپنا خون دے کر میری جان بچانے والی یہی لڑکی تھی۔" اس نے انعم کے گلابی نم رخسار پر انگلی پھیری تھی۔

"مریم کے نکاح سے میری انا و غیرت پر چوٹ لگی ہے اور یہ لڑکی میرے محسنوں میں سے نہ ہوتی تو اس شخص نے جس نے اتنی بڑی جرأت کی تھی اس سے انتقام لینے کے لئے میں اتنی سیدھی راہ نہ چنتا، مگر اس لڑکی کا مجھ پر احسان تھا اس لئے میں نرمی دکھا گیا۔" اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"یعنی اس ڈھول کو تم نے ساری زندگی گلے میں لٹکا کر پیٹتے رہنا ہے۔" وہ بیٹے کی سوچ کسی حد تک سمجھ گئے تھے۔

"اسے حویلی میں ہی رکھو۔"

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں کہ احسان چکانے کے چکر میں بہت بڑا رسک لے چکا ہوں، اس کے بارے میں جانتا نہیں ہوں کچھ بھی، اس لئے مجھے کچھ وقت درکار ہو گا یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ میری نسل اس عورت سے چلے گی کہ نہیں؟ اور جس دن یہ فیصلہ ہو گیا یا تو اسے حویلی لے آؤں گا، دے دینا آپ اسے اپنی بہو کا درجہ، فیصلہ مخالف سمت میں ہوا تو ڈال دیجئے گا حویلی کے کسی بند کمرے میں، روکوں گا نہیں کہ احسان اتر چکا اب اسے اپنی سوچ پسند اور معیار کے مطابق ہی پرکھوں گا جس میں کمی بیشی تو میں برداشت نہیں کر پاؤں گا۔" وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی بات اپنی پسند و ضد اوپر رکھتے ہیں، جھکتے نہیں جھکانا پسند کرتے ہیں۔

"اوئے بس ہولا ہتھ رکھ، اس نے تیری جان بچائی تھی اس لئے اس سے ہمدردی ہو رہی ہے کہ جس نے میرے سوہنے پتر کو نئی زندگی دی تھی وہ تو سونے میں تولے جانے سر آنکھوں پر بٹھائے جانے کے لائق ہے اور تیرے عزائم بڑے ہی خطرناک لگ رہے ہیں۔" وہ ساری بات جان کر بیٹے کو گھر کنے لگے تھے۔

"بابی سائیں میں نے کرنا وہی ہے جو سوچ چکا ہوں یا کرنا چاہوں گا، اس لئے مجھے سمجھانے کی کوشش نہ کریں آپ حویلی چلے جائیں میں کراچی جا رہا ہوں۔" وہ بات کرنے کے لئے بیٹے کی گاڑی میں سفر کر رہے تھے، اس کے دو ٹوک انداز پر خاموشی اختیار کرتے ہوئے اسے خدا حافظ کہتے اترے اور پیچھے آتی اپنی گاڑی میں سوار ہوئے حویلی کے لئے روانہ ہو گئے اور اس کے کہنے پر ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی تھی کہ اسے انعم کی بے ہوشی تشویش میں مبتلا کرنے لگی تھی، اس لئے وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا کہ فی الحال اسے اسے ہوش میں لانے کی تدبیر نہیں کی تھی۔

☆☆☆

نہ جانے کتنے گھنٹوں بعد اس نے آنکھیں کھولیں، سر بری طرح چکرا رہا تھا اور وہ دھیرے دھیرے ہوش میں آ رہی تھی، چکراتے سر کو تھامتی اٹھ بیٹھی پہلی یہ نگاہ صوفے پر بیٹھے ارباز خان پر پڑی، پہلے تو وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی اور جیسے جیسے حواس قابو میں آنے لگے گزرے واقعات یاد آنے لگے اور آنسو قطرہ قطرہ آنکھوں سے گرنے لگے تھے جبکہ وہ گہری نگاہ سے اس کے حسین چہرے پر پھیلی سراسیمگی دیکھ رہا تھا، وہ صوفے سے اٹھا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھائی اور بیڈ کے کونے پر بیٹھ گیا وہ بے ارادہ ہی کچھ پیچھے کو کھسکی تھی اور اس نے اس کا نرم سفید دودھیا ہاتھ

تھام لیا اس کی آنکھوں میں خوف کی لکیر اپنی جگہ بناتی چلی گئی۔

"آپ سے ملاقاتیں کرنے کا آپ کو دیکھ ہی سوچ لیا تھا لیکن آپ تو ہمیں زندگی دے کر فرار ہی ہو گئی تھیں، آپ کا شکریہ تک ادا نہیں کر سکے تھے، پھر چند سال بعد آپ ملیں پہلے سے زیادہ حسین لگیں، ملاقات کا ارادہ ہی باندھا تھا کہ ہم نے سارے حقوق ہی حاصل کر لئے، یہ سب آپ کے لئے شاکنگ تو ہو گا، مگر اسے قبول تو کرنا ہی پڑے گا کہ آپ کی سمجھ داری کا تو میں قائل ہو گیا ہوں، جس طرح آپ نے میری جان بچائی اور پھر اپنے بھائی کی زندگی کے لئے نکاح کے لئے رضا مندی ظاہر کی، لگتا ہے آپ زندگیاں بانٹنے کو ہی آئی ہیں۔" وہ ڈر رہی تھی اور وہ یوں بول رہا تھا جیسے بہت گہرے دوستانہ مراسم ہوں۔

"مم...... میں نے اپنی مما سے بات کرنی ہے۔" اس کے نرم و ملائم ہاتھ کو سہلاتے ہوئے چوما تھا اور وہ ہاتھ کھینچتی بے بسی سے بولتی اسے سخت بدمزہ کر گئی تھی۔

"ان فسوں خیز لمحات میں بات کی بھی تو کیا۔" چڑے ہوئے انداز میں کہہ کر اس نے گھبرائے ہوئے خوفزدہ سے انداز ملاحظہ کیے تھے۔

"میں نے اپنی مما سے بات کرنی ہے، وہ بہت زیادہ پریشان ہوں گی میرے لئے، میری پلیز مما سے بات کروا دیں۔" اس نے اسے بغور دیکھا اس کے حسین چہرے پر اداسی و بے بسی رچی تھی، آنکھوں میں ساون کی جھڑی لگی تھی، تراشیدہ لبوں پر التجا تھی اور وہ اسے بہت زیادہ خاص لگی اتنی کہ وہ اس کی بات سے انکار نہ کر سکا اور اسے کہاں یقین تھا کہ وہ اس کی بات اتنی آسانی سے مان لے گا، اس نے حیرت سے اس کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر اسے دیکھا اور وہ مسکرا دیا اس نے جھجکتے ہوئے اس کے ہاتھ سے موبائل لیا اور نورین کا نمبر ڈائل کیا تھا، تیسری بیل پر انہوں نے کال ریسو کر لی۔

"انعم میری جان۔" وہ بڑے وثوق سے بولیں تھیں کہ دوسری جانب انعم ہی ہو گی۔

"مما۔" اس نے ان کے یقین پر مہر لگائی تھی۔

"انعم کیسی ہو میری جان تم ٹھیک ہو نہ؟ تم کہاں ہو بیٹا؟" وہ ایک ہی سانس میں نہ جانے کتنے سوال بے حد بے قراری سے کہہ گئی تھیں ان کے آنسو بے قراری سے گر رہے تھے۔

"مما میں ٹھیک ہوں آپ پریشان نہ ہوں، چاچو کہاں ہیں مما، وہ ٹھیک ہیں نہ، میری ان سے بات کروائیں۔" وہ اس کو دیکھ رہا تھا جو رو رہی تھی مگر اپنے لئے نہیں اپنوں کے لئے۔

"مم مجھے نہیں معلوم چاچو بٹ آپ پریشان نہ ہوں میں گھر آؤں گی۔" زوہیب شاہ نے اس سے ایڈریس پوچھا تھا تو وہ بولی تھی اور انہوں نے اس سے ارباز سے بات کروانے کو کہا تھا۔

"چاچو آپ سے بات کریں گے۔" موبائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی تھی اور وہ بات کرنے سے انکار کر گیا تھا مگر اس کی جھیل سی آنکھوں میں اترتی التجا اس نے موبائل لے کر کان سے لگا لیا۔

"انعم میری جان نکاح جن بھی حالات میں ہوا ہو، مگر بیٹا تم نے اس رشتے کو نباہنا ہے، ارباز جیسا بھی ہو تم نے اسے اپنا سمجھنا اس کو اہمیت دینی ہے، آج تم کمپرومائز کرو گی تو دیکھنا آگے کی زندگی بہت سہل ہو گی، سمجھ رہی ہو نہ بیٹا اور ابھی

ارباز ہم سے بات نہیں کرنا چاہتا تو تم پریشان نہ ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے ارباز کا انکار سنا تھا اس لئے نرمی و پیار سے بھتیجی کو سمجھا رہے تھے یہ جانے بغیر کہ ان کی باتیں ارباز سن رہا ہے اور اس نے کچھ کہے بغیر فون انعم کی طرف بڑھا دیا۔

"اپنا خیال رکھنا بیٹا۔" اس نے سنا تھا اور جی چاچو کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا تھا اور سیل فون اس کی جانب بڑھایا تھا اس نے سیل فون ہی نہیں اس کا ہاتھ بھی تھام لیا تھا اور وہ ماں کی سمجھائی بات کی روشنی میں صبر و برداشت اور کمپرومائز کی راہ پر چل نکلی تھی، کہ نورین نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ اس آزمائش پر کھری اترنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی اور اس نے پہلا قدم رکھ دیا تھا۔

مگر زندگی اس کا کڑا امتحان لینے والی ہے کہ جب اس نے ارباز کو ڈرنک کرتے دیکھا تو اس کے قدم اکھڑنے سے لگے تھے اور اس نے کتنی بے یقینی و دکھ سے پوچھا تھا۔

"آ...... آپ ڈ...... ڈ...... ڈرنک...... ڈرنک کرتے ہیں؟" اس کا لہجہ کانپ رہا تھا اور وہ قہقہہ لگا گیا تھا۔

"میں کیا کیا کرتا ہوں تمہیں کہاں معلوم ہے جان ارباز۔" اس نے آنکھ دبائی تھی اور اس کے ہاتھ کو تھام کر لبوں سے لگایا تھا، مارے وحشت و بے یقینی اور بدبو کے اسے اپنی سانس بند ہوتی محسوس ہوئی تھی، وہ اس کی گرفت میں بن پانی کی مچھلی کی مانند تڑپ کر رہ گئی تھی اور وہ اس پر گیرا تنگ کرتا اپنی بے باکی کی داستانیں سنا رہا تھا اور اسے لگا تھا کہ اصل امتحان اور آزمائش تو شروع ہی اب ہوئی ہے اور وہ جیسے جیسے اس کے بارے میں جان رہی تھی دکھ اور بے بسی کا شکار ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

"تم میرے سامنے نہ آیا کرو، جی کرتا ہے تمہاری جان لے لوں۔" نورین نے اس کے ہاتھ منیب کے لئے جوس بھیجا تھا اور وہ جو آنا ہی نہیں چاہتی تھی اس کے غصے و نفرت سے کہنے پر اس کے آنسو گرنے لگے تھے، انعم کے زبردستی نکاح اور علی شاہ کو کومے میں گئے چھ ماہ گزر گئے تھے اور اس دوران سیدھے منہ بات کرنا تو دور وہ اس کی اپنے آس پاس موجودگی کو بھی پسند نہیں کرتا، ماں پھپھو اور چاچی کا خیال کیے بغیر اسے لمحوں میں ذلیل کر کے رکھ دیتا۔

"آپ میری جان لے ہی لیجئے میں خود بھی اپنی زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔" وہ روتے ہوئے مزید کہتی کہ۔

"تڑاخ، بکواس بند کرو اور دفعہ ہو جاؤ یہاں سے ہماری زندگی کو جہنم بنا کر تم اتنی آسانی سے مر جاؤ گی، جیسے پل پل ہم مر رہے ہیں، تم بھی مرو گی روز جیو گی روز مرو گی۔" وہ غصہ سے کف اڑا رہا تھا۔

"وہ سب جو بھی ہوا، اس میں میرا بھی اتنا ہی نقصان ہوا ہے جتنا آپ سب کا۔"

"تمہارا نقصان ہوا بھی ہے تو ہم ذمہ دار ہو، صرف تمہاری وجہ سے آج انعم ہم سے دور ہے، تین ماہ سے اس کی شکل تک نہیں دیکھی، وہ نہ جانے کس حال میں ہو گی، تمہارے بھائی نے تمہیں محفوظ پناہ دینے کی خاطر میری بہن سے محفوظ پناہ چھین لی ہے، وہ ایک ایسے شخص کی بیوی بن کر ہمارے سامنے سے چلی گئی جسے ہم جانتے تک نہیں ہیں، وہ شخص جو تمہارے بھائی کو تمہارے لئے مناسب نہیں لگا تھا وہی شخص تمہیں پناہ دیتے دیتے میری معصوم بہن کا نصیب بن گیا اور تم کہتی ہو تمہارا نقصان ہوا ہے، نقصان تو ہمارا

ہوا ہے، میری غیرت کا خون ہوا ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے بندوق کے زور پر وہ شخص میری بہن کو لے گیا اور میں کچھ کر ہی نہیں سکا۔" اس کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی تھی۔

"میں یہاں آنے سے پہلے اس سب سے انجان تھی جس سبب یہاں بھیجی گئی تھی، مگر چاچو کسی بات سے انجان نہ تھے، انہیں ابی نے مجبور نہیں کیا تھا کہ وہ میری مدد کریں، مگر انہوں نے کی، مجھے سہارا دیا یہ ان کی اچھائی تھی، جو کچھ ہوا ویسا کسی نے بھی نہیں سوچا تھا، نہ چاہا تھا، میں کسی کو بھی تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی، مگر میں نے آپ سب کو تکلیف پہنچائی ہے، جو انعم کے ساتھ ہوا وہ سب میں لوٹا نہیں سکتی، میری شرمندگی سے انعم کے ساتھ ہوا ظلم مٹ نہیں سکتا اس کے باوجود میں انعم سے بہت شرمندہ ہوں، اس گھر کے مکینوں کے احسانات میں مرتے دم تک نہیں اتار سکتی۔" کہہ کر وہ اس کے روم سے نکل گئی تھی۔

"انعم کے ساتھ جو ہوا اس میں مریم کا قصوروار ٹھہرانا چھوڑ دو، منیب، انعم کو وہ ملا جو انعم کا نصیب تھا اور مریم کو وہ ملے گا جو مریم کا نصیب ہے، دونوں الگ ہیں دونوں کو الگ ہی رہنے دو، مریم کو میں نے بہن بنایا تھا وہ میرے لئے اتنی ہی اہم ہے جتنی نورین اور انعم اور انعم تکلیف میں ہو گی یہ احساس مجھے رات کو سکون سے سونے نہیں دے گا۔" وہ اس کے کمرے میں کسی کام سے آئے تھے مگر ان دونوں کی آواز سن کر باہر تھم گئے تھے اور مریم کے جاتے ہی اندر آ کر بولنے لگے تھے۔

"چاچو!"

"تمہیں میرے ہی منہ سے میری موت کی بات سننا گوارہ نہ ہو سکی، مریم کے بارے میں سوچا ہے، اس دنیا میں اس کا واحد عزیز اس کے

جینے کا سہارا اس سے بے خبر ہسپتال میں پڑا ہے، مریم کو سہارے کی، ہمدردی کی، اپنائیت کی ضرورت ہے تم نے نہ چاہتے ہوئے بھی نکاح کیا ہے مریم سے، ذمہ داری ہے وہ تمہاری اس مشکل وقت میں اس کی ڈھال، اس کا سہارا بنو، طنز و تحقیر سے تو تم اپنے مقام، انسانیت کی معراج سے گر رہے ہو۔" ان کے لہجے میں آزردگی تھی وہ شرمندہ ہونے لگا تھا۔

"اگر انعم کے ساتھ غلط ہوا ہے تو تم مریم کے ساتھ غلط کر رہے ہو اور اس سب سے انعم کا بھلا نہیں ہو رہا، اگر تم مریم کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ گے تو عین ممکن ہے کہ تمہارا نیک عمل، ہماری انعم کی مشکلات کا خاتمہ کر دے، ہماری بچی ہم سے آ ملے۔" وہ بھیگی پلکوں سے بھتیجے کو دیکھتے اس کے کمرے سے نکل گئے تھے۔

☆☆☆

سفید حویلی پر انعم کے اچانک زبردستی نکاح پر جو افتاد ٹوٹی تھی اس سبب حویلی میں منعقد ہونے والی شادیاں ملتوی ہو گئی تھیں، مگر زیادہ دن تک نہیں کہ لائبہ کے والدین کو حج کی ادائیگی کے لئے اور ارم کے منگیتر ہاشم کو بیرون ملک جانا تھا کہ وہاں سے اسے جاب کی اچھی آفر تھی اور وہ بیوی کو بھی ساتھ لے جا سکتا تھا اس لئے ضرورت کے تحت ان لوگوں نے سمجھوتہ کر لیا تھا اور انعم کی کمی محسوس کرنے کے باوجود اس کے بغیر ہی دونوں شادیاں بڑی سادگی سے ہو گئی تھیں تمام ملنے جلنے والوں کو انعم کے حوالے سے ان لوگوں نے جس طرح مطمئن کیا تھا یہ بس وہی جانتے تھے، دن یونہی سوگوار گزر رہے تھے کہ ارم کو باہر گئے بھی ایک ماہ ہو گیا تھا اور سوگواریت ایکدم خوشی میں تبدیل اس دن ہو گئی جب علی شاہ کومے سے باہر آ گئے، مریم تو جیسے ایک بار پھر جی اٹھی تھی

کہ اس نے ان کی صحت یابی کے لئے بہت دعائیں کی تھیں اوران سب نے بھی کہ ایک وہی ارباز شاہ کا پتہ دے سکتے تھے۔

"میں اور غیب کئی بار گاؤں گئے لیکن ہمیں ارباز کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلا کہ اس کے قادر نے بھی ہمیں کچھ نہیں بتایا، ارباز بھی وہاں نہیں تھا، وہ انعم کو کہاں لے گیا ہے، ہم نہیں جانتے۔" علی شاہ نے ارباز کے گاؤں کا پتہ بتایا تھا تو وہ آزردگی سے بولے تھے کہ وہ گاؤں تک تو جیسے تیسے پہنچ گئے تھے، ارباز کے والد سے ملاقات بھی ہو گئی تھی مگر ارباز تک نہیں پہنچ سکے تھے کیونکہ ارباز نے اپنے تئیں ان کی یہی سزا مقرر کی تھی کہ وہ لوگ انعم کی شکل تک دیکھنے کو ترسیں گے اور اسے انعم پر بھی رحم نہیں آیا تھا جو اس کی ہر برائی برداشت کرتی اس کا ایک اچھی بیوی کا طرح خیال رکھتی اس کے ساتھ گزارا کر رہی تھی اور وہ اس سب کو انعم کی اچھائی نہیں مجبوری و بے کسی سمجھتا تھا کہ اس کے سوا اس کے پاس دوسرا راستہ نہیں تھا، اگر راستہ ملا تو وہ اس کے ساتھ رہنے کی بجائے اسے چھوڑ جائے گی اور یہ تو وہ کبھی چاہیگا نہیں اس لئے اسے اپنے گھر میں گویا قید کر چھوڑا تھا۔

"مگر میں جانتا ہوں، ارباز کراچی میں کہاں رہتا ہے وہ انعم کو وہیں لے کر گیا ہو گا۔" علی شاہ یقین سے بولے تھے اور ایڈریس بتایا تھا۔

"میں آج ہی کراچی جاؤں گا۔"

"نہیں، زوہیب کراچی تم نہیں میں جاؤں گا، ارباز سے تم نہیں بات میں کروں گا، کیونکہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں تم گئے تو وہ انعم کو تم سے ملنے نہیں دے گا، یہاں تک کہ تم سے بات بھی نہیں کرے گا، اس سے کیا کیسے بات کرنی ہے میں اچھے سے جانتا ہوں۔" وہ نقاہت زدہ لہجے میں بول رہے تھے۔

اور زوہیب شاہ نے خاموشی اختیار کر لی تھی مگر علی شاہ کی طبیعت کے پیش نظر جانے نہیں دیا تھا مگر وہ دوسرے ہی ہفتے کسی کو بھی بتائے بغیر چلے گئے تھے، ارباز کو انہیں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کیونکہ ان کے کومے میں جانے کا تو پتہ تھا صحت یاب ہو جانے کا انہیں دیکھ کر علم ہوا ہے۔

"تم بڑے ہی ڈھیٹ واقع ہوئے ہو یہ تیسری بار تم موت کو شکست دے کر آئے ہو۔" وہ تلخی سے بولا تھا۔

"جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے۔" وہ رسانیت سے بولے تھے۔

"بستر پر پڑے پڑے فلسفہ سیکھ گئے ہو، خیر یہاں کیسے آنا ہوا، تم تو ہمارے گھر کی دہلیز پار کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔" اس کی تلخی برقرار تھی۔

"توہین تو آج بھی محسوس کر رہا ہوں ارباز شاہ، مگر آج مجبوری تمہارے در پر لے آئی ہے، یہ بتاؤ انعم کہاں ہے؟" وہ اس سے زیادہ تلخی سے بولے تھے۔

"مجھے پتہ تھا، اگر تم موت کو شکست دینے میں ہر بار کی طرح کامیاب ہوئے تو مجھ سے یہ سوال کرنے ضرور آؤ گے، مگر میں تمہارے سوال کا جواب دینے کا خود کو پابند نہیں سمجھتا۔" وہ صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بڑے پرسکون انداز میں بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"دوسروں کا سکون برباد کر کے تم اتنے سکون میں کیسے رہ سکتے ہو ارباز؟" اس کا پرسکون انداز بری طرح کھلا تھا اور وہ کہے بنا رہ نہیں سکے تھے۔

"ہاہاہا، تمہارے محسن کے گھر سے سکون کا سامان لے کر آیا تھا یار، تو کیسے نہ پرسکون ہوتا۔"

"تم انتہائی کمینے شخص ہو ارباز۔" غصہ سے ان کا چہرہ لہو رنگ ہو گیا تھا۔

"تعریف کرنے کا شکریہ، کچھ اپنے محسنوں کا بتاؤ نیکی کر کے اس کا انجام دیکھ کس حال میں ہیں؟" وہ برا مانے بغیر پوچھ رہا تھا۔

"نیکی کر کے پچھتاوے میں مبتلا نہیں ہیں، بس اپنی بیٹی کے لئے آزردہ ہیں، تم نے بہت غلط کیا تھا ارباز۔"

"ہاہاہا، غلط، الزام نہ دو علی، اگر انعم کا مجھ پر میری زندگی پر احسان نہ ہوتا تب ضرور غلط کرتا، یہ تو تمہارے محسنوں کی خوش نصیبی تھی کہ وہ لڑکی میرے محسنوں میں سے نکلی تو میں اسے نکاح کر لایا، ایسا نہ ہوتا تو اس حجت میں پڑنے کی بجائے بغیر نکاح کے اٹھا لاتا۔" بغیر لحاظ و شرم کے بولا تھا۔

"ارباز!" وہ بے ساختہ دھاڑے تھے۔

"تم جانتے ہو میں ایسا ہی کرتا، مجھ سے بحث کرنے یا وقت ضائع کرنے کی بجائے جیسے آئے ہو ویسے ہی لوٹ جاؤ کہ یہ تمہاری اور تمہارے محسنوں کی خام خیالی ہے کہ تم لوگ انعم سے کبھی مل پاؤ گے، غیب شاہ نے میری منگیتر کو بیوی بنایا ہے، میں نے اس کی بہن کو بیوی بنا کر تذلیل کا تھوڑا سا بدلہ لیا ہے جو آگ آج بھی دل میں لگی ہے وہ انڈیلنے پر آیا تو تم سب جل کر خاکستر ہو جاؤ گے، میرا انتقام پورا نہیں ہوا ہے، ہاں ٹھنڈ اس وقت پڑتی محسوس ضرور ہوتی ہے جب غیب شاہ کو اپنی بہن کو ڈھونڈتے ہوئے پاتا ہوں، اتنے سے عرصے میں وہ اور زوہیب کتنے ہی چکر گاؤں کے کاٹ چکے ہیں مگر میں بھی فیصلہ کر چکا ہوں وہ بھی اور انعم بھی تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے لیکن انہیں ایک دوسرے سے ملنے نہ دوں گا۔" وہ رعونت سے بول رہا تھا۔

"یہی میرا ان سب پر احسان ہے کہ پہلی شام انعم کی ان سے بات کروا دی تھی۔" اس نے سر جھٹک کر سگریٹ سلگائی تھی۔

"دیکھو ارباز، انعم سے تم نے شادی کی ہے، بیوی ہے وہ تمہاری اس کا خیال رکھنا تم پر لاگو ہوتا ہے اور یہ انسانیت نہیں ہے کہ تم اسے اس کے گھر والوں سے ملنے نہ دو، کہ ایک تو تم نے بزور طاقت اسے اپنے نکاح میں لیا اور اسے قید کر چھوڑا ہے، جبکہ وہ تمہاری مجرم بھی نہیں ہے تو پھر تم اسے کس بات کی سزا دے رہے ہو؟" وہ دھیمے لہجے میں بولے تھے جبکہ غصہ تو شدید آ رہا تھا، مگر وہ غصہ کر کے اس کو غصہ نہیں دلا سکتے۔

"وہ میری مجرم نہیں ہے اس کا بھائی اور چاچا تو ہے اور یہ اس کا ہی احسان تھا جو وہ آج میرے ساتھ جائز طریقے سے رہ رہی ہے ورنہ یہ تو تم بھی جانتے ہو علی کے میری زندگی میں جائز طریقے سے کتنی لڑکیاں آئی ہیں۔"

"اچھے سے جانتا ہوں تمہاری بے راہ روی کے ہی سبب تو میں تمہارے اور مریم کے رشتے کے خلاف تھا، مگر کہاں جانتا تھا کہ اپنی بہن کو تحفظ دیتے دیتے زوہیب کی بھتیجی کو اس دلدل میں پھنسنے کا سبب بن جاؤں گا۔" وہ آزردہ ہو گئے تھے۔

"اب تو جان گئے ہو نہ کہ تم نے ٹکر غلط انسان سے لی تھی۔" دھواں فضا میں آزاد کیا تھا۔

"تم کیا چاہتے ہو ارباز، کوئی راہ ہے جو تمہارے فیصلے کو بدل دے؟" اس کا فیصلہ سن فیصلے کی ڈور پھر اسی کو تھمائی تھی۔

"میں کہوں نہیں ہے تو؟"

"میں کہوں گا کہ دوسری راہ نکالو کہ میں چاہتا ہوں کہ تم انعم کو یہاں نہیں گاؤں میں پوری عزت اور حق کے ساتھ رکھو، اس کو اپنے خاندان

سے اپنی بیوی کی حیثیت سے متعارف کرواؤ اور اسے اس کے خاندان سے ملنے دو اس کے خاندان سے بہ حیثیت داماد متعارف ہو۔" وہ سنجیدگی سے بول رہے تھے۔

"میں یہ سب جب کرنا ہی نہیں چاہتا تو تمہارے کہنے پر کیوں کروں؟" وہ بات تخی سے کاٹ گیا تھا۔

"تمہیں ایسا کرنا پڑے گا، تمہیں انعم کو معاشرے میں اصل مقام لوٹانا ہوگا، نکاح کیا ہے نہ تم نے اس سے تو یہاں کیوں رکھا ہوا ہے جہاں تم ہر نئے دن و رات نئی لڑکی لاتے ہو، اسے حویلی لے کر جاؤ اسے وہاں اس کا مقام دلاؤ کہ میں تمہارے بنا بتائے بھی جانتا ہوں کہ تمہارے نکاح کا تایا جان کے علاوہ کسی کو پتہ تک نہیں ہو گا، ایسے میں انعم سے کیے نکاح کی حیثیت تمہارے ذہن و دل میں کیا ہے خوب اندازہ ہے مجھے اور اب یا تو تم اسے آزاد کر دو یا......"

"علی۔" وہ بیٹھے سے دھاڑتا کھڑا ہو گیا۔

"آزاد نہیں کر سکتے تو گناہ کی طرح اسے یہاں چھپا کر رکھنے کی بجائے پرکھوں کی حویلی لے کر جاؤ، حویلی میں اسے اس کا مقام دلواؤ۔" وہ بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

"تم ہوتے کون ہو مجھے یہ سب کرنے کو کہنے والے، میری مرضی میں کچھ بھی کروں، انعم کو کیسے بھی کہاں بھی رکھوں۔" وہ بھڑک اٹھا تھا۔

"انعم میرے لئے مریم ہی کی طرح ہے، خدانخواستہ مریم کو تمہارے نکاح میں دیتا تو جو مطالبات میرے اس وقت ہوتے وہی اب انعم کے حوالے سے ہیں، کیونکہ میں جانتا ہوں مریم نہ تمہاری منگ تھی نہ تمہیں اس سے دلچسپی تھی، اس کی تمہیں دولت چاہیے تھی وہ تمہیں مل گئی، تمہیں دولت لے کر لوٹ جانا چاہیے تھا خوانخواہ میں تم نے انا و غیرت و منگیتر کا قصہ چھیڑا اور زبردستی انعم کو ساتھ لے آئے، انعم کو تم کیا سمجھ کر لائے یا اب تک کیا سمجھتے رہے اس سے مجھے غرض نہیں ہے، میں صرف انعم کا حویلی میں مقام چاہتا ہوں اور وہ تمہیں دینا ہی پڑے گا۔" ان کا انداز بے لچک و دوٹوک تھا۔

"اور اگر میں نہ دوں تو تم کیا کر لو گے۔"

"میں پورے گاؤں میں خود تمہاری شادی کا اعلان کرواؤں گا۔"

"ہاہا اس سے کیا فائدہ ہو گا، کہو تو میں خود وہاں اعلان کروا دوں۔" وہ بے اختیار ہنستے ہوئے بولا تھا۔

مگر اس کی اگلی بات نے اس کی ہنسی کو بریک لگا دیے۔

"ارے میری آگے بات تو سن لیتے، میں کہہ رہا تھا کہ تمہاری شادی کا اعلان کرواؤں گا تو مجھے کوئی فائدہ نہ ہو گا، ہاں تمہاری ساری گرل فرینڈز کے بارے میں گاؤں کی ایک ایک دیوار پر تمہاری اور ان کی تصاویر کے ساتھ تمہارا سب کچا چٹا چسپاں کروا دوں گا، اس سب کا مجھے ضرور فائدہ ہو گا، کہ الیکشن کے وقت سارے ووٹ ملکوں کو مل جائیں گے اور شاہوں کی ساکھ گاؤں میں برباد ہو جائے گی کہ صرف تمہارا نہیں تمہارے بڑے بھائی اور جانباز شاہ کی اصلیت بھی میں سب کے سامنے لاؤں گا۔" اس کا رنگ سفید پڑنے لگا تھا۔

"یہ سب کرنے کی نوبت تو جب آئے گی جب تم زندہ بچو گے۔" وہ خود کو کنٹرول کرتا کف اڑانے لگا۔

"ہاں اندازہ تھا مجھے کہ مجھ پر چوتھا جان لیوا حملہ ضرور ہو گا، تین دفعہ میری خوش قسمتی کام آئی اب کے تمہارا بخت نہ کام دکھا جائے اس لئے یہ

رسک لیا ہی نہیں، تمہارے اور تمہارے پورے خاندان کے نام ایف آئی آر درج کروا آیا ہوں کہ مجھے اور زوہیب شاہ کی فیملی کو کچھ ہوتا ہے تو ذمہ دار ارباز شاہ اور جانباز شاہ ہوں گے۔" وہ دھیمے لہجے میں کہتے اسے دانت کچکچانے پر مجبور کر گئے۔

"اس سب سے تمہیں کیا حاصل ہو گا، کیا میں اس طرح انعم کو حویلی لے جاؤں گا، ابھی تو میں نے انعم پر صرف اس کے گھر والوں سے ملنے پر پابندی لگائی ہے اس پر زندگی کا دائرہ تنگ بھی کر سکتا ہوں ابھی عزت بھی دی ہے، محبت اور توجہ بھی دیتا ہوں، اس سب سے ہٹ کر ظلم کی راہ بھی اپنا سکتا ہوں اس لئے جو کرنا بہت سوچ سمجھ کر کرنا، زیادہ عزت دلانے کے چکر میں کم عزت سے بھی جا سکتے ہو۔" وار تھا کڑا مگر وہ بھی ڈھیٹ واقع ہوا تھا لمحوں میں سنبھل گیا تھا۔

"کون عزت سے جائے گا یہ وقت بتائے گا ارباز، ابھی فی الحال اجازت دو، مگر اتنا یاد رکھنا کہ زوہیب کے مجھ پر بے حد احسانات ہیں، اس کے احسانات تو اتار نہیں سکتا مگر اس کی بھتیجی کے مان، حق عزت اور خوشیوں کی خاطر کسی بھی حد تک جاؤں گا، تم سے میرا صرف ایک مطالبہ ہے کہ تم انعم کو حویلی میں عزت سے رکھو اور ایسا تم نہیں کرو گے، انعم کو میکے آنے جانے نہ دو گے تو مجھے کچھ تو کرنا پڑے گا کہ تمہیں تمہارا حال پر اب نہیں چھوڑوں گا کہ تمہاری باتوں سے تمہارے ارادوں اور نیت کا خوب اندازہ ہو گیا ہے مجھے، اندازہ ہو رہا ہے کہ تم انعم کو کیا سمجھ رہے ہو اس کی تمہاری نگاہ میں کس قدر اہمیت ہے، جبکہ تمہیں انعم کی بے انتہا قدر کرنی چاہیے کہ تم ایک بد کردار بھنورا صفت شخص ہو اور یہ تمہاری خوش قسمتی ہی ہے کہ تمہیں ایک اعلیٰ کردار کی معصوم لڑکی کا ساتھ ملا ہے جبکہ تم اتنی اچھی لڑکی ڈیزرو نہیں کرتے تھے۔" وہ تلخی سے اسے آئینہ دکھا رہے تھے۔

"تم بڑا اسے جانتے ہو، خیر تو ہے نہ کہیں تم......"

"ایک لفظ آگے مت بولنا ارباز، کہ وہ میرے لئے مریم ہی کی طرح پاکیزہ اور قابل عزت و احترام ہے اور میں انعم کو نہیں زوہیب کو جانتا ہوں اور زوہیب کے کردار کی روشنی میں اس کے کردار کو پہچانا ہے جبکہ اس لڑکی کو پہلی دفعہ دیکھا ہی اس دن تھا جب اس کی بد نصیبی عروج پر تھی، یہ اس کی بد نصیبی ہی ہے کہ تم اس کے شوہر ہو، مگر وہ تمہاری بیوی ہے یہ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ عورت کا کردار اسکے حسن سے کہیں زیادہ معنی رکھتا ہے اور تم اعلیٰ کردار و حسن و سیرت کی مالک لڑکی کی ناقدری کر کے ناشکرا پن کر رہے ہو، اللہ نے تمہیں سنبھلنے کا موقع دیا ہے، سنبھل جاؤ برائی سے نکل کر اچھائی کو اپنا لو تو تمہاری دنیا ہی نہیں عاقبت بھی سنور جائے گی، چلتا ہوں سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو، بہت جلد جواب طلبی کرنے آؤں گا، کہ یہ سمجھ لو کہ میری بہن ہے تمہارے گھر اور اس کے حق و بقا کی جنگ اپنی آخری سانس تک لڑوں گا اور اسے اس کا جائز حق و مقام دلائے بغیر مروں گا نہیں، اس لئے مجھے راستے سے ہٹانے کی پلاننگ نہ کرنا کہ اب کے میں نے کہیں کوئی کمی نہیں رکھی ہے، اللہ حافظ۔"

وہ اسے ساکت چھوڑ کر وہاں سے نکلتے چلے گئے تھے اور ان کے جاتے ہی اس کے حیران پریشان وجود میں ہلچل ہوئی تھی اور اس نے اپنے وفادار ملازم کو فون کر کے علی شاہ پر نظر رکھنے اور ان کی سرگرمیاں بتانے کو کہا تھا، کیونکہ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ جو کہہ گئے ہیں کہاں تک درست ہے، وہ کمرے میں آیا تو انعم کو عشاء کی نماز پڑھتے

ہوئے پایا اور وہ اسے دیکھنے لگا، سفید دوپٹے کو اچھی طرح سے سر سے اپنے پورے وجود تک لپیٹے وہ بہت پاکیزہ لگ رہی تھی اور علی شاہ کی باتیں کانوں میں گونجنے لگیں، تو وہ اس کو بغور دیکھنے لگا جو رکوع کی حالت میں تھی، علی شاہ کی باتوں کی تصدیق اس کا ذہن و دل دینے لگے، کہ گزرے سوا تین ماہ میں اس نے اس میں کسی قسم کی کمی محسوس نہیں کی، جن حالات میں اس نے نکاح کیا تھا اس کو یکسر بھلائے نرم لہجے میں ہی مخاطب ہوئی تھی، ملازموں سے بھی نرم رویہ رکھے ہوئی تھی، دوپٹہ بہت سلیقہ سے سر تک لیتی، پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتی، اس کے کپڑوں اور ضروریات کا خیال رکھتی تھی، اس کے آنے کے بعد اسے کبھی کپڑوں، رومال، موزوں کے لئے ملازمہ کو منت منت پر آواز نہیں دینی پڑتی کہ اسے اپنی ہر چیز سلیقے سے ایک جگہ بروقت مل جاتی تھی، وہ اس کو اب سجدہ کرتے دیکھ رہا تھا وہ اس کو نگاہ کے حصار میں لئے بس اس کو سوچ رہا تھا اور ذہن و دل میں صرف اس کی خوبیاں ہی گردش کر رہی تھیں کہ اب تک اس نے اس میں کوئی خامی نہیں پائی تھی کہ اس نے اس سے بحث بھی صرف ایک دفعہ کی تھی اور وہ اس دن کے بارے میں سوچنے لگا شادی کے پندرہ دن بعد کی بات ہے وہ کہیں جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا اور وہ بیڈ پر بیٹھی انگلیاں مروڑتی کچھ سوچتی کچھ کہنے کی چاہ میں کچھ نہ کہنے کی الجھن میں لگی تھی۔

''تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہوا کرے تو بلا جھجک کہہ دیا کرو کیا اٹھارہویں صدی کی ہیروئنوں کی طرح شرماتی رہتی ہو، پڑھی لکھی ہو، سادہ سی بات تو آرام سے کر ہی سکتی ہو۔'' وہ خود پر اسپرے کرتا ہوا بولا تھا اور وہ اپنے ہی خیال سے چونک اٹھی تھی۔

''وہ میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔'' وہ آنکھوں سے نکلتے نمکین پانی کو پوروں پر چنتی اپنی سابقہ پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے بولتی اس کو بری طرح چونکا گئی اور وہ اس کو دیکھنے لگا، اورنج رنگ کے اسٹائلش سوٹ میں سادگی میں بھی وہ غضب ڈھا رہی تھی۔

''بھول جاؤ کہ تمہارا کوئی گھر بھی تھا، کیونکہ اب تمہارا گھر سمجھو تو یہی ہے یہاں سے اب تم کہیں نہیں جا سکتیں۔'' وہ اس کی آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کو دیکھ کر بھی بے حسی سے بولا تھا۔

''میں اس گھر سے کہیں نہیں جانا چاہتی، آپ سے جڑنے والے رشتے کو میں قبول کر چکی ہوں، لیکن شادی ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا نہ کہ انسان شوہر کا ہو کر رہ جائے، میں اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہوں، آپ کے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہوں، یہاں اکیلے میرا دم گھٹتا ہے۔'' وہ رو پڑی تھی کہ وہ شوخ چنچل ہر وقت ہنگامہ مچائے رکھنے والوں میں سی تھی اور یہاں وہ بات کرنے کو ترستی تھی، شور ہنگامہ تو بہت دور کی بات تھی۔

''میں تمہیں اپنے گھر لے جا نہیں سکتا، تمہارے گھر جا نہیں سکتا اور بے فکر رہو دم نہیں گھٹے گا تمہارا کچھ دنوں میں عادی ہو جاؤں گی۔'' وہ بے فکری سے بولا تھا اور اس کی بے حسی اسے ساکت ہی تو کر گئی تھی اور وہ کمرے سے نکلتا کہ وہ حیرانگی سے نکلتی اس کی راہ روک گئی۔

''آپ مجھے کیوں میرے گھر والوں سے ملنے نہیں دے سکتے؟ کیوں مجھے اپنے گھر والوں سے نہیں ملا سکتے؟'' وہ اس کا بازو تھامے بے بسی کی تصویر بنی کھڑی تھی۔

''یہ میری مرضی ہے، اب میں تمہیں اپنے ہر قول و فعل کا جواب دہ نہیں سکتا ہوں۔'' سختی سے کہہ کر اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

''آپ کیوں ایسا کر رہے ہیں؟ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے، پلیز مجھے میرے گھر جانے دیں، مجھے مما بہت یاد آ رہی ہیں، مجھے اپنے چاچو کے پاس جانا ہے، بھا میرے لئے بہت پریشان ہوتے، پلیز مجھے میرے گھر......'' وہ سسکتے ہوئے فریاد کناں تھی۔

''ایک دفعہ کی بات سمجھ نہیں آتی، جب منع کر دیا میں نے تو بحث کرنے کا کیا فائدہ۔'' اس کو پیچھے کی جانب دھکا دے کر سختی سے بولا، وہ لڑکھڑا کر کارپٹ پر جا گری اور وہ دہلیز عبور کر گیا تو وہ اس کی طرف لپکی تھی۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں پلیز مت جائیں، مجھے اکیلے ڈر لگتا ہے۔'' وہ اس کو روکنے کو اس کی شرٹ پیچھے سے دبوچ گئی تھی اور فریاد کناں ہوئی تھی اور اس کے تو سر پر لگی تلوؤں پر بجھی، جارحانہ انداز میں پلٹا اور گھما کر ایک زور دار تھپڑ اس کے گلابی نم رخسار پر جڑ دیا، اس کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

''اکیلے ڈر لگے، یا دم گھٹے زندہ ہو جب تک یہیں رہنا پڑے گا، نہ آئندہ میکے کا نام لوگی، نہ سسرال کا، اب تمہارا جو کچھ بھی ہوں وہ صرف میں ہوں اور میں اپنے انداز سے زندگی گزارنے کا عادی ہوں، تم مجھے اپنے انداز سے مجھے زندگی گزارنے کا کہنے کی بجائے میرے انداز اپناؤ گی کہ میں اب ہر وقت تمہارے آنچل سے بندھ کر نہیں بیٹھا رہوں گا، اس لئے اکیلے رہنے کی عادت ڈالو، ویسے تو میں گھنٹے دو گھنٹے کے لے جا رہا ہوں مگر اب کرنا میرا انتظار، رات کو گھر نہیں آؤ گا۔'' ایک تیز نگاہ اس کے سرخ حیران چہرے پر ڈالتا وہ دھم دھم کرتا وہاں سے نکل گیا تھا اور وہ وہیں بیٹھی روتی چلی گئی تھی رات آٹھ بجے کا گیا وہ صبح کے پانچ بجے نشے میں دھت لوٹا تھا تو وہ وہیں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے بیٹھے ہی سو چکی تھی اور اس کو اتنا ہوش نہ تھا کہ اس کو ہلاتا دیکھتا، کمرے میں جا کر بستر پر ڈھیر ہو گیا تھا، اس کو بے ہوش پا کر ملازمہ نے ہی اسے بہ مشکل کمرے تک پہنچا کر ڈاکٹر کو بلایا تھا کہ وہ بخار میں بری طرح جل رہی تھی اور اسے جگانا بے سود ہی تھا وہ دن کے تین بجے خود ہی جاگا تھا، فریش ہو کر کمرے سے نکلا تھا اور اس کے بارے میں ملازمہ سے پوچھا تھا اور اس نے انعم کی بے ہوشی اور تیز بخار کا بتا دیا تھا اور جس وقت وہ اپنے کمرے سے ملحق دوسرے کمرے میں آیا وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھی، وہ اس کو دیکھنے لگا، رنگت زرد ہو رہی تھی اور انگلیوں کے نشان بے حد واضح تھے، اس کو ذرا سی شرمندگی ہوئی تھی اور وہ دھیمے سے چلتا اس کے سرہانے بیٹھ گیا، ماتھا چھوا تو اندازہ ہوا بخار اب بھی ہے اسے، اس کے سر میں نرمی سے انگلیاں چلاتے ہوئے بہت پیار سے پکارا تھا۔

''انعم!'' وہ ہلی بھی نہیں اور وہ اس کا ہاتھ تھامے سہلانے لگا، کچھ دیر میں وہ کراہی تھی۔

''مما!'' وہ اس پر توجہ دے رہا تھا، ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہا تھا، مما کی گردان پر اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

''نہ جانے کیوں تمہیں اس حالت میں دیکھا نہیں جا رہا مجھ سے، نہ تمہارا رونا برداشت ہوتا ہے، مگر اس سب کے باوجود میرے دل میں کسی قسم کی نرمی پیدا نہ ہوگی، میکے سے تمہارا رابطہ کسی قیمت پر نہ ہوگا، کہ وہاں جا کر ان سے مل کر مجھے اپنی شکست کا احساس ہوگا اور یہ مجھے

برداشت نہیں ہوگا۔" وہ با آواز بلند کہتا اس کے سرہانے سے اٹھ گیا تھا وہ کچھ دنوں میں صحت یاب ہوگئی تھی، وہ اس کا خیال رکھتا، اسے گھمانے بھی لے جاتا مگر اس کا سرد بجھا بجھا انداز اسے غصہ دلانے لگتا، وہ اپنی فطرت سے گر مجبور تھا تو وہ بھی اپنی فطرت سے ہی مجبور تھی کہ وہ سنبھلنے لگتی کہ اپنوں کی یاد اور اس کی بے راہ روی اس کو توڑ کر رکھ دیتی کہ وہ ڈرنک تو اس کے سامنے کرتا ہی تھا، کبھی کبھی اپنی گرل فرینڈز کو بھی لے آتا اور ایسے میں وہ ایسی ہڈی بن جاتا جسے وہ نہ نگل پاتی نہ اگل پاتی۔

وہ گزرے دنوں کو سوچ رہا تھا کہ اس کے جائے نماز تہہ کر کے الماری پر رکھنے سے ہونے والے شور پر حال میں لوٹا، دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں اور اس نے اسے اپنے پاس آنے کا اشارہ کر دیا، وہ دھیمی سی چال چلتی اس کے عین سامنے جا رکی، اس نے حالات سے جتنا اس سے ہو سکا گزارا کر لیا تھا، وہ اسے کافی پر سکون لگی، دوپٹہ کے ہالے میں اس کا گلابی سادہ سا چہرہ اتنا پر نور لگا کہ وہ بے اختیار دیکھے گیا، اس کے سکون میں دراڑیں پڑنے لگیں، رنگت بدلنے لگی اور پلکیں لرزنے لگیں۔

"تم بہت زیادہ حسین ہو یا صرف مجھے ہی لگتی ہو۔" ہاتھ تھام کر سرگوشی کی تھی اور وہ تو کچھ کہنے کی پوزیشن میں ہی نہ تھی، وہ اس پر مہربان ہو رہا تھا اور اسے وحشت ہونے لگی تھی، سیل فون کی گنگناہٹ پر وہ جھنجلایا تھا اور اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔

"علی شاہ آیا تھا آج، وہ چاہتا ہے کہ میں تمہیں تمہارے میکے والوں سے ملنے دوں اور سسرال میں رکھوں۔" فون پر بات کرنے کے بعد وہ تسبیح پڑھتی انعم سے بولا تھا اور وہ اسے دیکھنے لگی تھی اور اس کے دیکھنے پر اس نے علی شاہ کی وضاحت کی تھی کہ وہ اس کی بھابھی کا بھائی ہے اور اس کے چہرے پر اضطراب پھیل گیا۔

"پوچھو گی نہیں کہ میں نے اس سے کیا کہا؟" وہ چلتا ہوا صوفے پر اس کے برابر بیٹھ گیا تھا اور اس کے فاصلے پر ہونے پر دلکشی سے مسکرایا تھا۔

"بیوی ہو تین ماہ سے ساتھ ہو، مگر مجھ سے یوں بھاگتی ہو جیسے میں تمہارا کچھ ہوں ہی نہیں۔" اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھ رخسار پر چٹکی لی تھی، وہ سی کر کے رہ گئی تھی نہ کچھ بولی نہ اسے دیکھا۔

"کیا میں تمہیں اچھا نہیں لگتا، تم کسی اور کو چاہتی ہو۔" گہرے طنز سے بولا تو اسے بہت تڑپ کر اسے دیکھا اور وہ اس کی آنکھوں میں دیکھے گا، تھی بے بسی شکوہ کیا کچھ نہ تھا جھیل سی گہری سیاہ آنکھوں میں، اسے اپنے دل کی حالت زیر وز ہوتی محسوس ہوئی تھی اور وہ واپس پہلے موضوع پر پلٹ گیا تھا۔

"میں آج بھی اپنے فیصلے پر قائم ہوں کہ تمہارا تمہارے میکے سے کوئی رابطہ نہ ہوگا، تمہارا بھائی اور چاچا تمہیں تلاش کرتے پھر رہے تھے، علی گوے میں تھا، کم بخت کو ہوش آیا تو مجھ تک پہنچ گیا، لیکن میرا فیصلہ بدلنے والا نہیں ہے، یہ یاد رکھنا کہ میکے سے رابطے کا سوچو گی یا وہاں سے کوئی آیا اسے دیکھ اپنائیت دکھاؤ گی، ان سے ملو گی تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔" وہ لفظوں کی کاٹ سے اس کا من و دل کاٹتا چلا گیا۔

"فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" وہ اس کے چہرے پر تکلیف دہ تاثرات زیادہ دیر دیکھ نہ سکا تو اس کے برابر سے اٹھ گیا اور سگریٹ سلگا رہا تھا کہ اس کی آنسوؤں میں بھیگی آواز کمرے میں

گونج اٹھی۔

"میں نہیں جانتی کہ یہ سب کس جرم کی سزا ہے، لیکن میں نے اس سزا کو اللہ کی رضا جانا ہے، مما نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ جیسے بھی ہوں میں نے آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے اور میں اپنی ماں کی پرورش ان کے ہر حکم کی لاج رکھوں گی، آپ نے منع کر دیا تو میں نے اپنوں کا نام تک نہ لیا، ان کو دیکھ ان دیکھا بھی کر دوں گی، مجھے صرف آپ کے ساتھ رہنا ہے، آپ نے کیوں نکاح کیا، میری آپ کی نگاہ میں کیا حیثیت ہے، اس سب سے ہٹ کر میں نے نکاح بقائمی ہوش و حواس کیا ہے اور آخری سانس تک اس نکاح کو قائم رکھنا چاہتی ہوں، مجھے اپنوں کی دوری برداشت ہے لیکن آپ سے دوری برداشت نہ ہو گی، آپ کو میری کوئی بات، میرا کوئی عمل و فعل برا لگا ہے تو میں معافی مانگ لیتی ہوں اور وہ جو آپ کی ناراضگی کا سبب ہے کبھی نہیں کروں گی، بس آپ مجھے آزاد کرنے کی بات کبھی مت کیجئے گا، کیونکہ میری مما نے میری دوری تو برداشت کر لی کہ انہوں نے ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی کے ساتھ مجھے رخصت کرنا ہی تھا مگر وہ میری ذلت آمیز واپسی، میری طلاق کو برداشت نہیں کر پائیں گی اور نہ یہ مجھ سے برداشت ہوگا۔" وہ اسے دیکھ رہا تھا جو نگاہ جھکائے رو رہی تھی، اسے اس نے کیا دیا، صرف کھوکھلی چاہت، کھوکھلا خیال، تنہائی اپنوں سے دوری، اس کے باوجود وہ اسی کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

"تم میرے ساتھ کیوں رہنا چاہتی ہو؟ کوئی ایک بھی تو مجھ میں اچھائی نہیں، تمہیں تمہارے اپنوں سے دور کر دیا، زبردستی تمہیں اپنایا ڈرنک میں کرتا ہوں، اسموکنگ میں کرتا ہوں، غیر عورتوں سے تعلقات میرے ہیں، اس سب کے باوجود تم کیوں میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو؟" یہ ایسی الجھن تھی جو اندر اندر پنپ رہی تھی مگر آج زبان سے بھی ادا ہو گئی۔

"شوہر ہیں آپ میرے، نکاح کیسے بھی حالات میں ہوا، حق رکھتے ہیں آپ مجھ پر اور برائیاں صرف آپ میں ہی تو نہیں کتنی برائیاں مجھ میں بھی ہیں اور یہ میری ہی برائی ہے نہ کہ آپ کی بیوی ہو کر بھی میں آپ کو دوسری عورتوں کے پاس جانے سے نہ روک سکی، اچھی بیوی تو وہ ہوتی ہے جو شوہر کو حرام کاری سے بچائے رکھے میں ایسا نہیں کر سکی، تو یہ میری برائی ہے، کمی مجھ میں ہی ہے نہ جو میرا شوہر بھٹکا ہوا ہے، میرے ہوتے ہوئے بھی دوسری عورتوں کے پاس راحت محسوس کرتا ہے۔" وہ اس کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی دماغی حالت پہ شبہ ہو چلا ہو، وہ اس کی ساری برائیوں کا سہرا کتنی آسانی سے اپنے سر لے گئی تھی، جبکہ یہ تمام برائیاں تو اس میں جب بھی موجود تھیں جب وہ اس کی زندگی میں نہ تھی۔

"میری تمام برائیاں آج کی پیداوار نہیں ہیں، ان برائیوں میں، میں کئی برسوں سے مبتلا ہوں۔" گہرے طنز سے بولا تھا۔

"برائی ختم ہو سکتی ہے اور آپ اب تک برائیوں میں مبتلا ہیں تو اس کا سبب میں بھی ہوں، میں نے کب آپ کو ان سب سے روکا اور برائی کرنے والا ہی نہیں برائی دیکھنے والا برائی سے نہ روکنے والا بھی گناہ گار ہوتا ہے اور میں آپ کے گناہ کی برابر کی شریک ہوں، شراب پی نہیں ہے، آپ کو پینے تو دی ہے، غیر مردوں سے تعلقات نہیں رکھے مگر آپ کو تو غیر عورتوں سے تعلقات رکھنے دیئے ہیں، جب آپ گناہ گار ہیں تو میں بھی تو گناہ گار ہوئی۔" وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے سسک رہی تھی جبکہ وہ اس کی باتیں سمجھ

"فضول بکواس، پتہ نہیں کیا کیا بکے جا رہی ہو، پاگل ہو گئی ہو تم۔" اس پر جھنجلاہٹ سوار ہو گئی تھی ادھ پی سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالی تھی اور الماری سے شراب کی بوتل نکالی تھی، منہ سے لگانے کو تھا کہ اس نے آ کر اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر دور اچھال دی تھی۔

"ارباز ڈرنک مت کریں، ڈرنک کرنا حرام ہے۔" وہ اس کی حرکت پر بھی نہیں سنبھلا تھا کہ اس کے الفاظ، وہ علی شاہ پر ہی غصہ تھا اس کی باتیں، اس کو خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔

"تڑاخ! پہلے ہی کہا تھا نہ کہ اپنے انداز مجھے سکھانے کی بجائے، میرے انداز اپنانا اور تم ہوتی کون ہو مجھے ڈرنک کرنے سے روکنے والی؟ تمہاری ہمت بھی کیسے ہوئی بوتل میرے ہاتھ سے چھیننے کی۔" وہ اس پر بری طرح بگڑا تھا۔

"بیوی ہوں میں آپ کی، آپ کی دوست راہنمائی کرنا میرا فرض ہے۔" وہ اب تک اس سب کے ڈر سے ہی تو اسے کسی بھی غلط کام سے نہیں روک پا رہی تھی۔

"او یو شٹ اپ، بیوی نام نہاد بیوی، رتی برابر اہمیت نہیں ہے میری نگاہ میں اس رشتے کی اور تمہاری، مجھ پر زیادہ حق جتانے کی کوشش کی نا صح بننا چاہا تو لمحوں میں سارے حقوق تین لفظوں کی نظر کر دوں گا، اس بھول میں مت رہنا کہ نکاح کیا ہے، عزت دی ہے، میری نگاہ میں تم میں اور ہر دوسری رات میرے ساتھ آنے والی عورت میں کوئی فرق نہیں ہے، یہ دھوکا خود کو نہیں تمہیں دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم ساری عمر دھوکے میں ہی رہنا چاہو گی، کیونکہ یہ بھول ہے تمہاری کہ نام نہاد رشتے کی قید سے آزاد ہو کر تم میری قید سے آزاد ہو پاؤ گی، رشتہ ہے تو ساتھ ہو، رشتہ توڑا تو بھی یہاں سے جا نہیں سکو گی، ایک بس تمہاری موت ہے جو تمہیں میری قید سے آزادی دے سکتی ہے اور جتنی تم مذہبی بنتی ہو اس سب کو دیکھتے ہوئے تو تم حرام موت تو مرنا پسند کرو گی نہیں، نا حرام زندگی گزارنا، اس لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ کر میرے مطابق زندگی گزارتی رہو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔" وہ ایک لمحے میں اس کی ذات اس کا مان اور وقار، اس کی نسوانیت و پندار تنکے سے بھی ہلکا کر گیا، وہ رونا چاہتی تھی، خود پر بیتی ذلت چیخ کر بیان کرنا چاہتی تھی مگر آہیں اور بین اس کے اندر ہی دم توڑتے گئے، وہ ہوا میں معلق ہو گئی تھی، وہ اس کو ذلت کے اندھیرے میں اتارتا واش روم میں گھس گیا تھا، اپنا غصہ پانی میں بہاتا لوٹا تو اسے بے ہوش پایا، غصہ تو بہہ ہی چکا تھا وہ بہت پریشانی سے اس پر جھکا، اٹھا کر بیڈ پر ڈالا۔

نبض چیک کی، اطمینان محسوس کر کے ہوش میں لانے کی تدبیر کی تھی جس میں ناکام ہو کر اس نے ڈاکٹر کو کال ملائی تھی، اس کے آنے تک وہ پریشان ہی رہا تھا کہ اسے کچھ کہنے، ستانے کے بعد اسے ہمیشہ ہی برا لگتا تھا، وہ وقتی طور پر گلٹی فیل کرتا مگر کچھ دیر میں بھول بھال جاتا، ڈاکٹر عائشہ نے پوری توجہ سے اس کا معائنہ کیا تھا اور پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ جو اطلاع دی تھی اور ارباز شاہ کو خوشگوار حیرت میں مبتلا کر گئی، ایسا کچھ اس کی پلاننگ میں نہ تھا مگر وہ کافی مسرت محسوس کر رہا تھا، یہ احساس اس کے لئے بہت خوش کن اور دلفریب تھا کہ وہ باپ بننے والا ہے، یکدم ہی اسے اپنا آپ معتبر لگنے لگا تھا، وہ بے ہوش انعم پر نگاہ جمائے خوش کن احساسات میں گھرا دلکشی سے مسکرا رہا تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔

"سلام بابی سائیں۔" اس کے لہجے میں محسوس کن خوشی و سرشاری تھی، جسے وہ ایک لمحے میں نہ صرف محسوس کر گئے بلکہ اظہار بھی کر دیا تھا۔

"خیر تو ہے نہ پتر، شہر میں بڑا دل لگ گیا ہے، واپسی کا کب تک ارادہ ہے۔" اپنے ہی انداز میں استفسار کیا تھا۔

"آپ کہو تو آج ہی حویلی پہنچ جاؤں۔" وہ ہنسا تھا۔

"ہم تو کب سے راہ دیکھ رہے ہیں ارادہ بنا لیا ہے تو آج ہی چلے آؤ، اس سے اچھی کیا بات ہو گی، لیکن اکیلے آنے کا ارادہ ہے یا اسے بھی ساتھ لاؤ گے؟" معنی خیزی سے پوچھا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے بابی سائیں؟" الٹا سوال کر ڈالا تھا۔

"تمہارے ارادے نیک نہیں لگتے، دال میں کچھ کالا ضرور ہے پتر جی، ہمیں تو لگتا ہے وہ لڑکی کچھ زیادہ ہی بھا گئی ہے، اسے بسانے کا ارادہ بنا لیا ہے تو صاف کہو۔" وہ لگی لپٹی کے بغیر بولے تھے اور وہ زوردار قہقہہ لگا گیا تھا۔

"اگر میں کہوں ہاں تو کیا آپ ایک غیر خاندان کی عورت کو اپنی حویلی میں بسا کر آنے والی نسلوں کا امین بنا لیں گے۔" اس نے باپ کا ارادہ جاننا چاہا تھا۔

"تم نے بسانے کا سوچ لیا ہے تو اپنے ارادے سے ہٹو گے کب، اس لئے میری نہیں اپنی بات کرو، اس بات سے بے فکر رہنا کہ اسے ساتھ لاؤ گے تو جتنی عزت و مان چاؤ گے وہ ہم دیں گے۔" وہ اپنی بات سے اسے بے طرح چونکا گئے۔

"اس عنایت کی وجہ۔" وہ باپ کے طور پر طریقوں، اصولوں سے واقف ہی تھا اس لئے ایسے فیصلے پر حیران ہوا تھا۔

"نکاح کا عمل ہمیں پسند نہیں آیا تھا، مگر جو سبب تم نے بتایا، وہ لڑکی ہمیں عزیز ہو گئی ہے، اس نے میرے پتر کی جان بچائی تھی اور تیری جان کے صدقے میں اسے حویلی میں جگہ ہی نہیں عزت و مان بھی دے دیں گے کہ وہ لڑکی معمولی نہیں ہے کہ اس نے اپنا خون دے کر تیری جان بچائی تھی، تیرے جسم میں میرا ہی نہیں اس عورت کا بھی خون زندگی بن کر گردش کر رہا ہے تو ایسے میں اسے یا اس کے خون کو کیسے اور کیونکر گندہ کہوں۔" وہ اپنے مطلب کے لئے تو جان لے لیتے تھے اس کے آگے تو بیٹے کی مرضی محسوس کرتے ہوئے ایک لڑکی کو بہو کا درجہ دینا بہت ہی آسان ہو گا کہ اس طرح وہ بیٹے کی مخالفت مول لینے سے بھی بچ جائیں گے۔

"قسم سے بابی سائیں جواب نہیں ہے آپ کا، آپ نے سوچا کہ مجھ سے الجھنے سے بہتر میری حمایت حاصل کر لیں کہ اگر میں نے اس عورت کو ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو پیچھے نہیں ہٹوں گا، مان گیا آپ کے دماغ اور اس کی سیاست۔" وہ بیٹے کی بات پر قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

"تم نہیں میں تمہارا باپ ہوں، کسی بھی وجہ سے تمہارے فیصلے کو مان رہا ہوں تو اسی کو غنیمت جانو پتر جی، ورنہ اپنی پر آیا تو ایک بات نہ منوا سکو گے۔"

"چلیں آپ کی بات رہے یا میری، جیت آپ کی ہو یا میری کیا فرق پڑتا ہے، آپ اپنی جگہ اپنے زعم میں خوش میں اپنے طور پر خوش، یہ بتائیے کہ اسے ساتھ لے کر کب آؤں کہ آپ کے لئے خوشخبری ہے۔" وہ اپنے اپنے مطلب کے پجاری اپنے اپنے انداز سے خوش ہو گئے تھے۔

"خوشخبری میں کچھ سمجھا نہیں۔" اس نے چھت پھاڑ قہقہہ لگایا تھا۔

رہے ہیں خیر آپ دادا بننے والے ہیں۔" وہ بیٹے کی بات سن کر بیٹھے سے کھڑے ہو گئے تھے۔

"کیا واقعی میں دادا بننے والا ہوں۔"

"جی میں جھوٹ کیوں بولنے لگا۔" وہ ان کی خوشی محسوس کرتا سرشاری سے بولا تھا۔

"جیتے رہو میرے پتر، آج کیا خوشی کی نوید دی ہے، میں انتظار کر رہا ہوں، میرے پوتے کی ماں کو جلد سے جلد حویلی لے کر پہنچو۔" وہ خوشی سے بولے تھے۔

"جی بابا سائیں آپ حویلی میں چراغاں کریں جشن کا سماں باندھیں، میں اپنی بیوی اور ہونے والے بیٹے کی ماں کو لے کر حویلی آ رہا ہوں۔" وہ انہی کے سے انداز میں بولا تھا تب ہی اسے علی شاہ کا خیال آیا تھا اور پھر اس نے باپ کو اس کے آنے اور اس سے ہوئی تمام گفتگو بتا دی تھی۔

"تم علی شاہ کی فکر چھوڑو اس کو میں ہینڈل کر لوں گا، تم بس بیوی کا خیال رکھو، مجھے اپنا پوتا صحت مند چاہیے۔" وہ باپ کی ہدایت پر مسکراتا ہوا واپس کمرے میں جس لمحے داخل ہوا، اسے ہوش آ گیا تھا اور وہ گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

"انعم اب کیسا فیل کر رہی ہو؟" اس کے قریب بیٹھتے ہوئے نرمی سے پوچھ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔

"ناراض ہو گئی ہو۔" پیار سے استفسار ہوا تھا، بولی تو کچھ نہیں آنسو گرنے لگے۔

"سوری میں نے وہ سب بہت غصہ میں کہہ دیا تھا، علی شاہ کا غصہ بھی میں نے تم پر اتار دیا تھا، ورنہ ایسا نہیں ہے کہ میں تم سے جڑے رشتے کو اہمیت نہیں دیتا، تم میرے لئے بہت اہم ہو گئی ہو، اتنی کہ جب سے تمہیں یہاں لایا ہوں تمہیں اکیلے چھوڑ کر نہ جانے کے سبب حویلی ہی نہیں گیا، تمہاری اداسی، تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں اور ان کے مداوے کا سوچ لیا ہے میں نے۔" وہ نہایت نرمی سے کہتا اس کے آنسو صاف کرنے لگا تھا کہ وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

"انعم پلیز ایسے مت رو میں سچ کہہ رہا ہوں، تم اور تم سے جڑا رشتہ میرے لئے بہت اہم ہے۔" اس نے اس کے آنسو پونچھے تھے، نرمی پیار اور فکر بھی دکھائی تھی مگر اس سب کے باوجود اس وقت کی فکر میٹھا لہجہ اسے کانٹوں پر گھسیٹ لے گیا تھا، وہ اس کے ہاتھ بے دردی سے جھٹکتی بیڈ سے ہی اتر گئی تھی۔

"میں اور مجھ سے جڑا رشتہ اہم ہے آپ کے لئے، مگر کب سے؟ میں کب سے آپ کے لئے اہم ہو گئی ارباز شاہ کب سے؟" وہ چیخ رہی تھی اور وہ اس کے ہذیانی انداز کو انجان انداز سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے ایسے کیوں بی ہیو کر رہی ہو غصہ میں کہہ دیا کہ تم غیر اہم ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم غیر اہم ہو۔" وہ الجھتے ہوئے بولا تھا۔

"میں تھی آپ کے لئے غیر اہم کچھ نہیں سمجھا آپ نے مجھے، اپنی تسکین کے لئے نکاح کیا اور بس اور میں غیر اہم سے ایکدم اہم ہو گئی، اس لئے کہ میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں، میری تذلیل کرتے رہے اور اب ایکدم ہی میں آپ کے لئے اہمیت اختیار کر گئی، آپ کے نزدیک میں یا مجھ سے جڑا رشتہ اور میری اولاد عزیز نہیں ہے آپ کو صرف اپنا مفاد عزیز ہے، آپ کے نزدیک صرف آپ کی خوشی، آپ کی ضرورت، آپ کے فائدے کی اہمت ہے، میں کل بھی غیر اہم تھی، آج بھی غیر اہم ہوں اور آئندہ بھی غیر اہم ہی رہوں گی اور جو شخص مجھے اہمیت نہیں دے سکتا، مجھے عزت نہیں دے سکتا،

جس کی نگاہ میں بیوی اور بازاری عورت میں کوئی فرق نہیں ہے، اس شخص کے بچے کو میں نے دنیا میں نہیں لانا ہے۔" وہ تلخی و غصہ و نفرت سے کہہ رہی تھی وہ اسے خاموشی سے سن رہا تھا مگر اس کی آخری بات اس کے پیروں تلے سے زمین کھسکا گئی۔

"انعم یہ کیا بکواس ہے۔"

"بکواس نہیں کی اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا ہے میں نے آپ کو آپ کے اصولوں اور فیصلوں پر زندگی گزار رہی ہوں اور آگے بھی گزاروں گی، مگر یہ آپ کی بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ آپ کے بچے کو میں دنیا میں لاؤں گی، میں ابارشن......"

"ایسا کرنا تو دور سوچا بھی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" اس کا بازو جکڑ کر سختی سے بولا تھا۔

"آپ جو بھی کر سکتے ہیں کر لیں، ہر طریقہ آزما لیں مگر میرے فیصلے کو بدل نہیں سکیں گے۔" وہ ٹھوس بے لچک لہجے میں بولی تھی اور اس نے جو کہا تھا اس پر عمل کا ارادہ رکھے ہوئے تھی، اس لئے اس کی کچھ بھی نہیں سن رہی تھی، نہ نرمی سے نہ سختی سے اور اس کے سختی سے پیش آنے پر اس نے کچھ کھانا پینا ہی چھوڑ دیا۔

"کیا چاہتی ہو تم آخر، کیسی عورت ہو تم، اپنے بچے کی جان کی دشمن بنی ہوئی ہو۔" اس نے عورت کو گڑگڑاتے، منمناتے قدموں میں گرتے دیکھا تھا، عورت کو سر اٹھائے اپنے کیے فیصلے پر ڈٹے تو پہلی ہی دفعہ دیکھا تھا اور پہلے ہی موڑ پر جیسے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی کہ پہلے عورت کو ہرانا آسان لگتا تھا اب عورت سے جتنا مشکل لگ رہا تھا۔

"جب میری ہی کوئی اہمیت نہیں ہے تو میرے بچے کو کتنی اہمیت ملے گی؟ آپ لوگوں کو ضرورتوں کے تحت چاہتے ہوں گے، لیکن مجھے ضرورت نہیں بننا، عزت چاہیے، اہم ہوں آپ کے لئے تو ہمارے رشتے کو میرے میکے اور سسرال میں منوائیں، عزت دلوائیں، ہمارے رشتے کو معاشرے میں مقام دیں، گناہ کی طرح یہاں کیوں چھپا کر رکھا ہوا ہے، یہ کیسی عزت اور اہمیت دے رہے ہیں مجھے، کہ کل تک غیر اہم تھی ماں بننے والی ہوں تو اہم ہو گئی، ماں نہیں بن سکتی یا بیٹی کی ماں بن گئی تو پھر سے غیر اہم ہو جاؤں گی، کہ آپ کو تو بیٹا اپنا وارث چاہیے ہو گا اور اس کے بعد بھی کیا ثبوت ہے کہ آپ مجھے اور مجھ سے جڑے رشتے کو اہمیت دیں گے، جب میں نے رہنا ہی غیر اہم ہے تو چھوڑ دیجئے مجھے میرے حال پر، لائیں گے نہ خاندانی بیوی اعلیٰ حسب نصب کی تو اسے ہی اتنی عزت بھی دے دیجئے گا کہ وہ آپ کے بچے کو دنیا میں لانے کا سبب بنے، مجھے یہیں اکیلے اپنوں سے دور گلنے سڑنے دیں جو نہیں چاہتی اس کے لئے مجبور نہ کریں۔"

اس نے کل رات سے کچھ نہیں کھایا تھا اور اب شام ڈھلنے والی تھی، وہ نقاہت زدہ لہجے میں کہتے کہتے تھک گئی تو چپ کر گئی اور وہ اس کے لاغر نیم بے ہوش وجود کو اٹھائے ہسپتال دوڑا تھا، ڈاکٹرز کی کوششوں اور اللہ کے کرم سے اس کی جان تو بچ گئی تھی مگر وہ اپنے بچے سے محروم ہو گئی تھی، یہ خبر ایسی تھی کہ ارباز شاہ جو بہت خوش تھا اس کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی اس نے آئی سی یو کے باہر سے دواؤں کے زیر اثر بے سدھ انعم کو بھیگی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پلٹ کر نمبر ڈائل کیا تھا اور جب اسے ہوش آیا اس نے سب سے پہلے اپنی ماں کا چہرہ دیکھا تھا، نورین بیٹی کی زرد رنگت و حالت دیکھ ہی نہ سنبھلی تھیں کہ اس کا رونا تڑپنا ان کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

"مما مجھے اپنے ساتھ لے جائیں، میں نے

اس شخص کے ساتھ نہیں رہنا ہے۔" وہ وہیں سے واپس پلٹ گیا تھا۔

"انعم کی جو بھی حالت بھی ہے نہ تمہیں ہم ذمہ دار ٹھہرائیں گے نہ جواب طلبی کریں گے، صرف ایک اجازت یہ ماں تم سے چاہے گی کہ اسے فی الحال میرے ساتھ بھیج دو کہ جن بھی حالات میں نکاح ہوا، کیسے بھی حالات میں وہ یہاں رہی، اس سب کے باوجود رشتہ جوڑے رکھنا چاہیں گے کہ ہم عزت دار شریف لوگ رشتوں کو ہر قربانی دے کر بھی نبھانے کی کوشش کرتے ہیں، انعم بھی کرے گی لیکن ابھی اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے، اس لئے چند دنوں کے لئے اسے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں اور یہ ایک ماں کی التجا ہے انکار مت کرنا۔" انہوں نے باقاعدہ ارباز کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

"غلطی مجھ سے ہوئی ہے، غصہ میں، میں نے بہت غلط کیا، لیکن یقین کریں میرا، میں نے انعم پر صرف اس ایک ظلم کے کہ اسے آپ سب سے ملنے نہ دیا، ہر طرح سے انعم کا خیال رکھا، خوش رکھنا چاہا مگر ناکام رہا، اسی لئے آپ لوگوں کو بلایا اور آج آپ کی تکلیف سمجھ سکتا ہوں کہ وہ اولاد جس کے آنے کی امید تھی بس، جسے دیکھا تک نہ تھا، جب اس کا جانا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تو آپ نے تو اپنی ارمانوں اور مشکلوں سے پروان چڑھائی اولاد میرے سبب کھو دی تھی، آپ انعم کو لے جا سکتی ہیں، انعم سے ہی نہیں آپ سب سے بھی شرمندہ ہوں، ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا اور انعم اگر میرے ساتھ رہنا چاہے گی تو اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا اور نہیں تو زبردستی نہیں کروں گا اور اس کی مرضی کے مطابق فیصلہ کر دوں گا۔" وہ نورین بیگم اور زوہیب کے ساتھ ساتھ علی شاہ کو بھی حیران کر گیا تھا کہ وہ لوگ اسے بہر حال جانتے نہیں تھے اس کا محض ایک بار ہی بھیانک روپ دیکھا تھا جو ان کی زندگی میں طوفان برپا کر گیا تھا، جبکہ علی تو اسے کافی اچھے سے جانتے تھے مگر اس کا یہ روپ ان کے لئے نیا ہی تھا اور وہ لوگ انعم کو لے کر چلے گئے تھے۔

"تمہارے اصل روپ میں ہی ملے تھے۔"

وہ کہے بغیر رہ نہیں سکے تھے۔

"تم نے کہا تھا کہ میں انعم کی قدر کروں، مگر میں نے تمہاری بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی، انعم کو میں غیر اہم سمجھتا رہا مگر وہ میرے لئے بہت اہم تھی کیونکہ میں اس کے لئے بہت اہم تھا، مگر میں نے اپنی ساری قدر اس کی نگاہ میں کھو دی جو مجھے دیوتاؤں کی طرح چاہتی تھی، جس نے مجھے رب سے دعاؤں میں مانگا تھا۔" وہ اسے حیرانگی سے سن رہے تھے۔

"ایک دفعہ میری انعم نے جان بچائی تھی اور مجھے خون دیتے ہوئے کسی لمحے میں وہ مجھ سے ہار گئی تھی، اس کے بعد وہ مجھ سے کبھی ملی تو نہیں مگر اس نے مجھے دعاؤں میں صبح و شام مانگا اور جب اس کی دعائیں قبول ہوئیں تو وہ اپنی دعاؤں کی قبولیت پر رو پڑی تھی کہ اس نے مجھے مانگا، چاہا ضرور تھا مگر ایسے نہیں جیسے میں اسے ملا، وہ سب اس کے لئے تکلیف دے تھا مگر وہ صبر کر گئی، میرا ساتھ خوشی کا باعث بن نہیں رہا تھا مگر وہ کوشش ضرور کرتی رہی، میری برائیوں کو قبول نہیں کر پا رہی تھی نہ مجھے روک پا رہی تھی اس لئے میری برائیوں کا ذمہ دار خود کو سمجھنے لگی کہ وہ مجھے برا کرنے سے روک نہیں پا رہی تھی اور جس شام تم آئے تھے اس شام میں نے انعم سے وہ سب بھی کہا تھا جو نہ سوچا تھا، نہ کہنا چاہا تھا مگر اس شام وہ سب کہہ گیا جبکہ تمہارے آنے سے پہلے کہنے سے پہلے میں انعم کو حویلی لے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا

وہ مجھ سے بدگمان ہونے کے ساتھ خود سے نفرت محسوس کرنے لگی اور جب اسے پتہ چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے وہ خوش نہیں ہو پائی تھی اور اسے ڈر تھا کہ میں بچے کو اس سے چھین کر اسے کسی اندھیری کوٹھڑی میں قید نہ کر دوں، وہ مجھ سے بہت لڑی، وہ بچہ نہیں چاہتی مجھ سے چیخ چیخ کر کہتی رہی، لیکن میں نے کل اس کی ڈائری پڑھی تھی علی، اس میں اس نے اپنی تمام فیلنگز لکھی ہیں کہ وہ میرے لئے کیا محسوس کرتی ہے، گھر والوں کو کتنا مس کرتی ہے، بچے کا سن وہ کتنی خوش ہے، ایک ایک بات اور وہی پڑھ کر تو مجھے احساس ہوا علی کہ اس کی دعاؤں سے انجانے میں مجھے ہیرا مل گیا مگر میں اس کی قدر نہ کر سکا، وہ صحیح کہتی ہے کہ میں نے اس میں اور بازاری عورت میں کوئی فرق نہیں رکھا، میں نے انعم کی ہی نہیں، رشتوں کی بھی تذلیل کی ہے، اللہ اور اس کے رسول کی سنت کو جھٹلایا ہے، اپنے مفاد کے لئے شریعت کا مذاق بنایا ہے، اپنی نیت سے اپنے جائز عمل کو بھی گندہ کر دیا، میں گندگی میں لتھڑا ناپاک شخص اس قابل تھا ہی نہیں کہ مجھے انعم جیسی پاک باکردار عورت کا ساتھ نصیب ہوتا، میری کوئی نیکی کام آ ہی گئی تھی تو میں یوں تو اس کی ناقدری نہ کرتا، میں نے انعم پر ظلم کیا، اپنے بچے کا قاتل بھی میں ہی ہوں، انعم کو اس نہج پر میں ہی تو لے گیا نہ کہ وہ بچے کے بارے میں اس طرح سوچنے لگی اور میں نے رشتوں اور شریعت کا مذاق بنایا ہے، اللہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا، میں بہت گناہ گار ہوں علی بہت گناہ گار ہوں۔" وہ بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

"گناہ بے شک تم نے کیے ہیں ارباز، لیکن بڑے سے بڑا گناہ بھی اللہ کی رحمت کے آگے بہت چھوٹا ہے، تم صدق دل سے اپنے سابقہ گناہوں کی اللہ سے معافی طلب کرو، اللہ تمہیں معاف کر دے گا۔" علی شاہ نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"اللہ مجھے کیسے معاف کرے گا، علی میں نے شریعت کا مذاق بنایا، جھوٹ بولے، معصوم لڑکیوں کی عزتیں پامال کیں، معصوم لوگوں کی جانیں لیں، میں قاتل، شرابی، زانی اللہ کیسے مجھے معاف کرے گا، ان گناہوں کی تو صرف سزا ملتی ہے اور مجھے بھی معافی نہیں سزا ملے گی۔"

"سزا اور جزا دینے کا اختیار صرف و صرف اللہ رب العزت کے پاس ہے، تمہیں اپنے گناہوں کا احساس ہو گیا ہے یہ بھی اللہ کی رحمت ہے، تم اللہ سے معافی مانگو گے تو اللہ تمہیں معاف کر دے گا کہ تمہارا ہر گناہ اللہ کی رحمت رحم و کرم کے آگے بہت چھوٹا ہے اور تم اس بات سے بے نیاز ہو کر اللہ سے معافی طلب کرو کہ وہ تمہیں، معاف کرے گا یہ نہیں، کہ جب تمہارے تمام عمل درست سمت کی جانب چلیں گے تو خود تمہیں احساس ہو جائے گا کہ اللہ نے تمہیں معاف کر دیا ہے، کیونکہ توبہ کے دروازے کھلے ہیں، توبہ طلب کرو، گناہ کے دروازے بھی کھلے ہیں، ان کی طرف نہ بڑھو، اپنے قول و عمل کو صالح بنا لو اللہ تمہارے سابقہ گناہ معاف کر دے گا، کیونکہ توبہ کرنا، گناہ نہ کرنا نیکی ہے، مگر گناہ سے بچے رہنے کی کوشش کرنا، گناہ سے بچے رہنا اس سے بھی بڑی نیکی ہے کیونکہ نیکی وہ ہوتی ہے جو فنا نہیں ہوتی، چلتی رہتی ہے اور گناہ کو مٹنا ہی ہوتا ہے، تمہارے بھی گناہ مٹ جائیں گے اگر تم نیکی کے راستے پر چل پڑو گے۔" علی شاہ نے اس کے شانے پر دباؤ ڈالا تھا اور اس کے دیکھنے پر مسکرا دیئے تھے۔

"علی گناہگار میں صرف اللہ کا ہی نہیں اس

کے بندوں کا بھی ہوں، تمہارا بھی گناہگار ہوں، معاف کر دو مجھے۔" ارباز نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔

"میں نے تمہیں معاف کیا ارباز، میرا اللہ بھی تمہیں معاف کرے۔" اس کے ہاتھ تھام کر نرمی سے کہا اور اسے سینے سے لگالیا، وہ بچوں کی طرح رو پڑا تھا۔

"جلدی سے جا کر فریش ہو کر آؤ، پھر ظہر کی نماز کے لئے چلیں گے، نیکی کا عمل شروع ہو چکا ہے اور بے فکر رہو کچھ دنوں میں انعم صحت یاب ہو جائے گی تب ہم سب اسے پوری شان اور عزت سے حویلی رخصت کرا کے لے جائیں گے، تمہارا بچہ حویلی میں ہی ہوگا۔" وہ علی شاہ کی آخری بات پر اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"معاف کرنا ارباز، میں تمہاری تبدیلی سے انجان تھا اور تمہیں سبق دینے کو میں نے ہی ڈاکٹر سے کہا تھا کہ وہ سب تم سے کہے، کہ میں تم سے انجان نہ تھا، تمہاری ملازمہ کو میں نے تمہارے گھر کی ایک ایک بات بتانے کے لئے پیسے دیئے تھے، رخشی کے ذریعے تمہاری خوشی، انعم کی مرضی و فیصلہ اس کا ہسپتال جانا سب میرے علم میں تھا اور تمہاری خوشی کے پیش نظر ہی میں نے ڈاکٹر سے وہ سب کہلوایا، میں اس کے لئے تم سے شرمندہ ہوں، معافی چاہتا ہوں، مگر میں نے وہ سب تمہاری آنکھیں کھولنے کے لئے کیا کہ تم نے انعم کو ان کے پیرنٹس سے دور کر کے اچھا نہیں کیا کہ اولاد کی دوری، جیتے جی مردہ تصور کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔"

"ہاں اور یہ بات مجھے سمجھ بھی آگئی کہ میں نے انعم، کو اس کے گھر والوں کے لئے جیتے جی مار دیا اور اپنی اولاد کے مرنے کا سن کر مجھ پر کسی آفت ٹوٹی تھی، مگر مجھے صبر آ ہی جاتا لیکن انعم کی مما، ان کو کیسے صبر آتا کہ ان کی اولاد زندہ تھی بس میں نے ان کے لئے مار دیا تھا، اب میں اپنے ہر گناہ کی معافی مانگوں گا، ہر ظلم کا ازالہ کروں گا اور ہر نعمت کا شکر ادا کروں گا، اللہ کا شکر ہے کہ میری اولاد محفوظ ہے اور میں اپنی اولاد کو ایک اچھی تربیت دوں گا، ایسی پرورش علی کہ وہ گناہ اور نیکی کے فرق کو سمجھنے کے قابل ہو گا گناہ سے بچ کر نیکی پر چلے گا جسے صحیح و غلط کی تمیز ہو گی، میں اپنی اولاد کو نیکی کے راستے پر چلاؤں گا اور اس کے لئے ضروری ہے کہ میں خود نیکی کے راستے پر چلوں، تم میرا انتظار کرو، میں بس کچھ دیر میں وضو کر کے آتا ہوں پھر ساتھ نماز ادا کرنے چلیں گے۔" وہ مسکرا کر حامی بھر گئے اور وہ ایک نئے عزم سے اٹھ گیا تھا، جبکہ اسے نہیں یاد کے پوری زندگی میں اس نے باقاعدگی سے تو دور کبھی جمعہ کی بھی نماز ادا کی ہو گی، وہ بھٹکا ہوا تھا، مگر اب راہ راست پر آ گیا تھا، صراط مستقیم کے راستے پر چلنے کا سوچ چکا تھا، اعمالوں کا دار و مدار نیتوں پر ہوتا ہے اور اس کی نیت صاف ہو چکی تھی، عمل بھی انشاءاللہ بہتر ہو جائے گا۔

☆☆☆

"نہیں بابی سائیں اسے نہیں ماریں، پلیز بابی سائیں۔" قصاب نے جیسے ہی گائے کو پچھاڑ کر اس کے گلے پر چھری رکھی تھی، کافی دیر سے کچھ شوق اور کچھ تجسس سے قصاب کی کاروائی دیکھتا چار سالہ احراز قریب کھڑے باپ کی ٹانگوں سے لپٹا چیخنے لگا تھا اور ارباز شاہ نے مسکراتے ہوئے خوفزدہ روتے ہوئے بیٹے کو گود میں اٹھالیا اور اسے لئے حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگا، احراز کا رونا جوں کا توں جاری و ساری تھا، اپنے کمرے سے دو سالہ ارم کو گود میں اٹھائے بیٹھک کی طرف آتی انعم بیٹے کے رونے کی آواز پر کچھ عجلت میں وہاں پہنچی اور ننھی ارم کو ملازمہ کو پکڑاتی اس تک آئی۔

"ارباز کیا ہوا ہے یہ احراز کیوں رو رہا ہے؟" وہ بیٹے کے لئے فکر مند ہو چکی تھی اور اس نے ایک نظر نجی سنوری انعم کو دیکھا، زیر لب مسکرایا اور تفصیل بتاتا چلا گیا اور اس نے بیٹے کو اس سے لیا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

"احراز چندا خاموش ہو جاؤ، اب بالکل نہیں رونا، مما آپ کو پھر ایک اسٹوری سنائیں گی، آپ روؤ گے تو ناراض ہو جائیں گی۔" اس نے بیٹے کو نہ صرف پچکارا تھا اس کے آنسو بھی پونچھے تھے۔

"بابی سائیں گندے ہیں مما، انہوں نے میری فیورٹ کاؤ کٹ کر دی۔" وہ سسکا تھا۔

"نہیں بیٹا، بابی سائیں گندے نہیں ہیں، وہ کاؤ تو بابی سائیں لائے ہی قربانی کے لئے تھے، آج عید ہے نہ بیٹا، عید الاضحیٰ اس دن تو جانوروں ان کی قربانی کی جاتی ہے۔" وہ نرمی سے بول رہی تھی مگر بیٹے کے چہرے پر ناسمجھی کے تاثرات دیکھ کر وہ مسکرائی اور اسے اس کے لحاظ سے سمجھانے لگی۔

"جی مما میری اسلامیات کی ٹیچر نے بھی بتایا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ سیکری فائز کی یاد میں ہم بقر عید مناتے ہیں، مگر مما یہ بقر عید کیا ہوتی ہے؟" وہ ماں کے سمجھانے پر جوش سے بولتا ذہن میں آنے والے سوال پر الجھ کر رہ گیا اور وہ اسے پیار سے عید الاضحیٰ کے بارے میں بتانے لگی کہ ہم کیوں مناتے ہیں۔

"آپ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ میری کچھ ہیلپ ہی کر دیں، جانتے بھی ہیں کہ آپ کے بیٹے کو سمجھانا کتنا مشکل ہے، ایک سوال جواب دو، دوسرا حاضر۔" بیٹے کے سوالوں کا نرمی سے جواب دیتی، اس کی نگاہیں خود پر محسوس کرتی قدرے خفگی سے بولی تھی اور اس کے ہنسنے پر وہ بیٹے کو اٹھائے کمرے میں چلی گئی تھی، جبکہ وہ سوچ رہا تھا کہ زندگی کی اصل خوشیاں تو چھپی ہی قربانیوں تلے ہیں، کہ قربانی جتنی بڑی ہوتی ہے خوشی بھی اتنی ہی زیادہ حاصل ہوتی ہے، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے اعلیٰ قربانی کا مظاہرہ کر کے مثال قائم کی تھی اللہ کی نگاہ میں تو معتبر ٹھہرے ہی لوگوں کے لئے بھی مثال بن گئے اور ہم بہت بڑی قربانی دینا تو دور چھوٹی چھوٹی قربانیوں سے بھی ڈرتے ہیں، جبکہ یہ جانتے بھی ہیں کہ رات کے بعد سویرے کو آنا ہی ہے، آج کا نیک عمل عاقبت سنوار سکتا ہے تو بد عمل عاقبت بگاڑ بھی سکتا ہے، اس کی زندگی گمراہیوں کا شکار تھی انعم نے صبر سے اپنی خوشیوں کی اپنوں کی قربت کی قربانی دی تھی اور وقت بدل گیا، ارباز شاہ جو برائیوں کو اپنے اندر تک بسائے ہوئے تھا وہ کیسے اچھائیوں میں بدل گئیں، یہ بس اللہ ہی بہتر جانتے ہیں، اس نے نفس کو قربان کر کے نیکی کی طرف قدم بڑھائے اور آج وہ اللہ کے فضل سے کامیاب زندگی گزار رہا تھا، کیونکہ نیکی اس کے اندر تھی، بس نفس کی قربانی کی ضرورت تھی اور جب اس نے یہ قربانی دی زندگی سہل ہوتی گئی۔

وہ گاؤں جہاں لوگ شاہوں کے نام سے بدکتے تھے، خوف کھاتے تھے اب وہی شاہوں کی دریا دلی و نرم مزاجی کا ڈنکا بجاتے ہیں، ارباز شاہ کے در سے کوئی سوالی خالی نہیں جاتا کہ وہ اس راز کو پا گیا ہے کہ دینے والی ذات اللہ کی ہے اور اللہ جب گناہوں کی دلدل میں ڈوبے انسان کو نواز سکتا ہے، معافی قبول کر سکتا ہے تو وہی شخص جس نے اللہ کے در سے سب کچھ پایا ہے اسے کچھ اپنوں کچھ غیروں میں تقسیم کیوں نہیں کر سکتا۔

وہ بانٹنے، تقسیم کرنے، قربانی دینے والوں میں شامل ہو گیا تھا کہ اللہ نے اسے اپنی رحمت سے اس قابل کر دیا تھا، وہ اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں سے لبریز آنکھوں میں آئی تشکر کی نمی صاف کرتا جس دم کمرے میں آیا وہ پیکنگ مکمل کر چکی تھی کہ وہ ہر عید پر لنچ کے بعد حیدر آباد کے لئے نکل جاتے تھے۔

"کیا خیال ہے ہر سال تو تمہارے میکے جاتے ہی ہیں، اس سال نہ جائیں۔" وہ بیگ کی زپ بند کرتی سیدھی ہوئی تھی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی، متوقع ٹکراؤ اور اس کی بات پر جھنجلا کر اسے دیکھا تھا۔

"یار میں تو تم پر کب کا قربان ہو چکا، خوامخواہ میں نگاہوں کے تیر چلا کر مجھے قربان ہو جانے کا اشارہ تو نہ دو۔" شوخی سے بولتا بازو تھام لیا۔

"پلیز ارباز!۔" اس کی نگاہوں کی حدت کی تاب لانا آج بھی اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔

"تھینکس انعم میری زندگی میں آنے میری زندگی سنوارنے کے لئے۔" وہ مسکرایا تھا جواباً وہ بھی حیلے سے مسکرا دی۔

"تھینکس مجھے اپنانے اہمیت دینے کے لئے۔" وہ جھجک کر بولی تھی۔

"آئی لو یو انعم!" اس کو شانوں سے تھامے جذبوں سے چور لہجے میں بولا تھا۔

"یہ کون سا وقت ہے اظہار محبت کے لئے۔" وہ سرخ چہرے کے ساتھ نرمی سے بولی تھی۔

"اوہوں وقت تو وہ اچھا تھا جب تم نے میری جان بچائی تھی، میری زندگی میں آئی تھیں تمہارے خاموش احتجاج کے بعد تمہارے وہ احساسات جو میں نے بائے چانس پڑھ کر محسوس کیے تھے، کچھ تبدیلی تم نے زندگی میں آ کر پیدا کی، کچھ خاموشی نے اور پھر رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی، میرے لئے تو وہ وقت آج بھی بہت قیمتی ہے جب تم میری بن گئی تھیں، تمہاری دعاؤں میں اثر تھا جو میں تمہیں تمہاری چاہت کے مطابق مل گیا اور تمہاری پسند کے مطابق ڈھل بھی گیا، تم اگر میری زندگی میں نہ آتیں تو میں اندھیروں میں ہی بھٹکتا رہتا۔" وہ ماضی میں کھوتا اداسی لئے بولا تھا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ارباز، کہ اندھیروں سے آپ کو روشنی میں، میں نہیں ہمارا اللہ لے کر آیا ہے، یقیناً آپ نے خود کوئی ایک ایسا عمل کیا تھا جو اللہ نے آپ کا قبلہ درست کر دیا، ایسے ہی تو نہیں کہتے نہ کہ صرف بڑا عمل کرنا چاہیے، بلکہ ہر چھوٹے سے چھوٹا عمل کرنا چاہیے کہ قطرہ قطرہ مل کر دریا بنتا ہے اور نیکی تو ہر انسان کے اندر ہوتی ہے بس ادراک نہیں ہوتا اور جنہیں ادراک ہو جاتا ہے وہ درست راہ پا لیتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولی تھی۔

"اوہوں میں مسلمان تھا، اللہ میرے دل میں تھا لیکن، بس اس کا ادراک نہ تھا اور جب مجھے ادراک ہوا، میں مسلمان سے مومن بنا اور احساس ہوا اللہ میرے دل میں ہے اور جس لمحے یہ احساس ادراک کی صورت مجھ پر منکشف ہوا میں نے خود کو پا لیا اور اب میں مسلمان ہی نہیں مومن بھی ہوں، الحمد للہ کہ اللہ مجھے دکھتا آج بھی نہیں ہے، لیکن اللہ مجھے محسوس ہوتا ہے، کہ میں نے صرف برائیوں کو چھوڑ اچھائیوں کو اپنانے کی کوشش کی ہے، کامیاب ہوا ہوں، یا نہیں یہ میرا اللہ جانتا ہے اور میری بس یہی دعا ہے کہ نیکی کا عمل جاری رہے اور میں صرف وہ کام کروں جس

میں میرے رب کی رضا ہے، میں شیطان اور نفس کے بہکاوے میں کبھی نہ آؤں، آمین۔" اس نے بھی ارباز کے ساتھ صدق دل سے آمین کہا تھا اور وہ دونوں نم پلکوں سے مسکرا دیے تھے۔

"اوف عید کے دن بھی آپ نے باتوں میں لگا دیا۔" اس نے ماحول کے بوجھل پن کو دور کرنے کو ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔

"ہاں کہہ تو ٹھیک رہی ہو، یار آج عید کا دن ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے، گلے ملنا چاہیے۔" اس نے جاتی ہوئی انعم کی کلائی تھام یوں کھینچا کہ وہ اس کے سینے سے آ لگی۔

"چھوڑیں ارباز، ابھی میں نے بہت سے کام کرنے ہیں۔" وہ اس کی سرگوشی و قربت پر شپٹائی تھی اور جانے کو پر تولے تھے۔

"پیار سے ضروری بھی کوئی کام ہو سکتا ہے بھلا۔" اس نے سرشاری سے اس کے گرد گھیرا تنگ کیا تھا۔

"فضول بات نہیں، باہر سب انتظار کر رہے ہوں گے اور ہم نے حیدر آباد بھی جانا ہے وقت ضائع نہ کریں۔" وہ اس کے حصار سے نکلنے کی کوشش کے ساتھ منمنائی تھی۔

"او کے ابی جاؤ۔" ایک جسارت کے ساتھ اسے حصار سے آزاد کر دیا تھا۔

"میں کچھ دیر آرام کروں گا، تھکن محسوس کر رہا ہوں کہ تھکا دینے والا سفر منتظر ہے۔"

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے حیدر آباد اتنی بھی دور نہیں ہے بس آپ کو میرے میکے جانے پر ہی اعتراض ہوتا ہے مگر میں نے بھی ہر بار کی طرح آپ کے بہانے کی خاطر میں نہیں لانے۔" وہ بکھرے بال کیچر سے سمیٹتی منہ بنا کر بولی تھی۔

"نافرمان بیوی جہنم میں جائے گی۔"

"آپ بھی جانتے ہیں کہ میں نافرمان نہیں ہوں، آرام کر لیں، جانے سے پہلے اٹھا دوں گی۔" وہ برا منائے بغیر بولی تھی کچھ گھنٹوں بعد وہ دونوں اپنے دونوں بچوں کے ساتھ حیدر آباد کے لئے نکل گئے کہ انعم کے میکے والے اس کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے کہ وہ میکے مہینے میں ایک بار وہ بھی ایک دن کے لئے ہی آتی تھی۔

منیب اور مریم ایک ساتھ سیٹ ہو گئے تھے، منیب نے اپنے تمام سابقہ رویوں کی معافی طلب کر لی تھی، مریم نے صدق دل سے اسے معاف کر دیا تھا ان کی ایک بیٹی تھی، نورین کی شادی علی شاہ سے ہو گئی تھی کیونکہ نوین کا منگیتر شادی کر چکا تھا، نوین ان کے ساتھ خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی تھی، ان کے دو بچے تھے علی شاہ نے اپنے تایا جانباز شاہ کو والدین کا خون معاف کر دیا تھا۔

☆☆☆

"السلام علیکم مما عید مبارک۔" وہ بچوں کی طرح لپک کر والہانہ انداز میں ماں سے لپٹ گئی تھی اور وہ مسکرا دی تھیں۔

"عید مبارک چاچو۔" زوہیب شاہ نے مسکرا کر اسے وش کر کے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

"بی بی تم نے بڑا نہیں ہونا کبھی۔" منیب نے بہن کے مسکراتے شوخ روپ کو دیکھ اسے چھیڑا تھا۔

"چھوڑیں بھی بھا، بڑا ہونے میں کیا رکھا ہے، میں تو بس جیسی ہوں ہمیشہ ہی ایسی رہوں گی اور آپ جلدی سے میری عیدی نکالیں۔" وہ اپنے مخصوص شوخ لہجے میں بولی تھی اور اس نے منیب اور زوہیب سے بہت لڑ جھگڑ کر عیدی لی تھی۔

"مما کچھ کھانے کو دے دیں، سچ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔" وہ نورین کے کاندھے پر سر ٹکاتے ہوئے لاڈ سے بولی تھی۔

"بھوک، مما نکلتے ہوئے کھانا کھایا تھا اور راستے بھر کچھ نہ کچھ کھاتی ہی رہی تھی لیکن بی بیو یہاں آ کر ایسے کرتی ہے جیسے میں کھانے کو ہی نہیں دیتا۔" اس نے سرخ فراک ٹراؤزر پہنا ہوا تھا جس پر سیاہ رنگ کی کڑھائی کے ساتھ بیٹس لگے ہوئے تھے، لائٹ سے میک اپ میں وہ کافی دیدہ زیب لگ رہی تھی، اسے مصنوعی خفگی سے گھور کر بولا تھا۔

"کھانے کو تو آپ مجھے واقعی کچھ نہیں دیتے میں آپ کو دیتی ہوں مما یہ آپ کے داماد صاحب ہل کر پانی نہیں پیتے، سائیڈ ٹیبل تک سے پانی میں اٹھا کر دیتی ہوں۔" وہ کہہ رہی تھی مگر نورین کے گھورنے پر برے برے منہ بنا کر چپ کر گئی تھی۔

"آپ تو لگتا ہے، میاں میری شکایتیں لگانے آتے ہیں۔" چپ رہ ہی کب سکتی تھی منہ بنا کر بولی تھی۔

"ہاں تو شوہر کا خیال نہیں رکھو گی تو وہ شکایت بھی نہیں کرے گا۔" زوہیب نے اسے چھیڑا تھا۔

"خیال کی تو رہنے ہی دیں چاچو، جتنا خیال میں ان کا رکھتی ہوں نہ کوئی نہیں رکھ سکتا۔" اس نے فرضی کالر کھڑے کیے تھے۔

"ارباز بھائی آپ اسے رہنے دیں یہ شروع سے ہی تھوڑی خوش فہم واقع ہوئی ہے۔" لائبہ کیوں اسے چھیڑنے میں پیچھے رہتی۔

"چاچو آپ اسے رہنے دیں یہ شروع سے ہی مجھ سے جلتی ہے۔" وہ اسی کے سے انداز میں بولی تھی۔

"لو میں اور تم سے جلوں گی، تم سے زیادہ خوبصورت اور عقل مند ہوں۔" وہ سر جھٹک کر بولی تھی اور ارم بھی ان دونوں کی نوک جھونک میں شامل ہو گئی تھی، بچے آتے ہی لان میں کھیلنے چلے گئے تھے۔

"یہ بوا اب تک کیوں نہیں آئی، میں اتنی دور سے آ گئی اور وہ......" وہ نوین کو دیکھ چپ کرتی اٹھ کر اس لپٹ گئی۔

"عید مبارک بڑی پیاری لگ رہی ہو۔" انعم پھپھو کی تعریف پر مسکرا دی تھی، گھر کا ہر فرد موجود تھا اور وہ آپس میں مل بیٹھے، عید کی خوشیاں کشید کر رہے ہیں، تمام بچوں نے الگ محفل جمائی ہوئی تھی، اپنوں کا ساتھ ہو تو خوشیاں دوبالا ہو جاتی ہیں، ان سب نے غم بھی اکٹھے دیکھے تھے، خوشیاں بھی ساتھ کشید کر رہے تھے کہ اسی کا نام زندگی ہے۔

زندگی کی راہوں میں
قربانی کی بانہوں میں
کچھ پل چھپے ہیں خوشیوں کے
ہماری دعاؤں میں
وقت آتا ہے اچھا یہ عین ممکن ہے
گزار دیکھو وقت بندگی کی چھاؤں میں

ئے آخری جزیرہ ہو

ام مریم

چوبیسویں قسط کا خلاصہ

گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں مگر معاذ ہنوز اس منصوبے سے لاعلم ہے، البتہ پرنیاں کا سخت رویہ ضرور سے اب غصہ دلانے لگتا ہے، اسی غصے میں معاذ شادی سے دو دن پہلے جس دن پرنیاں نے ہمیشہ کے لئے ہاسٹل چھوڑ کر شاہ ہاؤس میں آنا ہے اسے لے کر ہوٹل میں آجاتا ہے، وہ پرنیاں کو یہ بتا کر سراسیمہ کر دیتا ہے کہ وہ اسے رخصت کرا لایا ہے۔

معاذ کی من مانی کا مظاہرہ پرنیاں کو اس سے شدید برگشتہ کرنے کا سبب بنتا ہے، وہ اس سے بے زاری کے ساتھ نفرت بھی محسوس کرتی ہے، اس کے برعکس معاذ بے حد خوش اور مطمئن ہے، مسز آفریدی کی کوشش سے ہی ژالے معاذ کی شادی میں شریک ہونے کو شاہ ہاؤس آتی ہے، تو زینب اسے دیکھ کر بے حد ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔

اب آپ آگے پڑھیے

پچیسویں قسط

معاذ نے جب اپنے کمرے میں قدم رکھا رات نصف سے تجاوز کر چکی تھی، مما نے اسے بے حد بھاری سیٹ دیا تھا پرنیاں کی رونمائی کے لئے، وہ اندر آیا تو ائیر فرشنز کی دلفریب مہک کے ساتھ گلابوں کی خوشبو نے بھی اسے اپنے حصار میں جکڑ لیا تھا، اپنی موجودگی میں معاذ نے بیڈ روم کی صرف گلاب کے پھولوں سے آرائش کرائی تھی، وہ اس رات کو حسین تر بنا دیا چاہتا تھا اور یادگار بھی، وہ جان گیا تھا پرنیاں اس کی من مانی کے بعد سے خفا ہے اس سے اسے خود بھی احساس ہو گیا تھا، جبھی اس نے اسے منانے کے ہزار ہا طریقے سوچ لئے تھے، وہ اس سے مزید خفا رہ ہی نہیں سکتی تھی، اسے یقین تھا، مگر پہلا دھچکا اسے پرنیاں کو بیڈ پہ موجود نہ پا کر لگا تھا، دروازہ کھلنے کی آواز پہ اس نے چونکتے ہوئے گردن موڑی تو واش روم سے باہر آئی، پرنیاں کو دیکھ کر اس کا ارمانوں سے لبریز دل بجھ کر رہ گیا تھا، وہ اتنا حسین روپ اس کی ستائش پائے بغیر ختم کر چکی تھی، وہ نہا کر نکلی تھی اور اس وقت گلابی لبادے میں لپٹی سرسراتی رات کا ایک حسین راز لگ رہی تھی، اس کے لمبے سیدھے بال اس کی پشت کی بجائے سینے پہ گر رہے تھے، اس کو دیکھ کر بھی خوبصورتی سے نظر انداز کرتی وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے آگے جا کھڑی ہوئی بال سلجھائے اس کی کلائیوں میں پڑی سونے کی چوڑیاں جلترنگ بجانے لگیں تو معاذ چونکا تھا۔

''اتنی جلدی لباس تبدیل کر لیا، میرا انتظار تو کرتیں آپ۔'' معاذ کو غصہ تو آیا تھا مگر وہ اس سے تلخی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا، جبھی رسان سے کہا تھا۔

''کیوں انتظار کر لیتی، تاکہ تم جیسے عیاش کو عیاشی کا ایک اور موقع مل سکتا؟'' وہ اتنی نفرت اور اتنی شدت سے چلائی تھی کہ گردن کی رگیں پھول کر رہ گئیں، معاذ کے اعصاب کو اس کے الفاظ اور انداز سے دھچکا لگا تھا، اس نے چونک کر حیرانی سے اسے دیکھا، پرنیاں کے ہر انداز سے درشتی ہی نہیں نفرت و حقارت بھی ٹپک رہی تھی، ایک لمحے کو معاذ کو اپنے اعصاب کھنچتے ہوئے محسوس ہوئے تھے اس کی اس درجہ بدتمیزی پہ مگر اس نے بروقت خود کو کنٹرول کر لیا، اس کا قصور تو بہر حال تھا، اس نے وقتی اشتعال اور غصے میں آ کر اس کے جذبات کو مجروح کیا تھا، پرنیاں کی بھیگی آنکھوں میں جو کرب تھا، جو تڑپ تھی اس نے معاذ کو اضطراب سے دوچار کر دیا تھا، کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اپنی عزیز ترین ہستی کو رنجیدہ آزردہ دیکھنا یہ معاذ نے اسی وقت جانا تھا۔

''آئی ایم ساری پرنیاں! مجھے احساس ہے کہ تم ہرٹ......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی کہ معاذ نے جیسے ہی پرنیاں کا ہاتھ تھاما تھا وہ بری طرح سے بپھر اٹھی تھی اور اگلے لمحے وہ اپنا ہاتھ تنفر زدہ انداز میں چھڑوا کے فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی۔

''خبردار! ہاتھ مت لگانا مجھے سمجھے تم، میں تمہیں بتانا ضروری سمجھتی ہوں معاذ حسن کہ میں تمہارے ہاتھوں خوشی خوشی پامال ہونے والی بدکردار عورتوں میں شمار نہیں ہوتی، تمہاری زور زبردستی اک بار ہی چل گئی ہے، یاد رکھنا اگر تم نے دوبارہ مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا تو میں اسی وقت خود کو ختم کر لوں گی۔''
تنبیہی انداز میں انگلی اٹھا کر اسے باور کراتی ہوئی، وہ نفرت اور تلخی کے کس مقام پہ تھی وہ نہیں جان سکتا تھا، اس کا لہجہ اس کا انداز اور ہر انداز سے ٹپکتی نفرت اسے گنگ کرنے کو کافی تھی، یہ نفرت و بدگمانی کا ہی شدید احساس تھا کہ وہ بہت تضحیک آمیز انداز میں اسے پہلی بار آپ کی بجائے تم کہہ کر پکار رہی تھی، جس میں اپنائیت یا شناسائیت کا ملنا تو دور کی بات تذلیل اور سبکی کا غلبہ تھا، اس کے لہجے کی بے خوفی اسے

گویا ہر انجام سے بے نیاز کر چکی تھی، معاذ کی پیشانی پہ اتنی ذلت کے بعد پسینہ پھوٹ نکلا تھا، کہاں کا ظرف حوصلہ ضبط اور شرمندگی یہ سارے جذبے پرنیاں کی جانب سے زہر میں بجھے نشتروں پہ بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو گئے، اسے جیسے کسی نے یکلخت اٹھا کر جلتے الاؤ میں پھینک دیا تھا، سب کچھ اسی بھڑکتی آگ میں جل گیا اس کے اپنے وجود سمیت غصے اور توہین کی شدید لہر اس کے اندر سے اٹھی تھی اور اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گئی، اس نے بہت جارحانہ انداز میں پرنیاں کی کلائی پکڑی تھی اور جھٹکے سے رخ اپنی جانب پھیرا۔

''تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے پرنیاں کہ تم کیا بکواس کر رہی ہو۔'' معاذ کی بھاپ چھوڑتے چہرے پہ بے پناہ خفگی، ناگواری اور فہمائش تھی، پرنیاں نے جواباً اپنی جلتی ہوئی آنکھوں میں نفرت سمو کر اسے دیکھا تھا پھر اسی زہر بھرے لہجے میں چلا کر بولی تھی۔

''تم کیا سمجھتے ہو، میں ڈر جاؤں گی تم سے اور کچھ نہیں کہہ سکوں گی، میں تمہارے کرتوت سب کو بتاؤں گی کہ تم درحقیقت کیا ہو۔''

''کیا ہوں میں؟'' معاذ نے اپنے طیش کو دبا کر اندر اٹھتی تند و تیز لہر کو اڈنے سے روکتے ہوئے بھنچے ہوئے لہجے میں کہا، کوئی نوک دار شے تھی جو ہر لمحہ اسے کاٹ رہی تھی، اس کی اس درجہ غلط فہمی پہ معاذ کے وجود پہ ایک سکوت سا طاری ہو رہا تھا، وہ کرب آمیز انداز میں اس کے خوبصورت چہرے پر پھیلی نفرت اور تلخی کو دیکھتا رہا تھا۔

''بدکردار ہو تم، ہوس پرست ہو تم، جانے کتنی لڑکیوں کی عزتوں کو......'' پرنیاں کی بات ادھوری رہ گئی معاذ کا ہاتھ فضا میں گھوما تھا اور بھرپور تھپڑ کی صورت یکے بعد دیگرے اس کے چہرے پہ برسا، اس کی آنکھوں سے ہی نہیں چہرے سے بھی گویا لہو ٹپکنے لگا تھا۔

''میں لعنت بھیجتا ہوں تمہاری سوچ سمیت تم پہ بھی، میری بلا سے تم جو مرضی سمجھو، میں جیسا بھی ہوں، تمہیں ہرگز غرض نہیں ہونی چاہیے، سمجھ آئی تمہیں؟'' معاذ کا لہجہ و انداز انتہائی جارحانہ تھا، اس کی برہمی کو برداشت کرتے وہ بھی بالآخر بپھر سا گیا تھا اور ہر مصلحت و احتیاط بالائے طاق رکھ دی تھی۔

''میں ہوس پرست ہوں یا نہیں مگر آج کے بعد کم از کم تمہارے نزدیک نہیں آؤں گا۔'' اتنی تذلیل کا احساس اسے پاگل کرنے کو کافی تھا، پرنیاں ایکدم ساکت ہو گئی تھی، معاذ کے اٹھے ہوئے ہاتھ نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا، اس کے اعصاب سن ہوئے تھے، معاذ اس پہ قہر بھری نگاہ ڈالتا پاؤں کی ٹھوکر سے راستے میں آئی ہر شے کو اڑاتا کمرے سے باہر چلا گیا، پرنیاں اس کے بعد بھی بہت دیر تک یونہی ساکن و سامت بیٹھی رہی تھی، تین دن اس نے ہر لمحہ اس ایک لمحے کو سوچا تھا، جب وہ اپنے دل کی آگ اسی کے وجود میں منتقل کرتی اور خود پرسکون ہو جاتی، وہ لمحہ آیا تھا اس نے معاذ کو اپنی خواہش کے مطابق نفرت سے دھتکارا بھی تھا، مگر وہ پرسکون نہیں ہو سکی تھی، بلکہ وہ اس صدمے اور شاک سے نکلی تو پتہ نہیں کس زیاں کے احساس سمیت بلک بلک کر روتی چلی گئی تھی، باہر بھیگتی رات کچھ اور گہری تاریک اور ہولناک ہوئی تھی۔

☆☆☆

جب کانچ اٹھانے پڑ جائیں تو ہاتھ ہمارا لے جانا
جب سمجھ کہ کوئی ساتھ نہیں تم ساتھ ہمارا لے جانا

جب دیکھو کہ تم تنہا ہو اور رستے ہیں دشوار بہت
تب ہم کو اپنا کہہ دینا بے باک سہارا لے جانا
جو بازی بھی تم جیتو گے جو منزل بھی تم پاؤ گے
ہم پاس تمہارے ہوں نہ ہوں احساس ہمارا لے جانا
اگر باری ہماری آ جائے تم پاس ہمارے آ جانا
بس اک مسکان ہمیں دینا پھر جان بھی چاہے لے جانا

جہان کے سر میں شدید درد تھی، اس کی ہمیشہ سے عادت تھی جب وہ زیادہ تھکا ہوتا سو نہیں پاتا تھا، آج بھی دن بھر کی روزمرہ سے ہٹی ہوئی روٹین کی بھاگ دوڑ نے اسے تھکا کر چور کر دیا تھا، وہ سونے کو لیٹا اور نیند کو ترس کر بستر چھوڑ دیا، چائے بنانے کے خیال سے اپنے کمرے سے کچن کی سمت آتے وہ زینب کے کمرے کے آگے سے گزرتے ٹھٹک کر تھم گیا تھا، دروازہ ادھ کھلا تھا، لائیٹ آن تھی جہان کے ٹھٹکنے کی وجہ زینب کی سسکیاں تھیں گھٹی گھٹی بے قرار سسکیاں، جو جہان کا دل ایسے بھینچ گئیں، جیسے کسی نے جوتے سے مسل کر رکھ دیا ہو، قدم آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے تھے اور اندر جانے سے وہ حد درجہ گریزاں تھا، کچھ سوچ کر اس نے نیم وا دروازے پہ دستک دی تھی، رات کے اس پہر سناٹے میں یہ مدھم سی آواز بھی پوری طرح گونجی تھی، زینب کی سسکیاں تھم سی گئیں، ماحول پہ پھر سے سکوت طاری ہو گیا تھا، اگلے چند لمحوں میں جہان نے دروازے کی اوٹ میں اس کی جھلک دیکھی تھی، ڈل گولڈن اور پرپل کے بے حد خوبصورت امتزاج کے سوٹ میں اس کا لچکتی شاخ جیسا دلربا سراپا اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے روبرو تھا، وہ اپنا چہرا غالباً صاف کر چکی تھی مگر اس کے باوجود آنسوؤں کی نمی کا احساس غالب تھا۔

"جی فرمایئے؟" اسے روبرو پا کے وہ پہلے حیران ہوئی تھی پھر خشک لہجے میں بولی۔

"کیوں رو رہی تھیں تم؟" جہان کا لہجہ مضطرب سا تھا۔

"آپ سے مطلب؟ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" وہ زور سے پھنکاری، اس کا لہجہ ہی نہیں اس دخل در معقولات پہ آنکھیں بھی دہک اٹھی تھیں۔

"زینب آپ پریشان ہیں، کیا مسئلہ ہے پلیز بتائیں مجھے؟" اس کی بدتمیزی کا برا مانے بغیر وہ اسی رسان اور نرمی سے بولا تھا جو زینب کے لئے کبھی اس نے مخصوص کر رکھی تھی۔

زینب نے جھنجھلا کر اور آنکھوں میں غصے کا تاثر سمو کر اسے دیکھا مگر جہان کے چہرے پہ موجود اپنائیت اور نرمی پہ اس کے ذہن کا تناؤ قدرے کم ہوا تھا۔

"تیمور نہیں آئے بے! سب لوگ مجھے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے، میں بہت اپ سیٹ ہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں۔" وہ غصہ بھلائے اس کے آگے اپنا مسئلہ بیان کر رہی تھی پہلے کی طرح جیسے ہمیشہ کیا کرتی تھی، جہان نے گہرا سانس بھر کے اسے دیکھا۔

"کوئی تو وجہ ہو گی نا، تم خود کال کر لیتی اسے۔"

"کی تھی کال، جب میں آنے کا کہتی ہوں وہ خفا ہونے لگتے ہیں۔" وہ روہانسی ہو کر بتانے لگی، جہان نے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔

"تم پریشان مت ہو، میں کل اسے خود کہوں گا، آ جائے گا ریلیکس، اب سو جاؤ رات بہت ہو گئی ہے۔" زینب نے مشکور نظروں سے اسے دیکھا پھر بے چارگی سے بولی تھی۔

"میرے سر میں بہت درد ہے بے! لالے کو پوچھ کر کوئی ٹیبلٹ لے دیں گے؟"

"میرے پاس ٹیبلٹ ہے، میں لا دیتا ہوں۔" جہان وہیں سے پلٹ گیا، اپنے کمرے میں آ کر پین کلر نکالی تھیں پھر کچن میں کھڑا ہو کر چائے تیار کی، اپنا مگ وہیں چھوڑ دیا، زینب کے لئے دوا کے ساتھ پانی کا گلاس اور چائے لے کر وہ رات کے اس پہر دوبارہ اس کے دروازے پہ آیا تو دل میں اس خفگی کا احساس تک باقی نہیں تھا جو اسے آج دن میں اس سے اس وقت محسوس ہوئی تھی وہ جب وہ بہت سرد اور نخوت زدہ انداز میں ژالے کے سامنے خود کو اس سے برتر ثابت کر رہی تھی کہ وہ اگر جہان کو نہ ٹھکراتی تو جہان کبھی ژالے کا نصیب نہیں بن سکتا تھا، ژالے کی آنکھوں میں صرف حیرانی نہیں، تاسف رنج اور اذیت کے کتنے رنگ تھے، یہ محض اتفاق تھا کہ وہ دونوں اس کے کمرے کی اس عقبی کھڑکی کے نیچے کھڑی تھیں جو لان میں کھلتی تھی، جانے زینب نے اسے کیسے وہاں گھیر لیا تھا اور اپنی عادت و فطرت کے مطابق اس پہ اپنی برتری ثابت کرنا چاہ رہی تھی، جہان کو اسی پل اس پہ اتنا ہی غصہ آیا کہ جی چاہا تھا جا کے دو تھپڑ مار کے اس کا دماغ ٹھکانے پہ لے آئے مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا تو وجہ ژالے آفریدی ہی تھی، ژالے سے نفرت کے احساس نے اسے ایک انتہائی ناجائز اور غلط کام کو ہونے دیا تھا اور بے حسی کا لبادہ اوڑھ کر پیچھے ہٹ گیا تھا تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ اسے زینب کی یہ حرکت اچھی لگی تھی، وہ اسے سرزنش کرنا چاہتا تھا مگر اکیلے میں، یہ اب جو کچھ اس نے سنا تھا زینب کی پریشانی جس انداز میں اس پہ آشکار ہوئی تھی، جہان نہ بھی کچھ کہتا، وہ اپنا کیا خود ساتھ ساتھ بھگت رہی تھی مگر بات نہ سمجھنے کی تھی اور دکھ بھی اسی بات کا ہے کہ ہم اتنی تیزی سے عاقبت نااندیش ہوتے جا رہے ہیں کہ ہماری بے حسی ہمیں یہ سوچنے کا بھی موقع نہیں دیتی ہم نے کسی کے ساتھ کہاں کیا غلط کیا، یا اگر ہمارے ساتھ کچھ غلط ہو رہا ہے تو اس میں ہمارے اپنے اعمال کا کتنا عمل دخل ہے، ذاتی اعمال پہ نگاہ کیے بغیر ہم اپنے اوپر آنے والی تکلیف پہ واویلا شروع کر دیتے ہیں اور نصیب کو دوش دینا اپنا فرض اولین سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ دیکھا جائے تو نصیب لکھنے والی تو رب تعالیٰ سبحانہ کی ذات مبارکہ ہے اور رب کسی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے نا انصافی۔

"اندر آ جائیں بے! میں بہت تھک گئی ہوں، بار بار اٹھا نہیں جا رہا۔"

جہان کی دستک کے جواب میں زینب کی تھکی ہوئی بھیگی مدھم آواز ابھری تھی، جہان قدرے تذبذب کا شکار ہوتا کچھ ثانیوں کو وہیں کھڑا رہ گیا تھا، پھر گہرا سانس بھر کے آہستگی سے اندر قدم رکھ دیئے، زینب نڈھال سی لیٹی ہوئی تھی، گال یوں نم تھے جیسے جہان کے چلے جانے کے بعد پھر روئی ہو۔

"تھینکس بے مجھے اس وقت چائے کی بہت طلب محسوس ہو رہی تھی، آپ واقعی بہت اچھے ہیں بے ہمیشہ بنا کہے میری ہر ضرورت کو آج بھی جان لیتے ہیں۔" اسے دیکھ کر وہ تکیے کے سہارے نیم دراز ہو گئی تھی اور جو کچھ کہا تھا اس نے جہان کو ساکن ہی نہیں کیا، اس کی روح میں زیاں اور وحشت کے ایسے احساس کو جنم دیا تھا جسے شمار میں لانا عبث تھا، زینب نے پہلے دوا پانی کے ساتھ لی تھی پھر چائے کا مگ اٹھا لیا۔

"شادی ایک جوا ہی ہوتی ہے اور جو یہ جوا ہار جائے اس کی ساری زندگی داؤ پہ لگ جایا کرتی ہے نا

ہے؟'' جہان نے دیکھا اس کی آنکھوں میں سرخیاں اتر رہی تھیں، وہ مضطرب سا ہو گیا۔

''اتنا مت سوچوں زینب، لیٹ جاؤ، تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔'' جہان نے پہلے اس کے ہاتھ سے مگ لے کر سائیڈ پہ رکھا تھا پھر اسے شانوں سے تھام کر زبردستی لٹانے کے بعد کمبل اس پہ برابر کر دیا، زینب نے ایک نظر اسے دیکھا پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

(تم کتنے کیئرنگ ہو جے کتنے خاص اور انمول، میں نے خود اپنے پیروں پہ کلہاڑی مار دی تھی)۔

اس کی بند آنکھیں آنسو لٹا رہی تھیں، جہان بہت اضمحلال کی کیفیت میں لائٹ بند کرتا کمرے سے نکلا تو اسے لگا تھا جیسے کوئی سایہ بہت تیزی سے راہداری میں گم ہو گیا ہو، وہ اتنا ڈسٹرب تھا کہ اس اہم بات پہ اتنی توجہ صرف نہیں کر سکا، اپنے کمرے میں آ کر بھی وہ مضطرب سا ٹہلتا رہا تھا، پھر سگریٹ سلگاتا ہوا ٹیرس پہ آ نکلا، کش لیتے دھواں بکھیرتے وہ موسم کی شدت کو اپنے وجود پہ سہتا رہا تھا، ختم ہوتی سگریٹ کو پھینک کر جوتے سے مسلتے اس کی نگاہ یونہی سرسری انداز میں اندھیرے میں ڈوبے لان کی جانب اٹھ گئی تھی اگلے لمحے وہ ٹھٹک کر اسی زاویے پہ ساکن کھڑا رہ گیا، بلیک لباس اور اپنے ڈیل ڈول کی بنا پر اسے معاذ کو پہچاننے میں ایک لمحہ کافی تھا، ششدر تو وہ اس کی اس وقت وہاں موجودگی سے ہوا تھا، لان میں ٹہلتا ہوا معاذ حسن اسے کسی انداز سے بھی نارمل محسوس نہیں ہوا تھا، جہان سرعت سے پلٹا اور اگلے چند لمحوں میں وہ اس کے روبرو تھا، معاذ اسے دیکھ کر پہلے چونکا تھا پھر بے نیاز بن گیا۔

''کیا کر رہے ہو یہاں تم؟'' جہان نے اسے گھورا تھا۔

''چہل قدمی، ہوا خوری۔'' معاذ کا چہرا تاریکی میں تھا پھر بھی وہ اس کے نقوش سے جتنا اندازہ کر پایا تھا جان گیا تھا کہ وہ خود کو چھپانے کی کوشش میں ناکام ہے اور ڈسٹرب ہے۔

''مجھے ٹالو نہیں معاذ، تم اپنے کمرے میں گئے تھے نا، یہاں کیسے......؟''

''خدائی فوجدار...... یہاں سے جاؤ، ہر وقت ہر کسی کی اتنی جستجو میں نہ رہا کرو۔'' معاذ بدمزگی سے بولا مگر جہان نے ہرگز اس کی بات پہ کان نہیں دھرا تھا۔

''میں تمہیں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں معاذ سوائے اس کے کہ اپنے کمرے میں، میں جاؤ۔''

''میرا تمہارے لئے یہی مشورہ ہے، جاؤ جان چھوڑو میری۔'' معاذ نے صرف کہا نہیں تھا غصے میں اسے زور سے پیچھے کی جانب دھکا بھی دے ڈالا، جہان اچھا خاصا لڑکھڑا کر بامشکل سنبھلا تھا، جہان نے دیکھا اس کے سرخ و سفید چہرے پہ خشونت و برہمی مترشح تھی، بادامی آنکھیں خون چھلکاتی محسوس ہو رہی تھیں، اس کے ہر انداز سے بے نام سی وحشت ٹپک رہی تھی مگر جہان کے ساتھ اس سلوک پہ ذرا سی بھی ندامت کا احساس اس کے چہرے پہ نہیں تھا، جہان نے اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پہ رکھ کے نرمی سے دباؤ ڈالا۔

''کیوں ڈسٹرب ہو معاذ؟'' معاذ نے زچ ہو کر بے حد ناراضی سے اسے دیکھا۔

''چل اب بتا دے کیا بات پریشان کر رہی ہے تجھے، جہاں تک میرا خیال ہے بھابھی سے جھگڑا ہوا ہے۔'' جہان کے انداز میں مخصوص بے تکلفی اپنائیت اور محبت تھی اور یہ رنگ اس کے لہجے و انداز سے معاذ کے لئے صرف اسی وقت جھلکتے تھے جب وہ سمجھتا تھا معاذ کو اس کی محبت اور دوستی کی بے حد ضرورت ہے، معاذ نے ایک نظر اسے دیکھا تھا اور ہونٹ سختی سے بھینچ لئے، جہان کو اپنی بات کا جواب مل گیا تھا،

اس نے بے اختیار سرد آہ بھری تھی۔

''کیوں ہوا ہے جھگڑا؟'' وہ زبردستی اسے اپنے کمرے میں لے آیا تھا، معاذ کا وجود بے تحاشا سرد پڑ چکا تھا، جانے وہ خرد ماغ انسان کب سے سرد ہواؤں کا مقابلہ کر رہا تھا، جہان نے کمبل اسے اوڑھانے کے بعد ہیٹر بھی آن کر دیا۔

''کتنی بد کردار اور ہوس پرست انسان سے جھگڑے یا اختلاف کے لئے کیا یہی ایک وجہ کافی نہیں؟'' معاذ نے بھینچی ہوئی مگر سرد آواز میں کہا تھا، جہان تو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکا۔

''یہ کہا ہے تمہیں بھابھی نے......؟'' اس کی آنکھیں حیرت کی زیادتی سے پھٹنے والی ہو گئی تھیں، معاذ نے تخفف سر ہلایا، جہان کی حیرت دو چند ہو گئی۔

''انہیں وہی نیلما والے معاملے میں شک ہے؟'' جہان کے سوال نے معاذ کو نظریں چرانے پہ مجبور کر دیا تھا، جبکہ جہان کا سوال اپنی جگہ پہ تھا، پھر اس کے اصرار کے آگے ہی معاذ نے اصل بات بتائی تھی، جہان ٹھنڈا سانس بھر کے تاسف بھرے انداز میں سر ہلانے لگا۔

''تمہارا ایٹی ٹیوڈ غلط تھا معاذ، تم مانو۔''

''مجھے پتہ تھا تم مجھے ہی غلط کہو گے، وہ غلط نہیں تھی، تم غلط نہیں تھے سارے گھر والے غلط نہیں تھے جو مل جل کر مجھے بے وقوف بناتے رہے، مجھے غصہ تھا پھر میں نے کوئی گناہ نہیں کیا، اس کا شدید ردعمل دیکھ کر تو لگتا ہے جیسے میں نے کوئی گناہ کر دیا ہے، اتنا احتجاج تو شاید کوئی عورت کسی غیر محرم کے چھونے پہ کرتی ہو گی، مان لو جے وجہ صرف یہی نہیں ہے، وہ مجھے شروع سے پسند نہیں کرتی، نفرت ہے اسے مجھ سے۔'' وہ اتنے غصے میں آیا تھا کہ بھڑک کر بولتا چلا گیا، اس کی سحر انگیز آنکھوں میں شعلوں کی لپک تھی، جہان کیا کہتا اس کا تو دماغ ہی ماؤف نہیں ہوا تھا، معاذ کی باتوں سے وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔

''دیکھا ہو گئے نا تم بھی چپ، میں کچھ بھی غلط نہیں سوچ رہا ہوں، اسے مجھ سے جان چھڑانے کا بہانہ چاہیے تھا۔'' معاذ نے پھنکار کر کہتے اپنی حتمی رائے پیش کی۔

''بکومت، اپنی فضول کی قیاس آرائیاں اپنے پاس رکھو، میں بھابھی کو اچھی طرح جانتا ہوں، وقتی غصہ ہے ان کا، تھوڑا تم بھی خود کو نارمل کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' جہان نے اسے جھڑک کے رکھ دیا، معاذ ایک جھٹکے سے اٹھا تھا۔

''بہت غلط سوچ ہے تمہاری کہ اب کچھ ٹھیک ہو گا، اب کچھ ٹھیک نہیں ہو گا جے، میں اسے بتاؤں گا کہ اس نے مجھ پہ یہ الزامات لگا کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔''

''کیا کرنے والے ہو تم؟'' جہان نے دہل کر اسے دیکھا، جواباً وہ زہر خند سے ہنس پڑا تھا۔

''یہ تو راز کی بات ہے تمہاری ڈیئر سس ہی جانے گی، بی کوز جفائیں جب حد سے بڑھ جائیں تو اشتعال انگیزیوں کو ہی جنم دیتی ہیں۔'' اس نے نخوت سے جواب دیا تھا، جہان سر تھام کر رہ گیا۔

☆☆☆

معاذ نے جس پل دوبارہ کمرے میں قدم رکھا رات کے آخری پہر کا بھی آخیر چل رہا تھا اور فضا میں فجر کی اذان کی پرنور پکار پھیل رہی تھی، وہ سیدھا ڈریسنگ میں گھسا تھا، نائٹ ڈریس بدل کر کمرے میں آیا تو پرنیاں کو اپنے بیڈ پہ بے خبر سوتے دیکھ کر پوری جان سے سلگ اٹھا تھا، اس پل پرنیاں نے نیند میں

کروٹ بدلی تھی جس سے اس کا روپہلی چاندنی جیسا چہرا کمبل سے باہر آ گیا تھا، اس کے گلابی رخساروں پہ معاذ کے ہاتھ کی انگلیوں کے نشان بے حد واضح ہو رہے تھے، وہ ہونٹ بھینچے بہت جارحانہ انداز میں آگے بڑھا تھا اور نہایت طیش کے عالم میں اس کے اوپر سے کمبل کھینچ لیا تھا، پرنیاں کی نیند اتنی گہری کہاں تھی کہ پھر بھی نہ ٹوٹتی جبکہ کمبل کا ایک بڑا حصہ اس کے وجود کے نیچے دبا ہونے کے باعث وہ اس کھنچاؤ پہ سرک کر بیڈ کے سرے تک آ پہنچی تھی بس گرنے سے ہی بچی تھی گویا، اس افتاد پہ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور معاذ کے خطرناک تیوروں کو دیکھ کر جیسے روح ہی فنا ہو گئی۔

''اٹھو یہاں سے، خبردار جو آئندہ میرے بستر تک آنے کی جرأت کی۔'' وہ پھنکارا تھا، اس کی آنکھوں میں لہراتا خوف ناک قسم کا غصہ اس پل کچھ اور بھی گہرا ہو چکا تھا، پرنیاں اس درجہ ہتک اور تذلیل کے مظاہرے پہ اپنی جگہ پر کٹ کے رہ گئی مگر اس نے بستر سے نیچے آنے میں ایک لمحے سے زیادہ وقت نہیں لیا تھا، توہین کا سلگتا احساس اس کا تنا بدن جھلسا کے رکھ رہا تھا، معاذ نے بستر سنبھال لیا تھا کمبل اپنے اوپر پھیلاتے اس کی نگاہ سرہانے کی جانب پڑے پرنیاں کے گلابی دوپٹے میں الجھی تھی۔

''اپنے ساتھ اپنی چیزوں کی بھی حفاظت کرنا سیکھو، ہوس پرست لوگوں کے قبیلے میں پارسا لوگوں کی پارسائی کو زیادہ خطرہ لاحق ہوا کرتا ہے۔''

دوپٹہ گول مول کر کے دور اچھالنے کے بعد وہ نفرت زدہ لہجے میں پھنکارا تھا اور پرنیاں جو مشکل سے آنسو ضبط کیے تھی مزید خود پہ قابو نہیں رکھ سکی، ایک عجیب سی دل جکڑتی ہوئی کیفیت نے اسے اپنے حصار میں لے لیا، وہ ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اس کی خفگی ناراضی اور طیش کے سامنے اپنا غصہ ناراضی سب بھول گئی تھی، رات سے ہی اسی کے اندر ملال اور یاسیت کا عجیب سا احساس اتر آیا تھا، اپنے آپ کو حق بجانب سمجھنے کا خیال ہوا تھا اور اس کی جگہ معاذ کے شدید ردعمل کو تشویش اور اضطراب نے لے لی تھی وہ ان چند گھنٹوں میں جانے کتنی بار خود کو ملامت کر چکی تھی قصور وار ٹھہرا چکی تھی کہ اسے معاذ سے یوں جھگڑا کم از کم نہیں کرنا چاہیے تھا وہ بھی اس صورت جبکہ وہ اپنے کیے پہ معذرت خواہ تھا، اسے خود پہ حیرت ہو رہی تھی، کیا اس کی وہ ناراضگی اتنی شدید تھی کہ اس میں معاذ کی وہ محبت بھی گم ہو گئی تھی جو اسے پہلے روز دیکھ کر ہی اس نے اس کے لئے اپنے دل میں محسوس کی تھی، پھر اس کی ہر حرکت چاہے وہ اس پہ کتنا ہی کڑھی ہو سلگی ہو مگر اس محبت کے دل میں فروزاں دیئے کو حالات کی آندھیوں سے بچانے کی سعی میں ہلکان رہا کرتی تھی، دیکھا جاتا تو اس پوری دنیا میں لے دے کے آ گر اس کا کچھ اثاثہ اور قیمتی سرمایہ تھا تو وہ معاذ تھا اس کی محبت تھی، جو معجزاتی طور پہ ہی اسے ملی تھی، وہ دو سال جس کے ہر دن کے متعدد سجدوں میں گڑگڑا کر اپنے رب سے اپنے لئے مانگی تھی، کتنے راز کی بات تھی یہ جسے اس نے کبھی خود بھی اپنے آپ سے شیئر نہیں کیا تھا شیئر کیا تھا تو اس مالک حقیقی سے جو سب کچھ عطا کرنے کی شان رکھتا ہے اور اس مالک کل نے اسے مایوس بھی تو نہیں ہونے دیا تھا، معاذ کا اسے دیکھ کر یوں باقی سب بھلا دینا اس کے نزدیک معجزہ ہی تو تھا، مگر وہ اس نعمت کی قدر نہیں کر سکی تھی، شکر ادا کرنا تو دور کی بات، رات سے اسے یہی ملال کھائے جاتا تھا، یہ کیا کر دیا تھا اس نے، کیا وہ محبت اتنی ہی بودی تھی اس کی جو اتنی سی بات پہ یوں ختم ہو گئی تھی اور دل اتنا سخت ہو گیا جذبے یوں سرد پڑ گئے، وہ ساکن کھڑی معاذ کے کمبل میں چھپے توانا وجود کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتی رہی، ایک بار تو دل میں خواہش جاگی، انا کو پس پشت ڈال کر خود اس کی

جانب پیش رفت کر لے، معافی مانگ لے اس سے، وہ شوہر تھا اس کا، رات جس سے اس نے جھگڑا تھا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق ساری رات فرشتوں نے لعنت بھیجی تھی اس پہ، کیا وہ ہر رات ایسی ہی لعنت کی مستحق ٹھہرے گی، اس کے آنسو بہنے لگے، مگر معاذ کے پاس جانے اور کچھ کہنے کا بھی حوصلہ ناپید تھا، وہ جتنے غصے اور قہر کا ابھی مظاہرہ کر چکا تھا اس سے کچھ بعید نہیں تھا اسے شوٹ کرنے سے بھی گریز نہ کرتا، آنسو پونچھتی وہ وضو کے ارادے سے واش روم میں گھس گئی، بوجھل دل سے نماز ادا کرنے کے بعد وہ بارگاہ ایزدی کے حضور سر سجدے میں رکھتے ہی ضبط کھو گئی تھی۔

☆☆☆

تجھے کیا خبر میرے حال کی
میرے درد میرے ملال کی
یہ میرے خیال کا سلسلہ
کس یاد سے ہے ملا ہوا
اسے دیکھنا اسے سوچنا
میری زندگی کا ہے فیصلہ
یہ اس کی پلکوں کے سائے ہیں
میری روح میں جو سمائے ہیں
یہ جنون منزل عشق ہے
جو چلے تو جاں سے گزر گئے

بیڈ پہ نیم دراز وہ ہینڈ سیٹ کے ذریعے اپنے سیل پہ گیت سن رہی تھی، سن کیا رہی تھی، سن کر رو رہی تھی، عجیب حالت تھی دل کی، انکشاف کی زد پہ آ کر خشک پتے کی طرح لرزے جاتا تھا، عجیب تھازیاں کا عالم بھی وہ اک شخص جو کبھی اس کو ملا ہی نہ تھا وہ اسی کو گنوانے کی عذاب سے دوچار تھی گویا۔

مجھے اس مقام پہ چھوڑنا
ہے یہ بے وفائی کی انتہا
یہ قفس ہو جیسے کھلی فضا
نہیں سکھ کا سانس میں لوں سدا
جنہیں تیری دید کی پیاس تھی
وہ نین آنسوؤں سے بھر گئے
یہ جنون منزل عشق ہے
جو چلے تو جاں سے گزر گئے

وہ مضطرب اتنی تھی کہ اٹھ کر بے قراری سے ٹہلنے لگی، کل جب زینب اسے جہان کے حوالے سے اپنی برتری اس پہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس سے بھی قبل اس نے جان لیا تھا، جہان اور زینب کے بیچ کچھ نہ کچھ خاص تھا، مگر وہ خاصیت وہ ساری کی ساری اہمیت جہان کی جانب سے ہو گی یہ تو اس نے تصور تک نہیں کیا تھا، کچھ زینب کی باتیں تھیں اور کچھ نئی جگہ کی وجہ کہ وہ سو نہیں پا رہی تھی، سوچیں اور

خیالات کا سلسلہ اتنا وحشت زدہ کر رہا تھا کہ اسے لگا تھا وہ پاگل ہو جائے گی اپنی اسی کیفیت کے خوف سے وہ ماریہ کے پاس جانے کو بے سوچے سمجھے اٹھ کر کمرے سے باہر آ گئی تھی، حالانکہ رات کے اس پہر ماریہ کو ڈسٹرب کرنا غلط تھا مگر ژالے اپنی ہیجانی کیفیت کے زیر اثر اس اہم نقطے پہ زیادہ غور نہیں کر سکی تھی، کہاں خبر تھی اس سے بڑھ کر وحشت اور اضطراب نصیب بننے والا ہے، وہ اس گھر کی لوکیشن سے انجان تھی، راہداری کے کونے میں جس دروازے کو کھلا دیکھا اس میں جھانک لیا تھا اور یہ غلطی ہی تو کی تھی اس نے، زینب کے ساتھ وہ جہان ہی تو تھا، کیا وہ جہان ہی تھا، اسے خود کو یقین دلانا پڑا تھا، ورنہ جہان اور مہربانی نرمی اور محبت یکساں تو کبھی نہیں لگے تھے اور یا پھر وہ زینب کے لئے سراپا رحمت ہی رحمت تھا، ہاں بلاشبہ حیثیت اور مراتب طے کرنے میں بھی دل کی مرضی کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے، وہ جس دیوتا کے قدموں میں جگہ ڈھونڈتی نڈھال ہو رہی تھی وہ تو کسی اور کا اسیر تھا پھر کیسے اس کی کوشش سرخروئی سے ہمکنار ہو جاتی، اس زیاں نے اس کے دل کو اتنا بے دردی سے بھینچا تھا کہ اسے سانس لینی محال کر دی تھی، معاً وہ چونک گئی تھی، گانا بند ہوا تھا اور اس کے سیل پہ کال آنے لگی تھی، ژالے نے آنسوؤں سے دھندلائی نظروں سے اسکرین پہ چمکتے مسز آفریدی کے نمبر کو دیکھا تھا۔

"جی ممی!" کال ریسو کرنے سے قبل اس نے خود کو کمپوزڈ کیا تھا، جانتی تھی وہ سوال کر کر کے اسے عاجز کر دیں گی۔

"آج ولیمہ ہے نا؟" اس کی خیریت دریافت کرنے کے بعد انہوں نے سوال کیا تھا۔

"جی! آپ کو آنا تھا نا آج؟"

"میں نہیں آ سکوں گی جبھی میں نے یہی بتانے کو کال کی ہے، میری میٹنگ ہے بہت اہم آج، اٹینڈ نہ کرنے کا مطلب لاکھوں کا نقصان۔" وہ اپنی مجبوریوں کا پلندہ کھول کر بیٹھ گئیں۔

"آپ شاہ کو یا پھر ان کے چاچو کو ایکسکیوز کریں ممی، مجھے کیوں کر رہی ہیں؟" وہ نروٹھے پن سے بولی تھی۔

"میں کر چکی ہوں، احسان شاہ کو کال، تمہیں تو بتایا ہے کہ میرا انتظار نہ کرنا۔"

"آپ کو شاہ کو بھی بتانا چاہیے تھا ممی۔" ژالے نے انہیں ٹوکا، تو مسز آفریدی نے طنزیہ ہنکارا بھرا تھا۔

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے وہ اس تقریب میں صرف میرا ہی تو منتظر ہوگا۔" مسز آفریدی کی بات پہ ژالے کو ناگوار سے احساس نے آن لیا۔

"ایٹی کیٹس بھی کوئی چیز ہوتی ہے ممی! آپ کا سب سے اہم تعلق شاہ سے ہی بندھا ہے۔"

"تم تو ابھی سے اس کی بے دام غلام بن گئی ہو، بعد میں کیا حال ہوگا تمہارا۔" مسز آفریدی کو بھی غصہ آ گیا تھا اس کی نقطہ چینی پہ۔

"شوہر کی اطاعت گزاری اور خدمت کا حکم ہمیں اسلام دیتا ہے ممی، میں ایسا کر کے کچھ بھی انوکھا نہیں کروں گی۔" اس نے جتلا کر کہا مسز آفریدی اس کی ایسی باتوں سے ہمیشہ چڑتی تھیں، اس وقت بھی جھلا کر فون بند کر دیا، ان کے خیال میں اتنی سی عمر میں اتنا مذہبی ہونے کی کیا تک ہے۔

"پھر کس ایج میں مذہبی ہونا چاہیے ممی! آپ کی ایج میں، مگر آپ تو ابھی تک مذہبی نہیں ہوئیں؟"

ایک مرتبہ اس نے غصے میں کہہ دیا تھا اور مسز آفریدی اتنا برا مانی تھیں کہ اسے طویل لیکچر دیا تھا، جس کے جواب میں ژالے نے انہیں وہ حدیث سنائی تھی جس میں نوجوانوں کے توبہ کرنے سے مردوں سے عذاب ہٹا دیا جانے کا بیان ہے، انہیں اس کی سادگی، فیشن سے گریز ناگوار گزرتا تھا اور ژالے محض ان کی رضامندی کی خاطر اللہ کے احکامات سے روگردانی کی روادار نہیں تھی۔

"بھابھی آپ اٹھ گئیں ہیں؟ مما آپ کو ناشتے پہ بلا رہی ہیں۔" دروازے پہ ماریہ تھی، ژالے اپنے خیالات سے چونک اٹھی، پھر اسے کچھ دیر میں آنے کا کہتی مضمحل قدموں سے واش روم کی سمت بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

ڈل گولڈن لہنگا اور کامدار بلاؤز تھا، بلاؤز کی آستین بے حد مختصر سی تھیں جن سے نمایاں ہوتے اس کے بازو بھی سنہرے لباس میں سنہرے سنہرے ہی ہو رہے تھے، بھاری کامدار دوپٹہ بہت سلیقے سے سیٹ کیا گیا تھا، کانوں میں طلائی جھمکے تھے، دمکتی پیشانی پہ بندیا جسے وہ بار بار درست کرتی تھی، شدید الجھن محسوس کر رہی تھی، تیاری کے بعد اسے جس نے بھی دیکھا کچھ لمحوں کو اس کے چکاچوند کرتے سراپے سے نگاہیں نہیں ہٹا سکا تھا، چودھویں کے چاند جیسا روشن مبہوت کر دینے والا چہرا دیکھ کر زینب نے اس کی بے ساختہ تعریف کی تھی۔

"میں نے ہمیشہ سنا تھا شادی کے دن کے بجائے ولیمہ کی دلہن پہ زیادہ نکھار آتا ہے، درحقیقت یہ نکھار شوہر کی محبتوں کا چڑھتا ہے ہر عورت پہ مگر تم پہ تو کچھ زیادہ ہی چڑھ گیا ہے، لالے کی ہی نظر لگنے کا سب سے زیادہ خدشہ ہے مجھے، ویسے رات تمہیں ہوش میں لانے کی دوا دینا بھول گئی، لالے کی خیریت نیک مطلوب تھی مجھے۔"

وہ اسے مسلسل چھیڑ رہی تھی اور پرنیاں کا جو رنگ خجالت سے سرخ پڑ رہا تھا اسے زینب نے شرم پہ محمول کیا تھا اور اچھا ہی تھا اس کا بھرم رہ رہا تھا ورنہ معاذ نے تو یہ تکلف بھی نہیں برتا تھا، وہ اگر خوش نہیں تھا تو اس نے خود کو خوش ظاہر کرنے کی قطعی کوشش نہیں کی تھی، صبح سے اب تک کتنے لوگ معاذ سے اس کی خاموشی اور بے زاری کا سبب پوچھ چکے تھے جس پہ جھلاہٹ کا شکار ہوتا وہ ان سے الجھنے کھڑا ہوا تھا کئی بار۔

"اب کیا میں پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا رہوں؟"

"کل تک تم قہقہے لگاتے رہے تھے تو اس کا مطلب تھا تم پاگل تھے؟" جنید بھائی نے اسے ڈانٹا تھا۔

"خوشی کا اظہار ہنس مسکرا کر ہی کیا جاتا ہے نہ کہ منہ میں کنگھیاں ڈال کر بیٹھ جایا جاتا ہے۔" جنید بھائی اسے ہرگز بخشنے پہ آمادہ نہیں تھے، تب اس نازک موقع پہ جہان نے جنید بھائی کا دھیان بٹایا تھا، معاذ کے انداز کی گمبھیرتا سے پرنیاں کا دل دہلا جاتا تھا اور جب اسے اسٹیج پہ سلامیوں کے لئے بلایا گیا تو مووی میکر کی ہدایت کے مطابق معاذ کو پرنیاں کے ساتھ ساتھ چل کر اسٹیج پہ آنا تھا اور معاذ کو اسی بات سے الجھن اور ناگواری محسوس ہو رہی تھی مگر مصلحتاً خاموش رہا تھا، یہ بھی شکر کا مقام تھا، ورنہ جس قسم کا اس کا مزاج تھا پرنیاں خوفزدہ تھی وہ صاف منع نہ کر دے، اب تک اس کے رویئے کی تبدیلی کی وجہ بھی مما اور

بھابھی سمیت کتنے لوگوں نے سرسری انداز میں سہی مگر اس سے پوچھی ضرور تھی اور وہ ہولتی رہی تھی، مووی میکر کی ہدایت کے مطابق وہ بہت سبک انداز میں قدم رکھ رہی تھی، یوں جیسے پانی پہ چلتی ہو پھر بھی جانے کیسے ہائی ہیل پہ اس کا توازن بگڑا تھا اور وہ سنبھلتے سنبھلتے بھی گرسی گئی تھی، اس کے ہمراہ چلتا معاذ پہلے چونکا پھر بوکھلایا تھا، مصلحتاً ہی سہی اس نے ناگواری کو دبا کر اسے سہارا دے کر کھڑا کیا تھا، اردگرد کتنے لوگ تھے، سب لپک کر ان کی جانب آ گئے تھے، اس کے جوتے کا اسٹریپ ٹوٹ گیا تھا، وہ خود کو چلنے سے بری طرح قاصر پاتی تھی، پھر پیر میں بھی شاید موچ آ گئی تھی، تکلیف کے ساتھ سبکی کا بھی احساس تھا جس نے اس کے چہرے کو سرخ اور آنکھوں کو نم کر دیا تھا، معاذ کے چہرے پہ بےزاری اور کوفت کے آثار بےحد نمایاں تھے، وہ اسے مارے بندھے بھی سہارا دینا گوارا نہیں کر رہا تھا، مما اور بھابھی جو لپک کر اس تک آئی تھیں پرنیاں کو سنبھال لیا تھا، مووی کیمرا بند کرا دیا گیا، پرنیاں کے آنسو تمام تر ضبط کے باوجود بہہ نکلے تھے۔

"معاذ بیٹا آپ پرنیاں کو اٹھا کر کمرے میں لے کر چلو، پھر دیکھتے ہیں چوٹ زیادہ تو نہیں آئی؟" مما پرنیاں کے آنسوؤں کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی گھبراہٹ کا شکار ہو گئی تھیں، معاذ تو سنتے ہی بدک سا گیا تھا اس کے چہرے پہ ناگواری کا بہت واضح اظہار ہوا تھا۔

"کیا مطلب ہے مما! اتنے لوگوں کے بیچ میں کیسے اٹھا لوں، کتنا آکورڈ لگے گا۔" مما نے حیرانی سے بیٹے کی شکل دیکھی، پھر کس قدر غصے سے بولی تھیں۔

"کیا آکورڈ لگے گا؟ یہاں موجود سب لوگ جانتے ہیں پرنیاں کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے اور یہ کام تم کسی مووی کے سین کو اوکے کروانے کو نہیں کرو گے، بچی تکلیف میں ہے۔"

"میں چل لوں گی مما، جوتے کا اسٹریپ نکل گیا ہے، بس مجھے ذرا سا سہارا دے لیں آپ۔" پرنیاں دھیمے لہجے میں مداخلت کر گئی تھی، اس کا چہرا سبکی کے احساس سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا، مما خاموش رہیں اور بھابھی کے ساتھ اسے سہارا دے کر واپس کمرے میں لے گئیں مگر ان کے چہرے سے صاف لگتا تھا وہ معاذ کے اس رویے سے بےحد خفا ہوئی ہیں۔

"اسما بیٹے آپ زیاد کو بلا کر لاؤ، بچی کے پیر کو دیکھ لے۔" پرنیاں کا لہنگا سمیٹ کر اسے بستر پہ بٹھاتے ہوئے مما نے بھابھی کو مخاطب کیا تھا، وہ اسی خاموشی سے کمرے سے نکل گئیں پرنیاں ان سے نگاہ چرا رہی تھی، صاف ظاہر تھا ان کے سوالوں سے خائف ہے، ماحول پہ تکلیف دہ اور معنی خیز سناٹا طاری تھا جب دروازہ کھلا اور بھابھی کے ساتھ ژالے بھی اندر آ گئی تھی۔

"آپ کو چوٹ زیادہ لگی ہے پرنیاں؟" وہ تشویش زدہ انداز میں اسے دیکھتی بیڈ پہ اس کے ساتھ آ بیٹھی، پرنیاں جبراً ہی مسکرائی تھی۔

"نہیں، مما یونہی پریشان ہو رہی ہیں، ایم اوکے ناؤ۔" اس نے ژالے کے ساتھ ساتھ مما کو بھی تسلی سے نوازا تھا۔

"زیاد نہیں آیا؟" مما نے سوالیہ نگاہوں سے بھابھی کو دیکھا تھا جو روتے ہوئے عبدالرفع کو کاندھے سے لگائے تھیں۔

"میں نے جہان کو کہا ہے، آتا ہو گا وہ۔" بھابھی کے الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے جب جہان اور معاذ

ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے، معاذ نے آگے بڑھ کر منہ سے کچھ بولے بغیر پرنیاں کا پیر چیک کرنا چاہا تھا، پرنیاں نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ جہان کے فورس کرنے پہ طوعاً و کرہاً آیا ہے، اس کا دل عجیب سے خالی پن سے بھر گیا، معاذ کو شاید اس سے تعاون کی توقع تھی کہ وہ متاثرہ پیر آگے کر کے لہنگا ہٹائے گی مگر وہ تو ساکن بیٹھی رہی تھی، جبھی اس پہ قہر بھری پھنکارتی نگاہ ڈال کر معاذ نے خود اس کا لہنگا پیر سے سرکایا تھا اب مسئلہ اس کے ٹخنے تک آتے پاجامے کا تھا جس کی بےشمار چوڑیاں وہ چاہتا بھی تو ہٹا کر متاثرہ جگہ کا معائنہ نہیں کر سکتا تھا، پرنیاں کو اس کی جھنجلاہٹ کا جیسے ہی احساس ہوا اس نے گھبرا کر جھکتے ہوئے یہ کام خود سرانجام دیا تھا، معاذ کی جھجکی مگر سلگتی نظروں میں اس کے نازک بےحد اجلے شفاف حنائی ہاتھ آ گئے، جو بہت ہلکی سی کپکپاہٹ لئے مصروف عمل تھے، پرنیاں کے ہاتھ جھٹک کر معاذ نے چیک اپ کا فریضہ انجام دیا تھا، پھر گہرا طویل سانس بھر کے کس قدر آہستگی سے بولا تھا۔

"معمولی سی موچ ہے مگر احتیاط ضروری ہے، آج کا دن چلنے پھرنے سے گریز کرنا ہو گا۔" وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"بھابھی آپ کو تکلیف زیادہ تو محسوس نہیں ہو رہی؟" جہان نے معاذ کو تنبیہی نظروں سے گھور کر نرمی سے پرنیاں کو مخاطب کیا، اس نے محض سر کو نفی میں جنبش دی تھی، ژالے جو تب سے گاہے بگاہے اسے دیکھ رہی تھی اب سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں الجھنے لگی تب جہان کی پہلی بار اس پر نظر اٹھی اور عجیب سی تپش سمیٹ لائی تھی۔

"مجھے پہلے ہی یہی خدشہ تھا، نظر لگ گئی نا، آپ کے پپا سے کہتی ہوں بچی کا صدقہ دیں بکرا لے کر۔" مما بڑبڑاتیں اٹھی تھیں، بھابھی شرارت سے مسکرانے لگیں۔

"مما کا خیال ہے بلکہ یقین ہے پرنیاں کو معاذ نے نظر لگائی ہے۔" بھابھی کی نظریں معاذ پہ تھیں جس کے چہرے پہ تناؤ کی لہر اٹھی تھی مگر وہ دبا گیا تھا۔

"معاذ کے ساتھ تمہارا کوئی اختلاف ہوا ہے پری؟" سب کے کمرے سے جانے کے بعد بھابھی نے تشویش سے پوچھا تھا، پرنیاں کی رنگت متغیر سی ہو گئی۔

"نہیں تو بھابھی، ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے شاید اس وجہ سے اس طرح ہو رہے ہیں۔" اس نے ٹالا تھا، بھابھی نے مزید کرید نہیں کی تھی، پرنیاں نے تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں موند لی تھیں۔

☆☆☆

بالوں میں انگلیاں الجھائے وہ مضطرب سی ٹیرس کی ریلنگ سے لگی کھڑی نیچے دیکھتی تھی، لان کی سبز مخملیں گھاس دھوپ میں چمک رہی تھی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سردی کی شدت کو کم ہونے نہیں دے رہے تھے، وہ بےچین سی ہو کر ٹہلنے لگی، اتنے سارے گفٹس وہ ساتھ لے کر آئی تھی سب کو پہنچا دیئے تھے، ینگ پارٹی نے تو بہت جوش و خروش اور خوشی سے قبول کیے تھے، بڑوں نے البتہ اس تکلف پہ اسے ٹوکا تھا، جہان کا گفٹ سب سے خاص تھا جو اس نے خود پسند کیا تھا، بیش قیمت رسٹ واچ اور پرفیوم مگر وہ اسے دینے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھی آج اسے واپس جانا تھا اور جانے سے قبل وہ یہ کام کر دینا چاہتی تھی، بہت سوچنے کے بعد اس نے ہمتوں کو مجتمع کیا اور کمرے میں آ کر ٹیبل پہ رکھا پیک اٹھا لیا تھا، کچھ دیر قبل اس

نے جہان کو اپنے کمرے میں جاتے دیکھ چکی تھی اس کے خیال میں یہ بہترین موقع تھا، بہت حوصلہ کر کے وہ اس کے کمرے تک تو آ گئی تھی مگر دروازے پہ آ کر پھر ہمتیں اور حوصلے کمزور پڑنے لگے، قریب تھا کہ وہ واپس پلٹ جاتی کہ اسی پل دروازہ کھلا تھا اور جہان اپنے دھیان میں باہر آتا اس سے ٹکرا گیا تھا، ژالے ہل کر رہ گئی، ہاتھ میں موجود پیک زمین بوس ہو چکا تھا، اپنے کمرے کے دروازے پہ ہونے والے اس تصادم نے جہان کے چہرے پہ ناگواریت کا تاثر بکھیر دیا تھا، یہ سوچ ہی بے حد تاؤ دلا دینے والی تھی کہ وہ اس کے کمرے میں آنا چاہ رہی تھی۔

”کیا مسئلہ ہے؟ کیوں کھڑی تھیں آپ یہاں؟“ اس کے چہرے کے تاثرات میں ہنوز برہمی اور بے زاری تھی، ژالے جو جھک کر پیک اٹھا رہی تھی گھبرا کر سیدھی ہوئی۔

”وہ...... ایکچوئلی یہ گفٹ تھا جو میں......“ حواس باختہ سی ہوتی ہکلا کر بولی تھی، جہان نے ایک نظر اس کے ہاتھ میں موجود خوبصورت پیک کو دیکھا تھا اور ماتھے پہ بل ڈال لئے تھے۔

”آپ سے کس نے کہا مجھے اس کی ضرورت ہے یا میں قبول کر لوں گا؟ محترمہ آپ جو عمر بھر کا طوق بن کر میرے گلے پڑ گئی ہیں آپ کی طرف سے یہی کافی ہے میرے لئے، تشریف لے جائیے۔“ اس کا لہجہ مدھم مگر رہانت اور تضحیک کے احساس سے لبریز تھا، اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا، تنفر بھرے انداز میں آگے بڑھ گیا، ژالے سبکی اور خفت کے احساس کے ساتھ اپنا دل رنج سے شق ہوتا محسوس کرتی دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ وہیں کھڑی رہ گئی، معاً نظروں کی تپش اور مردانہ کھنکار پہ وہ اس تکلیف دہ احساس سے نکلی تھی، سامنے سیاہ شلوار سوٹ میں ملبوس کڑیل جسم کا مالک تیمور خان کھڑا تھا جس کے چہرے پہ ہی نہیں آنکھوں میں ایک عجیب سا احساس تھا، شاید اس کے دیکھنے کے انداز میں شائستگی نہیں تھی جس نے ژالے کو سنبھلنے اور پھر خود میں سمٹ جانے پہ اکسایا تھا، تیمور خان کل ولیمہ پہ پہنچا تھا وہ دور سے ہی اس سے متعارف ہوئی تھی کسی نے بھی اس کا انٹروڈکشن براہ راست تیمور سے کرانے کی کوشش نہیں کی تھی، اس کی وجہ ژالے کو اب سمجھ آ رہی تھی۔

”آپ کو پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا، پرنیاں صاحبہ کی سسٹر ہیں آپ، انہی کی طرح ہیں، یونیک اور فیسی نیٹنگ۔“ وہ بے باک اور اندر تک کھوج لیتی نظروں سے اسے مسلسل یک ٹک دیکھ رہا تھا، ژالے بری طرح سے جزبز ہوتی ہوئی تھی، اسے قطعی سمجھ نہیں آئی سسرالی اس بے حد اہم رشتے کے ساتھ کس طرح کا رویہ رکھے۔

”جج...... جی میرا نام ژالے آفریدی ہے اور میں پرنیاں کی بہن نہیں ہوں۔“ اس نے مارے بندھے جواب دیا تھا اور اپنا آنچل کچھ اور پھیلا کر اپنے آپ کو اچھی طرح سے ڈھانپا۔

”ژالے...... یعنی جہانگیر کی مسز؟“ تیمور خان کو جیسے دھچکا لگا تھا، ژالے کا رنگ جہان کا حوالہ پاتے ہی گلابی ہو گیا جبکہ تیمور بے ساختہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا تھا، ژالے محض سر ہلا سکی پھر کترا کر تیزی سے نکل گئی، تیمور خان کی لپکتی نگاہوں نے راہداری کا موڑ مڑنے تک اس کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔

☆☆☆

ان کی سب سے پہلی دعوت کالج کے پرنسپل صاحب نے اپنے گھر پہ کی تھی، معاذ اپنی مصروفیت کو آڑ بنا کر باقی سب کو تو ٹرخائے جا رہا تھا مگر انہیں ظاہر ہے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا، جبھی اسے پرنیاں کو لے کر

وہاں جانا پڑا تھا، دعوت تو سب کو دی گئی تھی مگر جا وہی دونوں رہے تھے، معاذ خود کب کا تیار ہو کر باہر جا چکا تھا اسے پورٹیکو میں آنے کا کہہ دیا تھا، پرنیاں نے اس کے موڈ کی خرابی کے خوف سے ذرا عجلت میں تیاری مکمل کی تھی، آتشی گلابی ساڑھی جس کے کناروں پہ بہت شوخ رنگوں کا خوبصورت سا کام جھلملاتا تھا اور انہی شوخ رنگوں کے ساتھ میچ کرتا ہوا بلاؤز تھا جس کے بازوؤں کا بس جیسے تکلف ہی کیا گیا تھا، پرنیاں نے اس بے پردگی کو چھپانے کی غرض سے ہی شال اوڑھ لی تھی، جس پل وہ سینڈل پہن کر باہر آئی، پہلا ٹکراؤ ہی مما سے ہوا تھا۔

”ماشاءاللہ! چشم بددور۔“ مما نے اس کو بے ساختہ والہانہ انداز میں پیار کیا تھا۔

”گجرے کیوں نہیں باندھے؟ میں نے بھجوائے تھے نا بیٹے، ساتھ لے جاؤ گاڑی میں پہن لینا۔“

”جی مما!“ وہ آہستگی سے مسکرائی تھی، پھر واپس جا کے گجرے ڈریسنگ ٹیبل سے اٹھا لائی، مما کو خدا حافظ کہتی وہ پورٹیکو میں آئی تو وہاں تیمور خان پہلے سے معاذ کے ساتھ موجود تھا، پرنیاں اس سامنے پہ بے ساختہ گھبرائی تھی اس پہ تیمور کی بے لحاظ لپکتی ہوئی نظریں۔

”السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟“ اس کا اخلاق اور خوش دلی کا مظاہرہ بھی بہت انوکھا تھا جو ہمیشہ خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر ہی ہوتا تھا۔

”وعلیکم السلام! مم...... میں ٹھیک ہوں۔“ وہ جواباً اس کی خیریت نہیں پوچھنا چاہتی تھی، اس کی جان تو معاذ کے چہرے کے بگڑتے زاویوں کی وجہ سے ہی ہوا ہو رہی تھی۔

”آپ مجھے ہمیشہ ضرورت سے زیادہ خاموش اور کسی حد تک اداس نظر آتی ہیں۔“ تیمور اسے دیکھ کر زیادہ ہی پھیل رہا تھا، پرنیاں نے مضطرب سی نگاہ معاذ پہ ڈالی جو دانت بھینچے بظاہر لاتعلق نظر آتا تھا۔

”یہ میرا مزاج ہے تیمور بھائی اور جو آپ کو اداس لگتی ہے وہ میرا گریز ہے میں اجنبیوں سے زیادہ بات چیت پسند نہیں کرتی، چلیں معاذ؟“ تیمور کی آخری بات نے اسے آگ سی لگا دی تھی، جبھی اس نے اس کا مزاج درست کر کے رکھ دیا تھا، معاذ بھی ایک پل کے لئے اس کے اعتماد اور بے رخی کے مظاہرے پہ ساکن رہ گیا تھا، کسی تاثر کے بغیر اس نے تیمور سے الوداعی مصافحہ کیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، پرنیاں نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے زور سے دروازہ بند کر کے گویا اپنا غصہ نکالا تھا۔

”میں جانتی ہوں آپ کو میرا ان سے ملنا اور بات چیت کرنا پسند نہیں مگر رئیلی مجھے ہرگز بھی اندازہ......“

”کیوں وضاحتیں دے رہی ہیں؟ میں نے آپ سے کچھ پوچھا نہیں ہے، ویسے بھی آپ ہر معاملے میں خود مختار ہیں۔“ وہ اس کی بات قطع کر کے زور سے پھنکارا تو پرنیاں نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا تھا، پھر ہمت مجتمع کر کے منمنائی۔

”میں ہرگز نہیں چاہوں گی آپ مجھے غلط سمجھیں۔“ اس کی بات پہ معاذ نے کاٹ دار تمسخر سے اسے کچھ دیر تک دیکھا تھا پھر مضحکہ اڑانے والے انداز میں ہنس دیا۔

”میں ہوتا کون ہوں، آپ کے بارے میں کوئی رائے دینے والا، اس تکلف میں مت پڑا کریں میڈم۔“ پرنیاں کا چہرا دھواں دھواں ہو گیا، کچھ دیر وہ پلکیں جھپک کر آنسو اندر اتارتی رہی، معاذ کی بے

حسی لاتعلقی اور بے نیازی اس کے لئے بہت تکلیف دہ تھی وہ بھی اس صورت کہ وہ اس کی محبت اور چاہت کی سب شدتوں کو محسوس کر چکی تھی۔

"مجھے پتہ ہے آپ مجھ سے بہت خفا ہیں، مجھے اپنی غلطی کا بھی احساس ہے، معاف کر دیں مجھے پلیز۔" اسٹیرنگ وہیل پہ جمے معاذ کے مضبوط ہاتھوں پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے وہ اچانک ملتجی ہو کر بولی تھی، معاذ تو چند ثانیوں کو حق دق رہ گیا تھا، اسے پرنیاں سے اس حد تک پسپائی کی توقع ہی کہاں تھی، مگر جب یہ سکتہ ٹوٹا تو پھر گویا بھونچال آ گیا تھا۔

"جسٹ شٹ اپ، قابو میں رکھنا سیکھو اپنے آپ کو اور مجھے کیوں چھو رہی ہیں، اس ناپاکی کے احساس کو کیسے معاف کریں گی، مجھ جیسے انسان سے بچ کر رہنا سیکھو سمجھیں۔" اس کے ہاتھ نہایت حقارت بھرے انداز میں جھٹک کر وہ غرانے کے انداز میں کہہ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں اس درجہ تپش تھی کہ پرنیاں فق چہرے کے ساتھ اسے متوحش بھیگی نظروں سے دیکھتی رہ گئی، گاڑی کے ماحول میں یکلخت سناٹا در آیا تھا، سکوت سے لبریز یہ اعصاب شکن لمحے بہت بوجھل تھے گویا، پرنیاں کی آنکھوں میں کرب اور اضمحلال کے ساتھ شکوہ بھی مچل رہا تھا، جبکہ معاذ کے سرخ چہرے پہ صرف تپش تھی، اتنی ذلت کافی تھی فی الحال پرنیاں بجھے دل کے ساتھ آنسو پیتی نڈھال سی ہو کر بیٹھ گئی تھی، معاذ بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ ریش ڈرائیو کر رہا تھا۔

☆☆☆

زینب نے گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگائی اور ایک نظر کھڑکی سے باہر دیکھا، جہاں سے اس وقت وہ گزر رہے تھے یہ کراچی کا مہنگا ترین علاقہ تھا، یہاں کوٹھیاں اور بنگلے ایک دوسرے سے فاصلے پر بنے ہوئے تھے، بہت جدید اور خوبصورت انداز میں بنے گارڈنز اور سوئمنگ پول بھی نظر آ رہے تھے، بیشک بہت پرسکون ماحول تھا، آج اتنے دنوں بعد وہ تیمور کے ساتھ واپس حویلی جا رہی تھی تو بجائے خوشی کے اداسی محسوس کر رہا تھا، عجیب سی تھکن اس کے رگ وپے میں سما رہی تھی، زیادہ انہیں ائیر پورٹ چھوڑنے آیا تھا، زینب کی طبیعت کی وجہ سے تیمور نے پلین سے جانے کا فیصلہ کیا تھا، چند گھنٹوں کا سفر تھا جو ہرگز تکلیف دہ ثابت نہیں ہوا، ائیر پورٹ پہ تیمور کا ملازم گاڑی لئے ان کا منتظر تھا، کچھ دیر میں ہی جانے پہچانے منظر نگاہ کے سامنے بکھرنے لگے، فلک بوش پہاڑیاں سنہری دھوپ میں چمک رہی تھیں، ہر سو پھیلے سبزے سے بہتے جھرنے اور گرتے آبشاروں نے وہاں کی شادابی وخوبصورتی کو اجاگر کر دیا تھا، دن بہت نکھرا ہوا اور خوبصورت تھا، سیب آلوچے، خوبانی درختوں سے ٹوٹ کر گھاس پر بکھرے نظر آ رہے تھے، سامنے اونچی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر بادل دھوئیں کی صورت بکھرے نظر آ رہے تھے، سورج سرمئی پہاڑوں کے پیچھے چھپتا جا رہا تھا، سردیوں میں دن انتہائی مختصر ہوتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ دن ابھی پوری طرح چڑھا بھی نہیں اور اتر گیا، ائیر پورٹ سے حویلی تک کا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا تھا جس میں سورج دھرتی کا اجالا چھین کر غروب بھی ہو گیا تھا پہاڑی علاقوں کی مخصوص اور شدید خنکی ماحول میں اپنے پر پھیلانا شروع کر چکی تھی۔

"جہانگیر کی وائف ژالے آفریدی کا تعلق کہاں سے ہے، تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا زینب۔" تیمور خان کی دبنگ آواز پہ زینب نے چونک کر کھڑکی سے رخ اس کی جانب پھیرا، ژالے کے ذکر کے ساتھ

ہی اس کا حلق کڑوا ہوا تھا مگر تیمور کے سامنے وہ بہت محتاط ہو کر بات کرتی تھی۔

"لاہور سے بی لانگ کرتی ہیں مسز آفریدی، ژالے ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔"

"یہ رشتہ اچانک طے ہوا تھا تو ڈائریکٹ نکاح کیوں، یا تمہاری فیملی میں انگیج منٹ کو اچھا نہیں سمجھا جاتا؟" وہ عجیب سے تنفر سے کہہ رہا تھا۔

"جے کا ذاتی انٹرسٹ تھا ژالے میں، نکاح کا ڈیسیژن بھی یقیناً انہی کا ہو گا۔"

"یعنی تمہیں کچھ نہیں پتہ؟" تیمور نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا زینب گڑبڑائی۔

"میں نے یہ کب کہا؟ ژالے کا نکاح آف کورس سب کے علم میں ہے۔" وہ منمنائی تھی، تیمور کچھ دیر اسے جانچتی نظروں سے دیکھتا رہا پھر ٹھنڈا سانس بھر کے بولا تھا۔

"بہت لکی ہیں جہانگیر صاحب ہر لحاظ سے، اتنی حسین وجمیل بیوی بھی مل گئی ساتھ میں اتنا لمبا چوڑا بینک بیلنس بھی، جانتا ہوں میں مسز آفریدی کو انڈسٹری کی دنیا میں ایک جانا مانا نام ہے ان کا۔" اس کے لہجے میں عجیب سی تپش اور رقابت تھی جو زینب کو سراسر ناگوار محسوس ہوئی تھی، مگر وہ کچھ کہہ کر اسے اپنے گلے ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔

"تمہارے ہاں لڑکیوں کو پراپرٹی میں حصے دیا جاتا ہے؟" اس کے اگلے سوال پہ زینب کو عجیب سے احساس نے آن لیا۔

"بالکل دیا جاتا ہے، آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"کیوں میں نہیں پوچھ سکتا؟ بیوی ہو تم میری، کوئی بھی بات پوچھ سکتا ہوں۔" وہ سرد مہری سے کہہ رہا تھا، زینب نے چپ سادھ لی، آج ایک بار پھر اسے تیمور کی فطرت کا ایک اور رنگ نظر آیا تھا جو بلاشبہ ناگواری میں مبتلا کرنے والا تھا، آج پھر اس نے لاشعوری طور پہ تیمور کا جہان سے موازنہ کیا تھا اور جہان کا پلڑا جھکتا پا کر اس کی اپنی نظریں جھکتی جا رہی تھیں جو تاسف اور ملال تھا وہ الگ۔

☆☆☆

"مام مجھے ذرا جلدی ناشتہ دے دیں، آل ریڈی لیٹ ہو چکا ہوں۔" ایش گرے پینٹ وائٹ شرٹ میں تیار وہ عجلت میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تھا اس طرح کہ ایک ہاتھ سے دوسری کلائی پہ رسٹ واچ باندھ رہا تھا گرے کوٹ بازو پر لٹکا ہوا تھا، جنید بھائی نے اخبار کا کونہ موڑ کر چہرے کے آگے سے ہٹایا اور اسے مسکراہٹ دبا کر دیکھا۔

"لیٹ تم جیسے رومینٹک لوگ نہیں ہوں گے تو ہم ہوں گے مگر یار کوٹ تو تمہیں اندر سے ہی پہن کے آنا چاہیے تھا نا، مطلب پرنیاں سے پہن کر۔" اندر داخل ہوتی پرنیاں کا چہرا آن واحد میں سرخ پڑا تھا جبکہ معاذ نارمل تھا، یوں جیسے جنید بھائی کی بات سنی ہی نہ ہو، البتہ ایک بار پھر مما کو زور سے آواز لگائی تھی، پرنیاں جو کرسی گھسیٹ کر بیٹھ رہی تھی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"مم...... میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔" مما نے ابھی باقاعدہ اسے کام میں ہاتھ نہیں ڈلوایا تھا جبھی آج کل وہ سرے سے فارغ تھی، معاذ نے جنید بھائی کے ہاتھ سے اخبار لے لیا، گویا ہر قسم کے تاثرات محفوظ کرنے کا آسان طریقہ۔

"یار کیا کرتے ہو تمہیں آنکھ لڑانے کے لئے ایسے پردوں کی کیا ضرورت، لا ادھر مجھے اخبار دے۔"

جنید بھائی کو اس کے موڈ کی تبدیلی کا اندازہ ہی نہیں تھا جبھی سابقہ انداز میں اس سے پنگے لے رہے تھے، پرنیاں بھی دروازے تک ہی گئی تھی کہ مما ملازمہ کی ہمراہی میں چلی آئیں، بڑے ٹرے میں ناشتے کے لوازمات سجے تھے، پرنیاں نے جلدی سے ٹرے تھام لی، پھر معاذ کے لئے ناشتہ نکال کر اس کے آگے رکھا تھا۔

"سلائس پہ مکھن لگاؤں یا جیم؟" اس نے جھجکتے ہوئے انداز میں معاذ کو لحہ بھر کو دیکھ کر سوال کیا تھا، وہ جانتی تھی گھر کے سارے افراد کی نظریں ان دونوں پہ ہوتی ہیں، سب ان سے بلکہ معاذ سے سابقہ رویئے کے متقاضی تھے مگر اسے تو جیسے پرواہ تک نہیں تھی کسی کی پرنیاں ہی پردے رکھتی ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

"بٹر۔" معاذ نے چائے کا مگ اٹھاتے ہوئے مختصر جواب دیا تھا۔

"پرنیاں بیٹے آپ کالج کیوں نہیں جا رہی ہو؟ ایگزیم نزدیک ہیں آپ کے۔" پپا کے سوال پہ پرنیاں نے بے اختیار معاذ کو دیکھا جیسے اس کی رائے جاننا یا اجازت پانا چاہ رہی ہو مگر وہ بے نیازی سے ناشتے میں مشغول رہا تھا، پرنیاں اس کی لاتعلقی اور بے حسی کی مار پہ روہانسی ہونے لگی۔

"جی پپا کل چلی جاؤں گی، آج میری کوئی تیاری نہیں ہے۔" اسے پپا تو جواب دینا ہی تھا، شام کو جب معاذ کی کالج سے واپسی پہ اس نے وارڈ روب کھول کر اس کے کپڑے نکال کر واش روم میں رکھنے چاہے تھے معاذ نے بری طرح سے اسے جھڑک کر رکھ دیا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے میرے کام کرنے کی سمجھیں، بیڈ روم سے باہر تک اس تعلق کو نبھانا میری مجبوری ہے مگر اندر میں تمہیں برداشت کرنے کا ہرگز روادار نہیں ہوں، اپنے کام تک کام رکھا کرو۔" اس کی اتنی سنگ دلی اور اپنی ذلت پہ وہ کٹ کر رہ گئی، غم و غصے سے دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہونے لگا۔

"آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں معاذ۔" بھیگی آنکھوں سے وہ یہی کہہ سکی، معاذ نے جواب میں ایک پھنکارتی نگاہ اس پہ ڈالی پھر رعونت بھرے انداز میں بولا تھا۔

"تم یہی کر چکی ہو میرے ساتھ۔"

"میں معافی مانگ تو رہی ہوں آپ سے۔" اس نے زچ ہو کر کہا تھا، جواب میں معاذ نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا تھا جیسے قتل کر دینا چاہتا ہو۔

"تمہاری وہ بکواس میں مرتے دم تک نہیں بھلا سکتا، تم معافی کی بات کرتی ہو۔"

"غلطیاں انسانوں سے ہی ہوا کرتی ہیں۔" وہ پھر اپنا دفاع کرنے لگی۔

"ہاں تو کرو غلطیاں تمہیں روکا کس نے ہے۔" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑا، پرنیاں غمناک نظروں سے اسے دیکھنے لگی، پھر گھٹی گھٹی سانس بھر کے قدرے تاخیر سے سوال کیا تھا۔

"پپا کالج کا کہہ رہے تھے، چلی جایا کروں؟" ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے آگے کھڑے بال بناتے معاذ کا ہاتھ اس سوال پہ اسی زاویے پہ چند لمحے ساکن رہ گیا تھا، پھر اس کے چہرے پہ یکا یک تبدیلی آئی تھی، تمام عضلات تن کر رہ گئے، اس نے ہاتھ میں پکڑا برش زوردار آواز کے ساتھ ٹیبل پہ پھینک دیا تھا، پھر جارحانہ انداز میں اس کی جانب پلٹ کر اس کی کلائی اتنی بے دردی سے دبوچی تھا کہ پرنیاں کو اپنی ہڈی چٹختی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

"یہ فرمانبرداری و اطاعت گزاری کا ڈرامہ رچانا بند کرو سمجھیں، بہت اچھی طرح سے آگاہ ہوں تم سے، اپنی مرضی کی مالک ہو تم، وہ کیا کرو جو تمہارا دل چاہے۔" بات کے اختتام کے ساتھ ہی اس نے زوردار طریقے سے اسے پرے دھکیل دیا تھا، پرنیاں اچھل کر بیڈ پہ جا کر گری تھی، معاذ اس شدید موڈ کے ساتھ باہر چلا گیا تھا، پرنیاں کا دماغ ہی نہیں پورا وجود سنسنا رہا تھا، آنکھوں سے ایکدم لاوا بہہ نکلا، اس نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی ذلت نہیں سہی تھی، معاذ سے وابستگی کے بعد وہ یہی سمیٹ رہی تھی چاہے کس رنگ میں بھی سہی۔

☆☆☆

اگلے دن وہ معاذ کے ہمراہ ہی کالج آئی تھی، وہ ٹرین کے دو ایسے مسافر بن گئے تھے جو ایک ساتھ سفر تو کرتے ہیں مگر ایک دوسرے سے اجنبی رہتے ہیں، راستے بھر معاذ نے کوئی بات کرنا تو درکنار اسے نگاہ بھر کے دیکھنا تک گوارا نہیں کیا تھا البتہ کالج کے گیٹ پہ ہی ضرور معاذ کی بدولت اس کو خصوصی پروٹوکول ملنے لگا، لڑکے لڑکیاں انہیں روک روک کر شادی کی مبارک باد دیتے اور وش کرتے رہے تھے، پرنیاں کچھ کنفیوژ ہو رہی تھی جھینپ رہی تھی جبکہ معاذ کا انداز ویسا ہی پر اعتماد باوقار اور شاندار تھا، وہ رکے بغیر چلتے چلتے ہی اس جم غفیر کے جوش و خروش کے مختصر ترین لفظوں میں جواب دیتا اسٹاف روم کی سمت چلا گیا تھا، پرنیاں وہاں سے اپنی کلاس کی جانب آتی ثنا کو ڈھونڈتی رہی، لڑکے لڑکیوں کی بے شمار نگاہوں کا مرکز بنی وہ اچھی خاصی کنفیوژ ہو چکی تھی، وہی کالج تھا مگر وہی سب کچھ اس کے لئے ماحول تبدیل ہو گیا تھا، وہ جہاں بھی جا رہی تھی نظریں ساتھ ساتھ سفر کرتی تھیں اور جہاں ایک سے زائد نفوس ہوتے اس کی سمت اشارہ کر کے کچھ نہ کچھ دھیمی آواز میں کہا جا رہا تھا۔

پرنیاں چند لمحوں میں ہی گھبرا گئی، بات یہ نہیں تھی کہ اس میں اعتماد نہیں تھا، بات یہ تھی کہ معاذ نے اس کا اعتماد بحال نہیں رہنے دیا تھا، سنگی بینچ پہ بیٹھ کر اس نے سیل فون اپنے بیگ سے ڈھونڈ کر نکالا اور ثنا کا نمبر پش کیا، کتنی عجیب تھی یہ بات کہ اتنے دنوں میں اسے پہلی بار ثنا کی یاد آئی تھی وہ بھی کالج آ کر اسے تو پرنیاں کی شادی میں بھی آنا تھا مگر وہ شریک ہی نہیں ہوئی تھی، حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ وہ سب کچھ بھول گئی تھی، ثنا کا نمبر بند جا رہا تھا، وہ مضطرب ہونے لگی، کلاس کے دوران اس نے ایک لڑکی سے ثنا کے متعلق استفسار کیا تھا، اس کے یہ بتانے پہ کہ ثنا پچھلے کئی دنوں سے کالج نہیں آ رہی اس کی تشویش بڑھنے لگی تھی، اس نے اپنے سیل سے ہاسٹل رابطہ کیا تھا، وارڈن سے علیک سلیک کے بعد اس نے بے صبری سے ثنا کے بارے میں سوال کیا تھا۔

وہ تو آپ سے ایک دن بعد ہی اپنے گھر واپس چلی گئی تھیں، بہت ایمر جنسی میں بلوایا تھا ان کی فیملی سے دوبارہ کوئی کانٹیکٹ نہیں ہوا۔

وارڈن اسے شادی کی مبارک باد دینے لگیں، پرنیاں نے بے دلی سے چند باتیں کیں پھر فون بند کر دیا، اس کا دن بے زاری کے عالم میں گزرا تھا، معاذ کی کلاس کے دوران بھی وہ زیادہ غائب دماغ رہی، چھٹی کے وقت وہ گیٹ کی طرف جانے والے راستے پہ آ گئی تھی، تا کہ معاذ اسے آسانی سے دیکھ لے، مگر اس کا انتظار طویل ہونے لگا تھا، پرنیاں نے تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کے بعد اس کے سیل پہ ٹرائی کیا تھا،

بیل بجتی رہی مگر وہ فون پک نہیں کر رہا تھا پرنیاں کا دل عجیب سی وحشت اور گھٹن کا شکار ہونے لگا، پتہ نہیں

وہ دانستہ اگنور کر کے بدلا لے رہا تھا یا واقعی مصروف تھا، دوسری سے تیسری مرتبہ جب ٹرائی کرتی وہ روہانسی ہو رہی تھی، تب معاذ کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

''واٹ نان سنس، کیا افتاد آپڑی ہے تم پہ آخر؟''

''آپ مجھے کالج چھوڑ کر کہاں چلے گئے ہیں، اکیلی بیٹھی ہوں میں۔'' وہ واقعی ہی رو پڑی تھی۔

''یہ تمہاری اپنی پالی ہوئی مصیبت ہے، میں نے ٹھیکہ نہیں لیا تھا تمہارا اور رووَ مت، ابھی مرا نہیں ہوں یہ آنسو ایسے وقت کے لئے سنبھال رکھو۔'' وہ بھڑک اٹھا تھا، اس کا لہجہ گو کہ دھیما تھا مگر نرمی اس میں نام کو نہیں تھی۔

''فار گاڈ سیک! مت کہیں ایسے۔'' وہ بے اختیار دہل گئی تھی، معاذ جھلایا۔

''آپ مجھے لینے کب آرہے ہیں؟'' پرنیاں نے بھیگی آواز میں پوچھا۔

''کچھ ویٹ کرو آجاتا ہوں۔'' وہ رکھائی سے کہہ کر سلسلہ کاٹ گیا تھا، پھر اگلے پندرہ منٹ مزید کلسنے کے بعد چوکیدار معاذ کا پیغام لایا تھا کہ گاڑی میں اس کا منتظر ہے۔

''اگر آپ نے مجھے یونہی خوار کرنا ہے تو میں کل سے کالج نہیں آؤں گی۔'' گاڑی میں بیٹھنے کے بعد پرنیاں نے بے ساختہ غصے سے کہا تھا، جواباً معاذ نے مغرور سے انداز میں کاندھے اچکا دیئے وہ کلس کر رہ گئی تھی، گھر واپس آکر وہ معاذ کی طرح سیدھی اپنے کمرے میں نہیں گئی، مما کے پاس آگئی۔

''کیسا گزرا کالج میں پہلا دن بیٹے؟'' انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا، وہ جھک کر جوتے اتار رہی تھی گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

''یہ پہلا دن کہاں تھا مما!''

''شادی کے بعد تو پہلا ہی تھا۔'' مما اس کی سادگی پہ مسکرا دی تھیں، وہ خفیف سی ہو گئی۔

''سب ہی وش کرتے رہے، مگر شا نہیں ملی مجھے۔'' اس کے لہجے میں یاسیت گھل گئی۔

''معاذ آپ کو کھانا کھلانے لے گیا تھا؟'' مما کے سوال پہ اس کا سر بے ساختگی میں نفی میں ہل گیا۔

''بیٹے آپ کے پپا چاہتے ہیں آپ اور معاذ کہیں گھومنے چلے جاؤ۔'' مما کی بات پہ پرنیاں کے چادر اتارتے ہاتھ اسی زاویے پہ ساکن ہو گئے تھے، مما نے بغور اسے دیکھا تھا۔

''کیا بات ہے آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟'' مما کے سوال پہ وہ گڑبڑا سی گئی۔

''میری اسٹڈی......''

''چند دنوں کی تو بات ہے بیٹے، معاذ ہے نا کور کرا دے گا آپ کو، یہ دن بار بار لوٹ کر تھوڑا ہی آتے ہیں۔'' مما نے رسان سے قائل کرنا چاہا تو پرنیاں نے ہونٹ کا کونہ دانتوں تلے داب کر سر جھکا لیا تھا۔

''آپ ان سے بات کر لیجئے گا مما! آئی تھینک وہ کالج اور ہاسپٹل سے اتنی طویل غیر حاضری پہ آمادہ نہیں ہوں گے۔''

''آپ فکر نہ کرو بیٹے، معاذ سے احسان خود بات کر لیں گے، آپ یہ بتاؤ معاذ خفا ہے آپ سے،

پرنیاں بیٹے میں ماں ہوں، میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا نا کہ میں معاذ کو بہت اچھے طریقے سے جانتی ہوں، کوئی بات ہے ضرور آپ کے بیچ وہ بہت بدل سا گیا ہے، آپ بھلے مجھے نہ بتاؤ مگر پلیز اس خفگی کو ضروری دور کر لو، اچھی بیویاں اپنے شوہر کو زیادہ عرصہ خود سے ناراض نہیں رہنے دیا کرتیں، مرد کو اگر توجہ اور محبت مکمل نہ ملے تو وہ گھر سے باہر رہنا سیکھ جاتے ہیں، باہر اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے عادی ہو جایا کرتے ہیں، یہیں سے آشیانوں کے بکھرنے کا آغاز ہوتا ہے، مجھے معاذ ہی نہیں آپ بھی عزیز ہو، میں کبھی نہیں چاہوں گی آپ کو دکھ ملے، آپ مجھے ہمیشہ مسکراتی ہوئی اچھی لگی ہو اور ایسا تب ہی ہوتا ہے جب دل خوش ہو، دل کی خوشی معاذ سے مکمل ہوتی ہے نا آپ کی؟''

انہوں نے اپنی بات کے اختتام پہ رک کر تائید چاہی تھی، پرنیاں جو گم صم سی بیٹھی تھی ہڑبڑا سی گئی، پھر ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر عقیدت بھرے انداز میں چوما تھا اور آنکھوں سے لگایا۔

''دوا کے بعد وہ میری زندگی میں آنے والے واحد مرد ہیں مما جن سے میں نے پوری سچائی اور شدت سے محبت کی ہے، ان کے تمام تر ناروا سلوک کے باوجود، آپ فکر نہ کریں، میں انہیں منا لوں گی۔'' دھیمے لہجے میں بات کرتی وہ آخر میں مسکرائی تھی، مما آسودگی سے مسکرا دیں۔

☆☆☆

معاذ نے اپنے معمول کے کام نپٹائے تھے پھر لیکچر کی تیاری میں مشغول ہو گیا، پرنیاں نے اس کے لئے چائے کا مگ رکھتے ہوئے گریزاں نظروں سے دیکھا تھا، جو اس کے تیور تھے بہت کم امید تھی وہ اس کی بات سنتا مگر کوشش تو بہر حال کرنی تھی، مما سے وعدہ کر چکی تھی وہ۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔'' نظریں جھکاتے انگلیاں چٹخاتی ہوئی وہ بڑی آہستگی سے گویا ہوئی تو معاذ نے مصروف سے انداز میں سرسری سی نگاہ اٹھا کر لمحہ بھر کو اسے دیکھا۔

''پڑھنے کی بات مت کرنا، میں ایکسٹرا ٹائم دینے کے چونچلے نہیں برداشت کر سکتا۔'' وہ نروٹھے پن سے بولا تھا، پرنیاں کے دل پہ چوٹ پڑی، اسے یقین نہیں آسکا یہ وہی معاذ ہے جو اس سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈا کرتا تھا، جب دیکھتا تھا تو آنکھیں سیراب نہیں ہوئی تھیں، کوئی اتنا بھی بدل سکتا ہے، وہ تو نہیں بدل سکتی تھی، اس کا غصہ ہمیشہ وقتی ہوا کرتا تھا، وہ ہمیشہ اس کی منتظر رہی تھی اور جب وہ اس کی جانب پلٹا تو اندر سے کیسے مطمئن ہو گئی تھی اور اوپر اوپر سے اس کی حرکتوں سے وہ کتنا ہی جھنجلاتی رہی مگر......

''فرمایئے کیا بات ہے؟'' معاذ نے اسے گھورا تو اس کی لایعنی سوچیں تھم سی گئیں۔

''بات یہ نہیں ہے۔'' وہ مضطرب ہوئی، معاذ نے چائے کا مگ اٹھا لیا۔

''ک...... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ میری اس بدتمیزی کو بھول جائیں، میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں، معاذ پلیز مجھے......''

''کیا سمجھوں میں تمہاری اس بات سے کہ تم میری اس طرح منتیں کیوں کر رہی ہو؟ یہ کہ تم سے اپنے جذبات سنبھالے نہیں جا رہے، تمہیں یاد ہے تم نے مجھے ہوس پرست کہا تھا، میں تو اس الزام کو غلط ثابت

کرنے کی کوشش میں تم سے دور ہٹ گیا، بھیں کیا ہوا؟ تم وہ کیوں ثابت نہ ہوتیں جو تم نے خود کو ظاہر کیا تھا، تمہاری وہ پارسائی محض ڈھونگ تھی، ورنہ حقیقتاً تم نیلما جیسی نفس پرست عورتوں سے ہرگز بھی الگ نہیں ہو، جو اس نفس کی تکمیل کی خاطر ذلت کو ہنس کر سہتی ہیں، کیا سمجھتی ہو تم؟ ہے کوئی فرق تم میں اور اس میں؟''

الفاظ تھے یا برچھیاں، کوئی بلاسٹ ہوا تھا اور اس کا وجود بکھر گیا تھا، اسے لگا تھا کسی نے اسے جہنم میں دھکیل دیا ہو، اس درجہ سفاکی اور تضحیک آمیز سلوک پہ وہ پتھرا سی گئی تھی، اپنی کڑواہٹ اس پہ نکال کر معاذ خود کمرے سے نکل گیا تھا مگر پرنیاں وہیں بیٹھی تھی، رنگت پیلی اور ہونٹ تشنج زدہ انداز میں کانپتے رہے، وہ ذبح ہوتے جانور کی طرح جانکنی کے عالم میں تھی گویا، نہ تکلیف ٹلی تھی نہ موت آئی تھی اس پہ اپنا قہر نکال کر باہر نکلا ہوا معاذ ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو وہ صوفے پہ گھٹنوں میں سر دیئے سسک رہی تھی، معاذ نے اس پہ نگاہ ڈالے بغیر لائٹ آف کر دی اور خود سونے کو لیٹ گیا، تشویش اسے اس وقت ہوئی تھی جب صبح وہ معمول کے مطابق اٹھا وہ تب بھی اس پوزیشن میں اس جگہ پہ موجود تھی، ایک لمحے کو وہ اس کے پاس رکا پھر سر جھٹک کر باہر چلا گیا، اس کی بلا سے یہ جیتی یا مرتی اسے قطعی پرواہ نہیں تھی۔

☆☆☆

ممانے معاذ سے پرنیاں کے متعلق استفسار کیا، جس کے جواب میں وہ انہیں اس کے سونے کا بتا کر خود کالج چلا گیا، تب مما کے ہونٹوں پہ مسکان بکھر گئی تھی، وہ سمجھی تھیں پرنیاں اور معاذ کی آپس میں صلح ہو گئی ہے، معاذ کا رویہ نارمل تھا، جس سے وہ یہی اندازہ قائم کر سکیں، مگر جب دس بجے تک پرنیاں کمرے سے نہ نکلی تب مما کو فطری سی تشویش ہوئی تھی، ملازمہ کو اس کے کمرے میں بھیجا جو اس پیغام کے ساتھ آئی تھی کہ پرنیاں بخار میں پھنک رہی ہے، مما سب کچھ بھولے بھاگم بھاگ اس کے بیڈ روم میں آئیں اور پرنیاں کی حالت دیکھ کر ان کے ہاتھ پیر پھولنے لگے تھے، وہ ہوش وخرد سے بیگانہ لگ رہی تھی، انہوں نے پرنیاں کو ہوش میں لانے کی اپنی سی تدبیریں کی تھیں، ان کے ساتھ مما جان اور بھابھی بھی اس کے کمرے میں چلی آئی تھیں۔

''بچی کو بخار تھا تو معاذ نے بتایا کیوں نہیں، غضب خدا کا بچی کی اتنی حالت خراب ہے اور صاحبزادے کالج چلے گئے ہماری جانے بلا کہ بہو اتنی دیر سے کمرے سے کیوں نہیں نکلی، معاذ اتنا کیئر لیس کیسے ہو گیا بھلا؟ ایسی ڈاکٹری بھاڑ میں جھونکنی ہے جس کا اپنوں کو فائدہ نہیں۔'' مما جان کو بہت کم غصہ آتا تھا مگر پرنیاں کی حالت نے انہیں جیسے حواس باختہ ہی نہیں غصے سے بے قابو بھی کر دیا تھا۔

''اسما نمبر ملاؤ ذرا معاذ کا، فون مجھے دینا۔'' پرنیاں کو ذرا سی ہوش آئی تھی، اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر مما جان کی جان میں جان آئی، بھابھی نے ساس کے حکم کی تعمیل میں دیر نہیں کی اور معاذ کا نمبر جھٹ ملا کر سیل مما جان کو تھما دیا، انہوں نے رابطہ بحال ہوتے ہی معاذ کے لتے لینے شروع کر دیئے تھے، ادھر یقیناً معاذ کا موڈ خراب ہوا تھا کہ اس کے کسی جواب پہ مما جان کا غصہ ساتویں آسمان پہ جا پہنچا۔

''میں نے کہہ دیا ہے نا معاذ تم خود فوراً گھر آؤ، زیاد کو بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے تمہاری مجبوریوں کا نہیں پتہ، یہاں ہم کتنے پریشان ہیں تمہیں اندازہ ہے؟ آپ اتنے لاپرواہ ہو گے مجھے تو یقین نہیں آرہا اور یہ......''

''ہیں ہیں فون بند کر دیا؟ کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو؟'' مما جان تو ششدر ہو کر رہ گئیں تھیں، جبکہ مما کی رنگت متغیر ہو چکی تھی، پرنیاں کی حالت معاذ کا رویہ خود بخود ساری کہانی سنا رہا تھا، وہ ہر لمحہ سرد پڑتی جا رہی تھیں، مما جان کو اتنا غصہ آیا تھا کہ انہوں نے پرنیاں کو گاڑی میں قریبی کلینک لے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس پر عمل درآمد بھی کر رہی تھیں مگر اسی پل سرد تاثرات سے سجے چہرے کے ساتھ معاذ چلا آیا تھا۔

''اب بھی کیوں آ گئے بیٹے؟ ہم عورتیں کسی نہ کسی طرح بچی کو لے ہی جاتیں۔'' انہوں نے معاذ کو دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

''ایسی کیا یہاں پہ مصیبت پڑ گئی تھی، مجھے تو آپ کی بہو صاحبہ اچھی بھلی لگ رہی ہیں، آپ نے تو اس طرح ایمرجنسی نافذ کی جیسے......''

''ہاں بولو نا...... چپ کیوں کر گئے بیٹے۔'' مما جان اس کے لال بھبھوکا غیض وغضب سے دہکتے چہرے کو دیکھ کر متاسف ہو کر بولیں، معاذ نے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ زور سے جھٹکا تھا پھر آگے بڑھ کر پرنیاں کی سمت آ گیا، وہ کسی قدر ہوش میں تھی اور سب کچھ سن رہی تھی، رنگت بخار کی حدتوں کے باعث انگارہ ہو رہی تھی، ایک ہی رات میں وہ یوں نچڑ گئی تھی جیسے خون کی آخری بوند بھی نچوڑ گئی ہو، ایک لمحے کے لئے تو معاذ بھی دھک سے رہ گیا تھا۔

(بس اتنی ہی ہمت تھی پرنیاں بیگم الفاظ کی تلوار سے کوئی کیسے قتل ہوتا ہے اب تمہیں پتہ چل گیا ہو گا، میں بھی یہی چاہتا تھا تمہیں احساس دلاؤں کیا کیا ہے تم نے میرے ساتھ)۔

بے جان مٹی کی طرح پڑی پرنیاں کا معائنہ کرتے وہ زہر آلود ذہن سے سوچتا رہا تھا، پرنیاں نے آنکھیں پھر بھی نہیں کھولی تھیں ہاں البتہ اس کے لمس کو محسوس کر کے ضرور اس کے وجود میں کوئی تبدیلی اگر پیدا ہوئی تھی تو وہ خاموش آنسوؤں کا بہنا تھا، معاذ کے اندر لگی آگ کچھ اور بھڑ کنے لگی۔

''انہیں کچھ کھلانے کے بعد یہ میڈیسن دے دیجئے گا بھابھی! آرام کریں گی تو طبیعت سنبھل جائے گی۔'' بھابھی کو میڈیسن کے ساتھ ہدایات دیتے معاذ کی نگاہ ہنوز گم صم بیٹھی مما پہ پڑی تھی تو ایک لمحے کو خاموش سا ہو گیا۔

''آپ لوگ آخر اتنے پریشان کیوں ہیں مما! کچھ نہیں ہو گا انہیں۔'' وہ جتنا جھنجھلایا تھا اسی لحاظ سے تپ کر بولا تھا، مما نے ایک نظر اس کے سرد چہرے کو دیکھا تھا پھر آہ بھر کے بولی تھیں۔

''ہم نے آپ سے تو کچھ نہیں کہا بیٹے! آپ جاؤ، آپ کا بہت حرج ہو رہا ہے نا۔'' الفاظ کے برعکس ان کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور بے پناہ دکھ کی آمیزش بھی، معاذ نے گہرا سانس بھر کے اپنی جھنجھلاہٹ کو دبایا تھا پھر آہستگی سے کاندھے جھٹک دیئے تھے اور کچھ کہے بغیر پلٹ کر باہر نکل گیا، مما کو شاید اس سے اسے درجہ بے حسی اور لاتعلقی کی توقع نہیں تھی، سر جھکا کر آنسو بہانے لگیں، بے دم سی پڑی پرنیاں عجیب سے مجرمانہ احساس میں گھرتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

اس رات تو کیا معاذ اس سے اگلی رات بھی گھر نہیں آیا تھا، زیاد کے ذریعے انہیں بھی یہ بات پتہ

چل گئی تھی کہ ملیر کے علاقے میں اسکول میں بلاسٹ ہوا تھا، بیشتر زخمی بچوں اور اساتذہ کو وہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرایا گیا تھا اور معاذ اسی وجہ سے گھر نہیں آپا رہا تھا، زیاد بھی زیادہ وقت ہاسپٹل کو دے رہا تھا مگر معاذ نے تو مما کے خیال میں حد کر دی تھی، مما اور مما جان کا خیال تھا وہ دانستہ ایسا کر رہا تھا۔

"یقیناً برا مانا ہے اس نے ہماری بات کا۔" مما جان کا غصہ تمام ہوا اور فکر لگ گئی جو مما کو ایک آنکھ نہیں بھا سکی۔

"ہاں تو کرے، یہاں پروا کسے ہے، میں تو بات بھی نہیں کروں گی اس سے، احسان سچ کہتے تھے، ہماری اتنی اہمیت اسے بگاڑ چکی ہے، بے کوئی بات کرنے کی، بچی کن حالوں کو پہنچ گئی اسے پرواہ ہی نہیں۔" انہوں نے پرنیاں کا زرد چہرا دیکھ کر غصے بھرے انداز میں کہا تھا، انہیں تو یہ بات بھولی نہیں تھی جب کل رات کے استفسار پہ پرنیاں کچھ کہے بغیر ان سے لپٹ کر رو دی تھی اور بس ایک فقرہ کہا تھا۔

"مجھ سے کچھ مت پوچھیے گا مما! پلیز۔" اور مما گنگ ہونے لگی تھیں، ایسا کیا ہوا تھا ان کے بیچ کہ وہ یوں ہمت ہار گئی تھی، انہیں زندگی میں پہلی بار معاذ پہ شدید تاؤ آیا تھا، اگلی صبح ہی معاذ واپس آسکا تھا، شکن آلود لباس بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ انگارہ ہوتی آنکھیں، صاف لگتا تھا ان پینتیس چھتیس گھنٹوں میں اس نے ایک منٹ کو بھی آنکھ نہیں جھپکی ہوگی، اس کی اپنے پیشے سے محبت اور اخلاص سے بھی آگاہ تھیں، کتنے روپ تھے اس کے اور وہ ہر روپ میں پہلے سے الگ تھا جدا تھا، مگر انہیں تو ہمیشہ پیارا ہی لگا تھا، ایک بار پھر انہیں اپنا غصہ اور خفگی ڈھلتی محسوس ہوئی تھی، جب اس نے آتے ہی اپنی تھکن کی پرواہ کیے بغیر مما جان کے گلے میں بازو حمائل کیے تھے۔

"سوری مما جان اس دن میں آپ سے گستاخی کر گیا تھا۔" اور مما جان تو فدا ہو گئی تھیں اس لوٹ لینے والے انداز پہ، پیشانی چوم کر اس کے بالوں کو سنوارا۔

"نہ بیٹے میں تو خفا نہیں ہوں، بس تو پرنیاں کی طرف سے ہمیں شکایت کا موقع نہ دینا، بن ماں باپ کی بچی ہے، دل میں بہت حساس ہے۔"

"جی بہتر۔" نہ کوئی تسلی نہ وعدہ بس محض سر ہلا کر ایک چھوٹا سا فقرہ ادا کر دینا مما جان کی تشفی نہیں کرا سکا۔

"بیٹے پرنیاں کو بھی ایسے ہی منا لو جا کے۔" انہوں نے اب کے لجاجت سے کہا تھا، زیاد کی ہنسی چھوٹنے لگی۔

"غور کریں لالے، مما جان پابند کر رہی ہیں آپ کو، ایسے ہی یعنی محض گلے لگانا ہے آپ نے...... اس سے آگے پابندی۔" زیاد کھی کھی کر رہا تھا، معاذ نے ان سنی کر دی، پھر مما کو دیکھ کر بولا تھا۔

"بہت اسٹرانگ قسم کی چائے تو بھجوا دیں مما، میں شاور لے لوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، اپنے کمرے میں آیا تو اس وقت بھی پرنیاں بستر پہ دراز تھی، ان چند دنوں میں اس کی صحت اتنی تیزی سے گری تھی کہ صدیوں کی مریض نظر آنے لگی تھی، زرد چہرا آنکھوں تلے موجود، گہرے حلقے، آنکھوں کی وہ چمک دمک بھی غائب تھی جن میں ہزاروں دیئے جھلملایا کرتے تھے، آہٹ پہ اس نے چونکتے ہوئے گردن موڑی تھی اور معاذ کو دیکھ کر اس کے چہرے پہ ایک سایہ سا لہرایا تھا، اگلے لمحے وہ خود کو سنبھال کر اٹھی تھی،

پہلے اپنا دوپٹہ اٹھایا پھر بالوں کو سمیٹ کر کیچر میں مقید کیا اور بستر سے اتری، اس سے قبل کہ وہ اسی دن کی طرح ذلیل کر کے اٹھاتا وہ خود اٹھ جانا چاہتی تھی، معاذ اس کی سمت متوجہ نہیں تھا، کوٹ اتارنے کے بعد کلائی پہ بندھی رسٹ واچ ہاتھ سے نکال کر ڈریسنگ پہ رکھتے اس کی نگاہ آئینے میں نظر آتے پرنیاں کے وجود پہ جا ٹھہری، اگلے لمحے وہ گھبرا کر تیزی سے پلٹتے ہوئے اس کی جانب لپکا، وہ شاید بیڈ سے اتر کر صوفے تک آنا چاہتی تھی، نقاہت تھی یا کچھ اور کہ وہ ایک سے دوسرا قدم نہیں اٹھا سکی معاذ اگر اسے بروقت نہ سنبھال لیتا تو اب تک وہ زمین بوس ہو چکی ہوتی، اس کے چہرے پہ ایک نگاہ ڈال کر ہی معاذ خود چکرا سا گیا تھا، وہ بری طرح کھانس رہی تھی ساتھ ہی اس کے ہاتھوں سے نکلنے کو مزاحمت بھی گو کہ یہ مزاحمت بہت کمزور قسم کی تھی، معاذ نے کچھ کہے بغیر بھینچے ہوئے ہونٹوں سے اسے لا کر پھر سے بستر پہ لٹا دیا تھا وہ جیسے مچل سی گئی تھی۔

"چھوڑیں مجھے۔" اس کا گلا بھرا سا گیا، بخار ابھی تک اس کے وجود کو حدتیں بخشے ہوئے تھا۔

"کیا ہو گیا ہے، پاگل ہو گئی ہو تم؟ حالت دیکھی ہے اپنی۔" وہ دبے ہوئے لہجے میں چیخا، حقیقت یہ تھی کہ تمام تر انا اور ضد کے باوجود پرنیاں کا یوں حال سے بے حال ہو جانا سے زیادتی کے احساس کے کچوکے لگا رہا تھا۔

"آپ کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے، میں مروں یا جیوں۔" پرنیاں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے کی جانب دھکیلتے ہوئے کہا۔

"سلیف یور کنٹرول مس پرنیاں، کیا ہوا ہے؟ کس بات کا اس قدر واویلا ہے بھلا؟ بتانا پسند کریں گی؟ کیا آپ کو لگتا ہے جو کچھ میں نے آپ سے کہا وہ غلط تھا۔" پرنیاں نے آنسوؤں سے جل تھل ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا، اس کے طنزیہ مضحکہ اڑاتے انداز نے پرنیاں کے اندر پھر سے آگ دہکا دی۔

"شٹ یور ماؤتھ، اگر آپ نے پھر ایسی کوئی بات کی تو انجام کے ذمہ دار بھی آپ ہوں گے میں بتا رہی ہوں۔" اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا، تنبیہی انداز لئے ہوئے تھا اس کے باوجود معاذ بھڑک سا اٹھا۔

"دھمکا رہی ہو مجھے؟ میں جو کہہ چکا اس سے ایک انچ بھی اپنی رائے تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔" معاذ کی اس ہٹ دھرمی یا دوسرے لفظوں میں پرنیاں کی تذلیل نے پرنیاں کے اندر سے سراتے ہیجان کو کچھ اور بڑھاوا دیا تھا، کچھ کہے بغیر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اور سرخ چہرے کے ساتھ آگے بڑھ کر فروٹ کی ٹوکری سے چھوٹی مگر انتہائی تیز دھار کی چھری جھپٹ کر اٹھا لی، پلک جھپکنے میں بھی دیر لگتی ہو گی مگر اس نے اس سے پہلے انتہائی بے دردی سے داہنے ہاتھ میں پکڑی چھری سے بائیں ہاتھ کی رگ کاٹ ڈالی تھی بھل بھل بہتے خون نے سرعت سے اس کے کپڑوں کے بعد کارپٹ کو رنگین کرنا شروع کر دیا۔

(جاری ہے)

عورت، عزت اور محبت

کنول ریاض

وہ گرمیوں کی ایک خوشگوار شام تھی کچھ دیر برسنے والی بارش نے ماحول کو تر و تازگی بخشی تھی مٹی کی سوندھی خوشبو چاروں اور پھیلی تھی اور اس سوندھی خوشبو میں گلاب موتیے اور گیندے کی خوشبوئیں مل کر اسے انوکھے جذبوں سے روشناس کروا رہی تھیں جبھی تو گہرے گلابی لہنگے میں سجی سنوری بحر کا چہرہ بھی لہنگے کے ہمرنگ ہو رہا تھا وہ کوئی پہلی بار دلہن بننے والی کنواری الہڑ دوشیزہ نہ تھی بلکہ ایک مطلقہ عورت تھی لیکن خوشی کا تعلق تو دل سے ہوتا ہے جب ہی تو من پسند ساتھی کو پانے کی خوشی اس کے انگ انگ سے نمایاں تھی۔

آج سے چار سال قبل جب وہ محض اٹھارہ برس کی تھی تو اس کے ساتھ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا تھا سو ایسے میں اسد کے لئے دل میں پنپتے جذبوں کو پس پشت ڈال کر وہ سجاد کے سنگ رخصت ہو کر آئی تھی، ساس سسر عرصہ پہلے وفات پا گئے تھے ایک نند تھی وہ بھی شادی کے بعد ہفتہ بھر ٹھہری اور پھر گھر گرہستی بحر کے سپرد کر کے اپنے گھر سدھاری ادھر سجاد کی چھٹیاں بھی ختم ہو چکی تھیں، وہ بھی صبح سوا سات تک گھر سے نکل جاتا تھا اور پھر اس کی واپسی تک بحر گھر کے کاموں میں مصروف رہتی کام تھا ہی کتنا دو ہی تو لوگ تھے وہ لیکن پھر بھی خود کو مصروف رکھنا مقصود تھا کہ فارغ بیٹھنا بحر کی فطرت میں نہ تھا۔

سجاد ہر طرح سے بحر کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا تھا، نرم و نازک گڑیا سی بحر میں گویا اس کی جان تھی، اس کی یہ ہی کوشش ہوتی کہ بحر ہر پل اس کی آنکھوں کے سامنے رہے جب ہی تو وہ بحر کو میکے بھی کم کم ہی جانے دیتا تھا، شادی کے ابتدائی دنوں میں اپنے لئے سجاد کی دیوانگی بحر کو مسحور کر دیتی لیکن آہستہ آہستہ اسے یہ بے جا پیار کھلنے لگا تھا، بازار، محلے یا کسی عزیز رشتہ دار کے گھر جانا ہوتا تو سجاد ہی اسے لے کر جاتا تھا معاملہ یہاں تک ہی رہتا تو ٹھیک تھا لیکن بحر کے میکے بھی سجاد اس کے ساتھ ساتھ ہوتا اور دونوں اکٹھے ہی وہاں سے آتے تھے کیونکہ سجاد بحر کو رات رکنے نہیں دیتا تھا اور یہی بات بحر کو کھلتی تھی۔

شادی کو کچھ عرصہ مزید گزارا تو سجاد کی شخصیت کا ایک اور پہلو بحر کے سامنے آیا اور وہ سجاد کی طبیعت کا شکی پن تھا، لیکن یہ شک بحر پہ نہیں تھا بلکہ ہر اس مرد پہ تھا جن سے سجاد یا بحر واقف تھے اور عموماً یہ مرد عزیز رشتہ دار ہی تھے اور ان میں سجاد کی نظر میں بڑے چھوٹے کنوارے یا شادی شدہ کی کوئی تخصیص نہ تھی اگر محرم رشتوں کی وضاحت قرآن سے واضح نہ ہوتی تو سجاد صاحب کا بس نہ چلتا کہ ان سے بھی بحر کا ملنا جلنا بند کروا دیتے، سجاد کی اس عادت کو دیکھتے ہوئے عزیز رشتہ دار خود ہی محتاط ہو گئے تھے کیونکہ وہ ان کے بیٹھے ہونے کا بھی لحاظ نہ کرتا تھا اور کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ جاتا کہ بحر بھی نظریں چرانے پہ مجبور ہو جاتی ایک آدھ واقعہ کے بعد بحر خود بھی محتاط ہو گئی تھی لیکن اسے سجاد کی ضدی طبیعت پہ بھی تو اختیار نہ تھا ذرا سی بات بھی سجاد کی مرضی کے خلاف ہوتی تو وہ اس بات کا بھی لحاظ نہ کرتا کہ کوئی مہمان بیٹھا ہے یا وہ دونوں خود کسی کے ہاں مہمان ہیں سجاد وہیں لمحوں میں بحر کی طبیعت صاف کر دیتا، اگرچہ بعد میں بحر کی ناراضگی پہ معافی مانگ کر اسے منا لیتا تھا لیکن بحر اپنے اندر کی اس خوددار عورت کا کیا کرتی جو اپنی بے قدری پہ تڑپ تڑپ جاتی تھی سجاد کے اکیلے میں منانے پر وہ اوپری دل سے مان تو جاتی تھی لیکن دوسروں کے سامنے ہر بار کسی نہ کسی بات پہ ہونے والی بے عزتی اسے بھلائے نہ بھولتی تھی اور شادی کو اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ سجاد کی اس عادت

سے سمجھوتا نہ کر پائی تھی۔

اکثر وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ سجاد جس قدر اس سے محبت کرتا ہے اس سے ایک چوتھائی عزت بھی دے دیتا تو ہجر کی زندگی میں فقط خوشیاں ہی خوشیاں ہوتیں۔

سجاد کی شکی، ضدی اور صرف اپنی بات منوانے والی خود غرضانہ طبیعت سے سمجھوتہ کرنے والی ہجر اس کی اس طبیعت سے سمجھوتہ نہ کر پائی تھی جب ہی تو وہ سجاد سے اکھڑی اکھڑی رہنے لگی تھی اور پھر سجاد کی ضد میں وہ اکثر اس کے منع کرنے کے باوجود وہی کام کرتی جو ہجر کا من کرتا تھا سجاد اس کی ان باتوں سے چڑنے لگا تھا اور رفتہ رفتہ اس سرد جنگ نے دونوں کو اس حد تک ایک دوسرے سے متنفر کر دیا کہ ایک دن غصے میں سجاد نے سوچے سمجھے بغیر ہجر کو طلاق دے دی اس لمحے ایک پل کو ہجر ششدر رہ گئی کہ جو کچھ بھی ہو کم از کم اس نے اس حد تک نہیں سوچا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا بچہ کوئی تھا ہیں جو دونوں کو ایک دوسرے سے باندھے رکھتا، یا کسی ایک فرد کو جھکنے پر مجبور کر دیتا ایسے میں اس نوبت کا آ جا کچھ ایسا عجب بھی نہ تھا۔

ہجر کے والدین اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے شادی کے محض تین سال بعد مطلقہ ہونے والی بیٹی کا غم انہیں رفتہ رفتہ گھائل کرنے لگا تھا اور اکیس سال کی عمر کچھ اتنی زیادہ بھی تو نہ تھی اس عمر میں تو اکثر لڑکیوں کے رشتے بھی طے نہ ہو پاتے تھے، کجا کہ شادی اور پھر طلاق، لیکن قدرت نے زیادہ عرصہ انہیں اس غم میں گھلنے نہیں دیا تھا اور ہجر کی عدت گزرنے کے مہینہ بھر بعد ہی اس کی تائی نے ہجر کو اپنے بیٹے اسد کے لئے مانگ لیا، وہی اسد جس کے سپنے کبھی ہجر نے اپنی آنکھوں میں سجائے تھے لیکن ان کے پھلنے پھولنے سے پہلے ہی ہجر کو ان سپنوں کو ہی اپنی آنکھوں سے نوچ کر پھینکنا پڑا تھا اور اب یوں اچانک یہ بات شروع ہونے پہ ہجر کے دل کے کسی کونے میں بھولی بسری اسد کی محبت یوں سے عود کر سامنے آ گئی اور اپنے دل کی خواہش کے پورا ہونے پر وہ خوشی سے پاگل ہونے کو تھی اسد کی شادی کے سال بھر بعد اس کی بیوی پہلے بچے کی پیدائش پر وفات پا گئی تھی ماں کے ساتھ بچہ بھی دنیا سے منہ موڑ گیا تھا، بیوی کی محبت میں گرفتار اسد نے اب تک دوبارہ شادی نہ کی تھی لیکن جب ہجر کے لئے اس کی رائے مانگی گئی تو کچھ ماں کے سمجھانے بجھانے پر چچا کا بوجھ ہلکا کرنے کے خیال سے اور کچھ اپنے فطری تقاضوں سے مغلوب ہو کر اس نے ہاں کر دی تھی اور اس کی ماں فوراً ہجر کے باپ کے سامنے دست سوال لئے آ کھڑی ہوگی۔

ادھر ہجر کے ہاں کون تھا؟ جو اتنے اچھے رشتے سے انکار کرتا اور ناشکری کا مرتکب ہوتا جب ہی تو ایک ہفتے کے اندر اندر سادگی سے ان دونوں کا نکاح کر دیا گیا اور اب اسد کے سادہ مگر سلیقے سے ترتیب دیئے کمرے میں بیٹھی ہجر کا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔

☆☆☆

اور جب اسد اس کے سامنے آ کر بیٹھا تو اس پل ہجر کو اپنا سارا بدن دل بن کر دھڑکتا محسوس ہوا اسد نے ہاتھ میں پکڑی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنائی۔

”ہجر......!“ اسد نے پکارا اور ہجر کا سارا بدن گویا کان بن گیا۔

”ہجر میں آپ کی بے تحاشا عزت کرتا ہوں اور کوشش کروں گا کہ آپ کے تمام حقوق ادا کر سکوں اور اس سلسلے میں آپ کو یقیناً مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی لیکن ایک بات کا دھیان رکھیے گا کہ کبھی محبت کے لئے مجھے مورد الزام مت ٹھہرایئے گا کیونکہ ایک محبت ہی جس پہ میرا اختیار نہیں اور میں فرح کے مرنے کے اتنا عرصہ بعد بھی باوجود کوشش کے اس کی محبت کے سحر سے نہیں نکل سکا۔“ اسد نے پل بھر کو رک کر ہجر کی طرف دیکھا جو سر جھکائے اس کی بات سن رہی تھی اور ہجر کو بولتا نہ پا کر اسد دوبارہ سے شروع ہوا۔

”ہو سکتا ہے زندگی کے گزرتے لمحوں میں آپ کی رفاقت مجھے فرح کی محبت کے سحر سے نکال لائے اور میں آپ سے محبت کرنے لگوں لیکن اس لمحے کے آنے تک آپ کو انتظار کرنا ہو گا۔“ اسد نے گہری سانس بھرتے ہوئے اپنی بات ختم کی اور اس پہ وہ شادی کے دس سال گزرنے کے بعد بھی قائم تھا اس نے ہجر کو بے تحاشا خلوص، اعتماد اور عزت کے ساتھ ساتھ گھر اور باہر کے تمام اختیار سونپ دیئے تھے یہاں تک کہ اسد کے لباس اور کھانے پینے تک کے متعلق بھی فیصلے ہجر ہی کرتی تھی لیکن بس اک محبت تھی جو ہجر کی دسترس سے باہر تھی دس سالہ رفاقت میں ایک پل بھی تو ایسا نہیں تھا جب اسد نے بھولے سے بھی خالص محبت کی ایک نظر ہی ہجر کو دان کی ہو اور اس ایک نظر کے لئے ہجر پچھلے دس سال سے تڑپ رہی تھی۔

بظاہر دیکھا جاتا تو گزرے دس سال ہجر کی زندگی کے بہترین سال تھے بے تحاشا خیال رکھنے والا شوہر اور دو ہنستے مسکراتے شرارتی سے بچے اس کی زندگی میں بظاہر کوئی کمی نہ تھی، لیکن وہ اپنے اندر کی اس عورت کا کیا کرتی جو محبت، محبت پکارتی تھی۔

کبھی کبھی ہجر سوچتی کہ عورت کے من کو بہلانا کتنا کٹھن ہے جب وہ سجاد کی شریک سفر تھی تو بے تحاشا محبت پانے کے باوجود اس کے اندر کی خود دار عورت عزت پانے کے لئے تڑپتی تھی اور اب جب اسد نے اسے بے پناہ عزت دی تھی تو اس کا من ایک نگاہ التفات کے لئے تڑپتا تھا نہ جانے کب تک اسے اس لمحے کا انتظار کرنا تھا، اسد اس کے پاس دنیا کے تقاضے نبھانے کے لئے بلکہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آتا۔

عورت کی سائیکی بھی عجب ہے وہ ساری زندگی عزت اور محبت پانے کی چاہ کرتی ہے لیکن بہت کم خوش نصیب ایسی ہوتی ہیں جو ان دونوں کو اکٹھا پانے میں کامیاب ہوتی ہیں جبکہ اکثریت ہجر کی طرح انتظار میں ہی زندگی گزار دیتی ہیں ایسے میں کبھی کبھی ہجر کو یہ خیال مسکرانے پہ مجبور کر دیتا کہ اگر مذہب بیک وقت عورت کو بھی مرد کی طرح ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دیتا تو وہ ان دو مردوں کا انتخاب کرتی جن میں سے ایک عورت کی بے تحاشا عزت کرتا اور دوسرا بے اندازہ محبت۔

☆☆☆

قرۃ العین

حسین کی باتوں نے جیسے تابوت میں آخری کیل والا کام سرانجام دیا تھا، لنچ بریک ختم ہوئے نہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا مگر وہ اپنے کیبن میں ایک پوزیشن میں بیٹھا ایک ہی زاویے پر سوچتا چلا جا رہا تھا ہاتھ پیر کرسی پر ڈھیلے چھوڑے وہ میز پر بال پوائنٹ کو دائرے میں گھماتے حسین کی باتوں کو سوچے چلا جا رہا تھا، سارے تانے بانے بنتے چلے جا رہے تھے دھندلے، مبہم نقوش اب واضح ہو کر اس کی جسم و جاں کو چھیدتے چلے جا رہے تھے وہ فطرتاً جذباتی اور جلد باز انسان تھا سو فیصلہ کرنے میں اس نے دیر نہیں لگائی تھی اس بات سے انجان کے جذباتی فیصلے کبھی پائیدار نہیں ہوتے اور ان فیصلوں کے پیچھے ایک طوفان تھما ہوتا ہے جو پھر ہر چیز تہس نہس کرتا چلا جاتا ہے وہ بس ہر بات فراموش کیے ایک ہی نکتے پر سوچے جا رہا تھا اسے حسین کی طرح بے بس نا امید اور ٹوٹا ہوا انسان نہیں بننا جس کی ذلت و رسوائی کی داستان ہر کوئی نہ صرف اس کے چہرے سے پڑھ سکتا تھا بلکہ پیٹھ پیچھے اسے تمسخرانہ نظروں سے دیکھا اور نشتر چبھتی چہ مگوئیاں بھی کی جاتیں تھیں۔

وہ خطا کار نہیں تھا مگر سزاوار بنایا جا رہا تھا غلطی اس کی نہیں تھا گناہ اس کے کھاتے میں لکھا جا رہا تھا، مکمل انسان ہونے کے باوجود نہ جانے کون کون سی کمی اور خامی اس میں بھی تلاش کی جا رہی تھی ایسے ہی تو کوئی کسی کو چھوڑ نہیں دیتا نا کل سے اس کے بارے میں بھی یہی کچھ کہہ رہے ہوں گے تو کیا وہ بھی حسین کی طرح استعفیٰ دے کر کسی ہرجائی کی خاطر اپنی اتنی اچھی ملازمت چھوڑ کر دنیا کے کسی اور کونے میں منہ چھپا کر اپنی روح پر پڑے زخموں کو کریدتے، کراہتے تڑپتے اپنی باقی ماندہ زندگی گزارے گا۔

''ہرگز نہیں۔'' اس نے یکدم جھرجھری سی لی اور جذباتی پن سے ایک غلط فیصلے پر مہر لگادی۔

''بس بہت ہو گیا میں آج جاتے ہی اس پر تین صرف بھیج دوں گا۔'' اس نے ایک بار پھر ٹھانی۔

وہ کافی دنوں سے رانیہ کے رویے سے پریشان تھا وہ بہت بدل گئی تھی ایک دم اچانک اور وہ ہر روز توجیح ڈھونڈتا دل کو بہلاتا دفتر چلا آتا اور اپنے رویے پر ہر طرح سے نظر ثانی کرتا مگر وہ تو وہی طاہر تھا پیار کرنے والا، رانیہ پر نثار ہونے والا یہ اس کا پیار ہی تو تھا جو اتنے دنوں سے رانیہ کی بے رخی، بے اعتنائی، بدتمیزی اور سرد رویے کو خندہ پیشانی سے سہہ رہا تھا بس یہی سوچ کر خود کو جھوٹے دلاسے دے رہا تھا کہ یہاں پر وہ اکیلی ہو گئی ہے، تنہائی سے گھبرا کر یوں جھلا جاتی ہے اور اپنی فرسٹریشن، جھلاہٹ اسی پر انڈیل دیتی ہے لیکن یہ تو اس کی خام خیالی تھی تنہائی سے گھبرا کر بھلا کوئی یوں کرتا ہے اور تنہائی بھی کیسی دفتر سے جا کر اسے سارا وقت وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہی بتاتے تھے یہ تو حسین کی

باتوں نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں اور آنکھوں پر محبت کی پٹی جو بندھی تھی وہ اتر گئی تھی اور اب شک کی عینک لگائے اس پر ہر چیز واضح ہوتی چلی جا رہی تھی حسین اس کا کولیگ تھا جس کی بیوی اسے چھوڑ چکی تھی اسی کے بارے میں بتاتے جب حسین نے کہا۔

''یار میں سمجھتا رہا کہ وہ یہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہی اس لئے

اتنی چڑچڑی سی ہو گئی یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، کہ وہ یہاں کسی اور کے ساتھ ایڈجسٹ بھی ہو چکی ہے اور اسی کی ساتھ باقی کی زندگی گزارنے کی ٹھان بھی چکی ہے۔“

حسین نے نہایت دلگرفتگی کے ساتھ اسے کچھ لمحے پہلے بتایا تھا وہ اس وقت کتنا شکستہ اور ٹوٹا ہوا لگ رہا تھا حسین کی رسوائی کی داستان شاید کبھی طشت از بام یوں نہ ہوتی جو اس کی بے وفا بیوی اسی کے دفتر میں کام کرنے والے ٹیلیفون آپریٹر کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرتی ہوئی حسین سے خلع کا مطالبہ نہ کر دیتی اور ان میاں بیوی کا جھگڑا ان کے ہمسائے کانوں سے سنتے اور آنکھوں سے دیکھتے لائیو شو کا لطف لیتے اور ہمسائے بھی وہ جو کہ انہی کے دفتر انہی کے ساتھ کام کرنے والے کولیگ تھے پھر بھلا بات چھپائے بھی کیسے چھپتی سو حسین کے پاس نم آنکھوں کے ساتھ طاہر کو اپنی بیوی کے ہرجائی پن کے قصے سنانے اور اس پر اور اس ملازمت پر لعنت بھیجنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

”کافی دنوں سے وہ بیزار اور اکھڑی اکھڑی سی رہتی تھی بد مزہ کھانا، بکھرا گھر، گندگی، بکھیڑا، کبھی سر میں درد کبھی جی بیزار اور تو اور اس نے میرے کپڑے تک پریس کرنے چھوڑ دیئے تھے ناشتہ کبھی جیسے تیسے سر جھاڑ منہ پھاڑ بنا دیا کبھی سر درد کا بہانہ بنا کر سوتی بن گئی چار و ناچار میں خود ہی سڑے توس اور جلا آملیٹ کھا کر دل جلاتا گھر سے نکلتا یہ سب اس لئے سہہ رہا تھا کہ وہ پہلے ایسی نہ تھی، لیکن اب تو اسے اٹھتے بیٹھتے میری ہر بات پر اعتراض اب اچانک اسے شادی کے دو سال بعد خیال آیا کہ ہم دونوں کے مزاج ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں میرے اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے حتیٰ کے سونے تک میں سو سو کیڑے نکالنے لگی تھی وہ کوئی اور جو نگاہوں میں بچ گیا تھا میں بھلا کہاں اچھا لگتا آہ، طاہر یار مجھ سے غلطی ہوئی بہت بڑی غلطی ہوئی کاش میں یہاں ٹرانسفر ہونے پر اسے ساتھ نہ لاتا وہیں سسرال میں رہنے دیتا میرا اور گھر والوں کا خیال تھا کہ یہاں اتنی دور قدرے ویران جگہ پر میرا کون خیال رکھے گا اور پھر بیوی ہوتی کس لئے ہے ہر پل ساتھ نبھانے کے لئے بلکہ ہم دونوں جوائنٹ فیملی سے دور ایک دوسرے کے سنگ پر لطف زندگی گزارئے گے یہ ہے پر لطف زندگی کیا منہ دکھاؤں گا میں پیچھے گھر والوں کو جا کر بس میں نے ٹھان لی ہے جو تھوڑا بہت جمع کیا ہے اس پر دوبئی چلا جاؤں گا وہاں دوست ہے میرا ایک، بات ہو گئی ہے میری اس سے میں یہاں سے سیدھا دوبئی ہی جاؤں گا چاہے وہاں مجھے ٹرک ڈرائیور بننا پڑے یا ٹیکسی ڈرائیور یا پھر کچھ اور میں اب یہاں نہیں رہ سکتا کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا اس عورت نے بد دعا ہے میری وہ بھی سکھی نہ رہے گی تم دیکھ لینا پچھتائے گی اپنی اس غلطی پر، پر مجھے اس سے کیا حاصل میری زندگی تو برباد کر ڈالی ناں اس نے۔“

حسین کی باتوں نے طاہر کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے جو کچھ حسین نے اسے بتایا تھا یہی کچھ تو آج کل طاہر کے ساتھ بھی ہو رہا تھا اور ان کے گھر کے سامنے ہی تو کچھ دنوں قبل چھیڑا چھانٹ نہایت ہینڈسم سرفراز شفٹ ہوا تھا گو وہ بھی اسی کی کمپنی میں ملازم ہو کر آیا تھا پر اس کی سائٹ بالکل دوسری تھی رانیہ نے ایک دو بار استفسار کیا تھا اور اب طاہر کو اس کے لہجے میں پوشیدہ تجسس اشتیاق بھرا تجسس چوکنا کرنے لگا تھا کہیں اس کے جانے کے بعد وہ دونوں......اس سے آگے تو سوچنا بھی روح فرسا تھا اور پھر رانیہ کو تو اس نے پسند بھی اس کے پر وقار مزاج اس کے ملکوتی معصوم حسن پر فدا ہوتے ہوئے ہی اپنا جیون ساتھی بنا لینے کا یکدم فیصلہ کیا تھا بس وہ اسے سب سے الگ تھلگ قدرے سنجیدہ سی وقار کے ساتھ خاموش بیٹھی بے حد اچھی لگی تھی اور پاس سے گزرتی آپا کو اس نے اسی لمحے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا تھا کہ یہ وہ لڑکی ہے جس سے وہ شادی کرنا چاہتا ہے کزن کی شادی پر پسند آنے والی رانیہ سے بہت جلد اس کی شادی ہو گئی تھی دور پرے کی رشتے داری کے باعث ان دونوں کے بیچ ظالم سماج نام کی کوئی چیز نہیں آئی تھی اور پھر شادی کے بعد رانیہ نے بہت جلد اس کے گھر والوں کے دل میں اپنی خاص جگہ اپنے دھیمے مزاج، ایثار، خلوص اور محنت سے بنائی تھی طاہر کو اپنے انتخاب پر فخر تھا رانیہ جو اپنے گھر میں پانچ بہن بھائیوں کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن تھی طاہر کے گھر آ کے بے حد ذمہ دار شائستہ اور پر خلوص بہو ثابت ہوئی تھی طاہر کی محبت نے اسے خاص بنا ڈالا تھا طاہر اس پر دل و جان سے فریفتہ تھا اور اس کی سلیقہ مندی، ذہانت اور خوبصورتی کا نہ صرف گرویدہ تھا بلکہ اس کا برملا اظہار بھی کرتا تھا وہ رانیہ سے بے حد پیار کرتا تھا اور اسی وجہ سے جس ملٹی نیشنل آئل کمپنی میں وہ ایک اچھے رینک پر فائز تھا اسی کمپنی نے اپنے کام کے سلسلے میں اپنی ایک برانچ دور دراز کے علاقے میں کھولی اور نئے ورکرز کے ساتھ ساتھ اپنے محنتی ورکرز یہاں ٹرانسفر کیے جن میں طاہر، حسین اور چند اور لوگ شامل تھے تو طاہر رانیہ کو اپنے ساتھ ہی لے کر آیا تھا گھر والوں کو بھی اعتراض نہ تھا یہاں پر کمپنی نے اپنے ورکرز کی سہولت کے لئے کچھ گھر بھی بنائے تھے تاکہ وہ لوگ اپنی فیملیز کے ساتھ یہاں رہ سکے ابھی انہیں ادھر ٹرانسفر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اس لئے ان کا اردگرد لوگوں کے ساتھ بس واجبی سا ہی تعارف تھا یوں بھی طاہر بہت زیادہ سوشل نہیں تھا اور رانیہ تو تھی ہی اس کی مزاج آشنا اس کے رنگ میں رنگ جانے والی حالانکہ کے کراچی جیسے پر رونق شہر سے آ کر یوں خاموش یکسانیت سے بھرپور جگہ پر رہنے پر رانیہ قدرے بوکھلائی ہوئی تھی، شروع شروع میں وہ بہت جلد گھبرا جاتی تھی، بوریت کا شکار ہونے لگی تھی یہاں کچھ تھا ہی نہیں کرنے کو مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ طاہر کے آرام و سکون کا بے حد خیال رکھتی تھی اور پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا وہ ایکدم بدل گئی، بیزار، روکھی سی وہی رانیہ جس کے ہاتھ میں ہر وقت جھاڑ پونچھ کا کپڑا ہوتا تھا کہ طاہر کو چیزوں پر گرد کی تہہ پسند نہیں اب انہی چیزوں برتنوں مٹی کی تہہ جمتی جا رہی تھی کھانا سادہ ہو مگر خوبصورت اور قرینے طریقے سے پیش کیا جائے طاہر کی اس بات کا خیال رکھنے والی رانیہ اب جیسے تیسے جلا بھنا کھانا پکانے لگی تھی ناشتہ تو بہت کم بناتی تھی آج کل اتنی صبح کون اٹھے میرے سر میں درد ہوتا ہے کپڑے میلے، استری کیے ہوتے نہیں بہانہ کبھی لائٹ نہیں یا گھر کے دوسرے کام بھی ہوتے ہیں سو نہیں کر سکی رات کو جلدی سو جانا یا پھر کوئی نہ کوئی ایسی مصروفیت ڈھونڈ لینا کے طاہر اس کا انتظار کرتے کرتے سو جائے یہ سب ایک ہفتے سے

ہو رہا تھا اور وہ ہر بار اتنی معصوم اور پیاری سی شکل بنا کر اپنی کوتاہی بیان کرتی کہ طاہر اسے سخت لہجے میں سرزنش تو درکنار اس کی ان الٹی سیدھی حرکتوں پر ٹوک بھی نہ پاتا وہ رانیہ کی حرکتوں سے کچھ کچھ پریشان تو تھا مگر اس کے پیچھے حسین کا اپنی زندگی کا بتایا واقعہ محرک ہوگا اس کے وہم و گمان میں نہ تھا۔

اب وہ جیسے جیسے نئے سرے سے گزرے سات دنوں کی تمام باتیں سوچ رہا تھا اس کا شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا ایک ہفتے قبل ہی سرفراز ادھر شفٹ ہوا تھا آمنے سامنے ہمسائے ہونے کی وجہ سے وہ ان سے ملنے بھی آیا تھا اور خیر سگالی کے جذبات کے طور پر وہ رانیہ کا پسندیدہ چاکلیٹ کیک اور پسندیدہ پھول لے کر آیا تھا جسے بعد میں رانیہ نے ہلکے سے شکوے سے دہرایا بھی تھا کہ ایک اجنبی ہمسائے کو اس کی پسند کا خیال آیا اور طاہر جو جانتا وہ کیا پسند کرتی ہے یہاں لا کر بھول ہی گیا ہے یقیناً تب ہی اس کمینے سرفراز نے رانیہ کے دل میں نرم گوشہ حاصل کر لیا تھا۔

پھر اگلے روز باہر کھلنے والی کھڑکی سے دیکھتے ہوئے رانیہ اسے ٹوکتا کہ وہ بھی سرفراز کی طرح صبح سویرے اٹھ کر جاگنگ کیا کرے اور دفتر میں سارا دن کرسی پر بیٹھنے سے جو اس کی توند بڑھ رہی ہے اسے کنٹرول کرے آخر تب بھی اس گھامڑ کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی کیوں نہیں بجی باقی کی کڑیاں ملانے کی اسے ضرورت نہیں رہی تھی کڑیاں تو خود بخود ہی ملتی جا رہی تھیں آج کل رانیہ کا اپنے سیل فون کے بجتے پر فوراً چوکنا ہو جانا بلکہ کل تو اس نے یونہی صوفے پر بیٹھے پاس پڑے رانیہ کے سیل فون کی سکرین پر ایک انجان نمبر سے کال آتے دیکھی تھی اس کے اٹینڈ کرنے سے پہلے ہی رانیہ نے فون اس کے پاس سے اچک لیا تھا طاہر کے استفسار کرنے پر بوکھلائی سی رانیہ نے جلدی سے کہا تھا کہ اس کی یہ آپا کا نیا نمبر ہے اور چائے ابلنے جانے کا بہانہ کرتی فوراً کچن کی جانب دوڑ گئی تھی اور طاہر جو ٹی وی چینل پر اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھ رہا تھا دوبارہ اس کی جانب توجہ مرکوز کر بیٹھا تھا مگر اب اسے ساری بات نہ صرف یاد آ رہی تھی بلکہ اصل وجہ بھی سمجھ آ رہی تھی، یقیناً وہ نمبر سرفراز کا ہوگا جبھی تو رانیہ اتنی بوکھلائی سی تھی اور اس نے تو شام کی چائے بنانی چھوڑی ہوئی تھی جبکہ اس وقت اس نے چائے ابلنے کے بہانے کے پیچھے اپنی بوکھلاہٹ چھپانی چاہی تھی۔

طاہر جو رانیہ کا دیوانہ تھا اس پر دل و جان نچھاور کرنے کو تیار رہتا تھا اب جب گزشتہ سات دنوں کے واقعات ذہن میں دہراتے اپنی محبت بھلائے بیٹھا تھا غصے سے اس کے تن بدن میں آگ سی لگی ہوئی تھی دماغ کی رگیں کھنچ گئی تھیں ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا وہ جیسے جیسے رانیہ کی بے وفائی اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا جاتا اس کا دل بیٹھتا جا رہا تھا، وہ مزید اس کیفیت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا جبھی وقت سے پہلے ہی آفس سے اٹھ آیا اسے آج رانیہ سے دوٹوک بات کرنی تھی باس کو طبیعت کی خرابی کا بتا کر اس نے باہر آ کر اپنی بائیک کو زوردار کک ماری اور گھر کی جانب دوڑا دی چونکہ وہ ایک محنتی ورکر تھا لہٰذا باس نے بھی بلا تامل اسے آفس سے جلدی چھٹی دے دی تھی۔

☆☆☆

دماغ مکمل طور پر تمام حقائق کا جائزہ لے کر حسین کی باتوں سے متفق ہوتا ہوا رانیہ کو بے وفا قرار دے چکا تھا لیکن وہ اس دل کا کیا کرتا جو اب بھی رانیہ کو بے وفا جانتے ہوئے بھی رانیہ کے متعلق نرم احساسات چھپائے ہوئے تھا لیکن وہ یہ ذلت بھی ہرگز برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا کہ اس کی بیوی اکیلے پن سے گھبرا کر اس کی ناک نیچے ایک ذلیل کھیل میں اپنی مصروفیت ڈھونڈ چکی تھی اور پھر ایک دن وہ اس پر لعنت بھیجتی کسی اور سنگ چلتی بنتی،

"لیکن مجھے ایک بار رانیہ کو موقع دینا ہی ہوگا میں آج اس سے صاف صاف بات کروں گا اور اگر اس نے اقرار جرم کر لیا تو اسی وقت دو حرف بھیجتے ہوئے اسے گھر سے چلتا کروں گا تب میں دنیا کی نظروں میں اس طرح سے ذلیل تو نہیں ہوں گا ناں ذلت و رسوائی حرف رانیہ کے حصے میں آئے گی جو اسی کے قابل ہے۔" بائیک کو اچانک بریک لگاتے ہوئے طاہر نے کسی نتیجے پر پہنچتا ہوئے سوچا اور ایک بار پھر گھر کی جانب بائیک دوڑا دی مگر گلی کا موڑ مڑتے ہی جو منظر اس کی نظروں نے دیکھا نہ صرف بے اختیار بائیک کی بریک لگائی بلکہ جلدی سے دیوار کی اوٹ میں ہو گیا شک اب یقین کا روپ دھارے اس کے گھر کے سامنے ہی وہ منظر دکھا رہا تھا جس کا تصور کرتے ہوئے وہ سولی پر ٹنگا ہوا تھا اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے ایک بار تو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور دوسرے ہی پل اس کے وجود کا رواں رواں غم و غصے سے جل اٹھا تھا اور اب وہ رانیہ کو بھسم کر دینا چاہتا تھا اب تو صفائی لینے دینے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی رانیہ بیرونی گیٹ پر کھڑی سرفراز سے پھولوں کا خاصا بڑا گلدستہ وصول کر رہی تھی تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے، سرفراز گلدستہ رانیہ کو تھما کر بنا کچھ کہے فوراً ہی اپنی بائیک پر سوار سامنے اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا تھا اور رانیہ نے بھی جھٹ گیٹ بند کر دیا تھا طاہر کا غم و غصہ صدمے میں بدلتا جا رہا تھا وہ رانیہ کے متعلق ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن زندگی اسے ایک تلخ ترین زہریلی حقیقت کے سامنا کروا چکی تھی نہ جانے کتنا وقت بیت گیا وہ ایک شاک کی کیفیت دیوار کی اوٹ میں ہی کھڑا رہ گیا تھا اب اس کی آنکھیں صدمے سے برسنے کو تیار تھیں مگر اسے کمزور اور بزدل مرد نہیں بننا تھا اب اسے رانیہ سے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی بس گھر جاتے ہی وہ اس پر تین حرف بھیجتے ہوئے اسی وقت گھر سے نکال دے گا غصہ ایک بار پھر اس کے وجود میں بھرنے لگا نم ہوتی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے سختی سے رگڑتے اس نے بائیک کو کک لگائی اور گھر کے پاس آ کر ہارن دیا گیٹ تھوڑی دیر میں ہی کھول دیا گیا تھا رانیہ دروازے کی اوٹ میں تھی وہ بائیک اندر لے آیا بنا دیکھے اسے معلوم تھا کہ اس وقت وہ رف سے حلیے بیزار صورت بنائے اس کا خیر مقدم کرے گی جو پچھلے سات دنوں سے وہ کر رہی تھی لیکن وہ اتنا بڑا گلدستہ اس نے کہاں چھپایا ہوگا طاہر کو اچانک خیال آیا جبھی بنا رانیہ کی طرف دیکھے طاہر تیزی سے گھر کے اندر داخل ہوا وہ جلد از جلد اس گلدستے کو بازیاب کر لینا چاہتا تھا، تاکہ رانیہ کے منہ پہ مارتے ہوئے اس مکروہ حقیقت جس کے بارے میں وہ جان چکا ہے پھر طلاق اس کے منہ پر دے مارے۔

اور لاؤنج میں داخل ہوتے ہی سامنے کے منظر نے اس کے قدموں کو دروازے کے پاس ہی جکڑ لیا تھا آج تو زندگی اس کے جذبات و احساسات کا گویا امتحان لے رہی تھی، پہلے غم و غصہ پھر صدمہ اور اب شدید حیرت کا جھٹکا لگا تھا اسے لاؤنج بے حد قرینے سے صاف ستھرا کر کے نئے سرے سے سجایا گیا تھا، نئے کشن، نئے پردے نئی سجاوٹ لیکن جس چیز نے اسے زیادہ ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا، وہ سامنے ڈائننگ ٹیبل پر رکھا کرسٹل کے گلدان میں سجا وہی گلدستہ تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے سرفراز باہر دروازے میں رانیہ کو تھما کر اپنے گھر چلا گیا تھا، ٹیبل پر ایک بڑا سا چاکلیٹ کیک بھی رکھا تھا جس پر موم بتیاں روشن تھیں اور گفٹ پیک بھی پڑا تھا اور نہ جانے کیا کیا طاہر کا تو دماغ چکرا کر ہی رہ گیا تھا۔

”ہیپی برتھ ڈے ٹو یو...... ہیپی برتھ ڈے ٹو یو ڈیئر طاہر...... ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔“ طاہر کی پشت کے پاس سے رانیہ کی میٹھی اور لگاوٹ بھری شیریں آواز ابھری تھی۔

”آئی ایم سو سوری طاہر! میں نے آپ کو ان چند دنوں میں کافی ستایا ہے ناں لیکن اگر میں ایسا نہ کرتی تو آج آپ کے چہرے کے اتنے خوبصورت تاثرات دیکھنے کو نہ ملتے اور یہ گلدستہ مجھے ابھی کچھ دیر پہلے سرفراز بھائی دے کر گئے ہیں میں نے منگوایا ہے۔“ رانیہ نے لگاوٹ سے طاہر کا بازو تھامتے ہوئے کہا اور ٹک ٹکی باندھے مسلسل گلدستے کو ہی دیکھتے طاہر کو اپنی طرف سے رانیہ نے گلدستے کے متعلق معلومات فراہم کی۔

”اچھا ادھر آ کر بیٹھیے ناں میں آپ کو ساری بات تفصیل سے بتاتی ہوں میں نے آپ کے لئے کینڈل ڈنر کا بھی اہتمام کر رکھا ہے اور آپ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ میں کیسی لگ رہی ہوں۔“ رانیہ نے طاہر کو صوفے کے جانب کھینچتے ہوئے کہا اور اٹھلاتے ہوئے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی وہ نک سک سے تیار پنک فراک اور چوڑی دار پاجامے میں بال کھولے بے حد خوبصورت لگ رہی تھی، جس رانیہ کو وہ گزشتہ چند دنوں سے دیکھ رہا تھا اس رانیہ میں تو اس کا شائبہ تک نہ تھا یہ تو وہی رانیہ تھی جسے وہ تقریباً ایک سال سے جانتا تھا۔

”بات کہاں سے شروع کروں، ہے تو بہت بونگی سوچ مگر آئی ایم سوری میں نے آپ کو بلاوجہ تنگ کیا اتنے دن۔“ رانیہ نے صوفے پر خاموش و حیران بیٹھے طاہر کے قریب بیٹھتے انگلیاں چٹخاتے بات کا آغاز کیا جو کافی بے ربط سی تھی طاہر کے کچھ پلے نہ پڑا۔

”وہ آپ کو یاد ہے کچھ دن پہلے باتوں باتوں میں جب میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ مجھ سے اتنا پیار کیوں کرتے ہیں کہتے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ میاں بیوی کے پیار میں کمی آ جاتی ہے تو آپ نے فوراً جواب دیا تھا کہ تم ہو ہی پیار کے قابل سلیقہ مند، سگھڑ خوبصورت جو بیوی اپنے شوہر کی مزاج آشنا ہو گھر آنے پر صاف ستھرا پرسکون ماحول ہو صاف ستھری خوبصورت بیوی مسکراتے ہوئے شوہر کا استقبال کرے اس سے بھلا وہ شوہر پیار کیوں نہ کرے، آپ کے اس جواب میں میرے ذہن میں ایک منفی سوچ ابھری کہ اگر میں سگھڑ اور خوبصورت نہ ہوتی تو آپ مجھ سے پیار نہ کرتے، حالانکہ آپ نے تو مجھے پہلی نظر کی محبت کے طور پر اپنایا تھا تب آپ میری ان

خوبیوں سے واقف نہ تھے شادی کے بعد بس آپ میری خوبیوں کے گرویدہ بن گئے جبکہ محبت تو محبوب کو اس کی خوبی خامی سمیت قبول کرنے کا نام ہے گویا آپ کو مجھ سے مشروط محبت ہے میں اچھی ہوں تو محبت ہے ورنہ نہیں اس سوچ نے مجھے بہت الجھا کر رکھ دیا۔

تبھی میں نے آپ کو محبت آزمانے کا سوچا اور ایک دم سے سلیقہ مند سے پھوہڑ بن گئی، رف حلیہ بنا لیا اور لہجہ بیزار کن مگر آپ نے میری تمام بدتمیزیوں کو خندہ پیشانی سے سہا اور میری سوچ پر مجھے شرمندہ کر ڈالا آپ کو واقعی مجھ سے محبت ہے صرف میری خوبیوں سے نہیں میں تو اس ڈرامے کا ڈراپ سین ایک دو دن میں ہی کر ڈالتی آپ نہیں جانتے آپ جب ناشتہ کیے بغیر جاتے تو میرے دل پر کیا گزرتی تھی اور واپسی پر بھی خراب موڈ بنائے ملتی تھی تب آپ کی خاموش صورت دیکھ کر میرا دل اندر سے کٹتا تھا آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اچانک میرے اس خراب رویے کو نہ جانے کیا سمجھ بیٹھتا اور ہو سکتا ہے ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکال کرتا یہ احساس تو مجھے بعد میں ہوا بس جس دن مجھے خیال آیا میں نے سوچا آپ کے آتے ہی سب بتا دوں گی مگر مائرہ نے مجھے روک دیا۔“ رانیہ نے نان سٹاپ بولتے ہوئے کہا اور ایک نیا اجنبی نام سن کر طاہر چونکا۔

”مائرہ! سرفراز بھائی کی بیوی ہے ان کے شفٹ ہونے کے دو دن بعد وہ آئی تھی ان کے ابو بے حد بیمار تھے تو اس وجہ سے سرفراز بھائی کے ساتھ نہیں آ سکی تھی دونوں میاں بیوی بہت اچھے اور ملنسار ہیں مائرہ نے آتے ہی مجھ

سے دوستی گانٹھ لی میری پریشان صورت دیکھ کر
جب اس نے وجہ دریافت کی تو میں نے اپنی حرکت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور پھر اسی نے مشورہ دیا کہ آج طاہر بھائی کی برتھ ڈے ہے آج کے دن خاص اہتمام کے ساتھ انہیں اچھے سے ماحول میں اپنی بے وقوفی پر سوری کروں باتوں باتوں میں آپ کی برتھ ڈے کا ذکر کیا تھا میں نے بس پھر آپ کو سرپرائز دینے کی فل تیاری شروع کر دی ہم نے، مائرہ نے ہی مجھے بازار جا کر نئے پردے کشنز لا کر دیئے، گفٹ کے بارے میں میں نے سمجھا دیا اور وہ لے آئی وہ یہاں پہلے بھی آ کر رہ چکے ہیں اب آپ کی اجازت کے بغیر مجھے یوں چوری چھپے بازار جانا اس کے ساتھ اچھا نہیں لگا اس لئے وہ بے چاری میری خاطر کافی خوار ہوئی اور جب سب تیاری ہو گئی تو اب مجھے خیال آیا کہ پھولوں کے بغیر یہ اہتمام ادھورا ہے تبھی مائرہ کو فون کیا اور شکر ہے سرفراز بھائی گھر پر تھے مائرہ نے انہیں بازار دوڑایا اور وہ بے چارے ابھی مجھے یہ پھول دے کر گئے اور پتہ ہے اس دن میرے سیل پر مائرہ کا ہی فون آ رہا تھا میں ان تمام باتوں کو مکمل طور پر آپ سے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی اس لئے جھٹ آپا کا نیا نمبر کہہ کر آپ کو ٹال دیا، آج میں بہت خوش بھی ہوں آپ واقعی مجھ سے سچی محبت کرتے ہیں اب مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رہی اور آپ نے واقعی مجھے میری خوبیوں خامیوں سمیت اپنایا ہے آپ کی محبت صرف میری خوبیوں سے مشروط نہیں اور ایک بار پھر سوری کے بعد آپ کو کبھی تنگ نہیں کروں گی اور نہ ہی آپ کی محبت کو آزماؤں گی۔'' رانیہ نے تھیلے سے بلی نکال ہی ڈالی اور ساری تفصیل جلدی جلدی طاہر کے گوش گزار کرتے ہوئے آخر میں وہی موٹی سی معصوم صورت بناتے کانوں کو ہاتھ لگائے طاہر سے اور ایسی صورت پر تو طاہر رانیہ کو سات خون معاف کر دے۔

طاہر کے سینے سے ایک لمبی سانس خارج ہوئی۔

''اٹس اوکے جان من چلئے اب آپ کو تا عمر ہماری محبت پر یقین رہے گا، اچھا باقی باتیں ڈنر پر میرا ذرا فریش ہو جاؤں پھر ڈنر کرتے ہیں اور تمہارے کنفس بھی دیکھتے ہیں۔'' طاہر نے صوفے سے اٹھتے ہوئے رانیہ کو مسکراتے ہوئے کہا وہ اب خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا چند گھنٹے پیشتر وہ جن اذیت ناک اور تکلیف دہ سوچوں میں گھرا رہا تھا ان سے اسے رہائی مل گئی تھی۔

''اینڈ آئی ریئلی لو یو رانیہ ڈیئر۔'' طاہر نے صوفے سے اٹھتے ہوئے قدرے شرارتی لہجے میں رانیہ سے اقرار محبت کیا جس پر وہ بلش کر گئی۔

''میں کھانا لگاتی ہوں آپ فریش ہو کر آ جائیے۔'' اس کی پرشوق نظروں سے گھبرا کر رانیہ کچن کی جانب تیزی سے بڑھ گئی۔

''پگلی تم نہیں جانتی تم کتنی بڑی بے وقوفی کر بیٹھی تھی ارے مرد کی محبت کو کبھی آزماتے نہیں ورنہ یہ آزمائش بن جاتی ہے۔'' طاہر کے ضمیر نے رانیہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا اور طاہر اس سے نظر چرائے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

لاحاصلی کا حاصل

فرخ طاہر قریشی

"میں نے ہمیشہ محبت کے ساتھ ساتھ بہت عزت احترام بہت ہمدردی اپنی ماں کے لئے اپنے دل میں محسوس کی ہے، کہا جاتا ہے ماں باپ کڑی دھوپ میں گھنا سایہ ہوتے ہیں اور میری ماں بھی مجھ پہ ایسی ہی کڑی دھوپ میں گھنا سایہ تھی بہت محبت کرنی والی، امی نے کبھی اپنا خیال نہیں کیا ہمیشہ سب کا خیال رکھتی سب کو مجھتی تھی اپنی ماں کو دیکھ کر میں ہمیشہ سوچتا تھا میں ہمیشہ اپنی ماں کا ساتھ دوں گا ان کا خیال رکھوں گا ان کی ڈھال بنوں گا کبھی جو ابو، امی کے ساتھ دادی پھپھو کی حمایت میں کوئی زیادتی کرتے میں فوراً اپنے باپ سے جرح کرتا، اپنی ماں کی حمایت لیتا اور ایسا کر کے میں سمجھتا تھا کہ میں اپنی ماں کی قربانیوں کا ان کی محبت کا بدلہ دے رہا ہوں گھر میں مجھ سے زیادہ امی کا حمایتی کوئی نہیں تھا میں سوچتا تھا میں اپنی ماں کے لئے دنیا سے لڑ سکتا ہوں میں ان کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں لیکن یہ تو میری سوچ تھی جب ذہن میں اور کچھ نہیں تھا لیکن جب کوئی ماں کے مدمقابل کوئی آیا تو......"

ہم دو بہن بھائی تھے، پہلے نمبر پر میں پھر میری بہن رمشا، ہم دونوں بہن بھائیوں میں بہت پیار تھا، اس کا سارا سہرا ہماری ماں کو جاتا تھا، ہم نے اپنی ماں کو ہمیشہ ایک منتظم اعلیٰ کے روپ میں دیکھا جبکہ بابا جانی کا گھر اور گھر کے مسائل میں زیادہ تعلق نہیں تھا وہ صرف کماتے تھے اور کمائی میں سے کچھ حصہ امی کو گھر چلانے کے لئے دیتے تھے زیادہ ٹائم اپنی ماں بہنوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتے تھے۔

☆☆☆

"یہ حسن کہاں ہیں؟" بابا ابھی دادی کے طرف سے آئے تھے بہت خوش نظر آ رہے تھے، تبھی بہت خوشگوار انداز میں امی سے پوچھا۔

"وہ اندر اپنے کمرے میں ہے۔" امی نے جواب دیا۔

"اچھا بلاؤ اسے؟"

"ٹھیک ہے اسے وہی رہنے دو میں وہی چلا جاتا ہوں۔"

"حسن بیٹا کیا ہو رہا ہے؟" بابا نے بہت شفقت سے پوچھا۔

"بابا آپ ادھر میرے روم میں آپ مجھے ادھر ہی بلا لیتے۔" حسن نے باپ سے کہا۔

"کوئی بات نہیں اگر میں آ گیا تو مجھے تم سے ضروری بات کرنا تھی۔"

"جی بابا کہیں۔" میں بہت توجہ سے باپ کی طرف متوجہ ہو گیا، کیونکہ اس سے پہلے وہ کبھی ایسے اور اتنے اچھے انداز میں مجھ سے بات کرنے نہیں آئے تھے۔

"اپنے چچا کی بیٹی عاتکہ کو تو تم بچپن سے جانتے ہو تو میں اور تمہاری دادی چاہتی ہے ہم تمہاری شادی ارم سے کر دیں۔" میں بابا کو بہت غائب دماغی سے دیکھ رہا تھا۔

عاتکہ میرے چچا کی بیٹی تھی ہم جوائنٹ فیملی سے رہتے تھے تو دن رات کو عاتکہ سے سامنا ہوتا تھا، سانولی رنگت چھوٹا سا قد اور فربہی مائل بدن کے ساتھ کچھ عجیب سی لگتی تھی ہم دونوں تقریباً ہم عمر تھے، جب بھی میرا اور اس کا جھگڑا ہوتا تھا میں دل ہی دل میں اس انجانے لڑکے سے ہمدردی کرتا جس کے نصیب میں وہ لکھی گئی ہے۔

"لیکن کون جانتا ہے آگے قسمت میں کیا ہے؟"

"کس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟"

"کہاں کھوئے ہوئے ہو تم میں کچھ پوچھ رہا ہوں تم سے۔" بابا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے چونکایا۔

"جی...... جی ...... بابا...... میں...... میں ...... بھی ہوں۔"

"حسن عاتکہ بے شک تھوڑی جھگڑالو ہے لیکن تم اسے سدھار لینا بیٹا بہت گولڈن چانس ہے تم آگے آگے اپنی زندگی کو بہت آرام سے اسٹیبلیش کر سکتے ہو۔" بابا نے سمجھاتے ہوئے کچھ سنہری سپنے دکھائے تھے۔

میں اپنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا، جانتا تھا ماں نے زرینہ خالہ کی بیٹی کرن کو میرے لئے پسند کیا ہوا ہے لیکن میں یہ بھول گیا اگر زندگی میں کسی موڑ پر اللہ سے میری آزمائش کی، اگر میری محبت نے قربانی مانگ لی تو؟

پھر جانے کب، کیسے کس طرح مجھے عاتکہ اچھی لگنی لگی پتہ نہیں کیسے میری نظر اس پر ٹھہر گئی، اب نہ تو مجھے وہ جھگڑالو لگتی نہ ہی بدصورت بس خود بخود میں اس سے شادی کے لئے راضی ہو گیا میں سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے یا یہ کہ واقعی جو میں اس کے لئے سوچتا تھا یہ محبت ہے؟

☆☆☆

"امی! میں عاتکہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟" امی ناشتہ کے بعد دوپہر کے کھانے کے لئے سبزی تیار کر رہی تھی کہ میں نے ان پر جیسے ساتوں آسمان گرا دیئے۔

"عاتکہ سے؟" امی کا سبزی بناتا ہاتھ وہی رک گیا اور انہوں نے بہت حیرت سے سوال کیا۔

"جی امی......!"

"لیکن حسن! کہاں عاتکہ، کہاں تم، بیٹا شادی ساری عمر کا بندھن ہے تم، تمہیں کیا ہو گیا ہے۔" امی حیران سی پوچھ رہی تھی۔

"جی امی پلیز، آپ منع مت کریں میں جانتا ہوں آپ نے ثمینہ کو میرے لئے پسند کیا ہے لیکن میں صرف عاتکہ سے ہی شادی کروں گا۔"

"نہیں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" امی نے سر جھکا اور دوبارہ سبزی بنانا شروع کر دی، تب میں بھی امی کی دکھتی رگ پر ہاتھ ڈالا خود کو کمرے میں بند کر لیا، امی سے بات چیت اور کھانا پینا سب بند کر دیا، پھر میں جو بھوکا بیٹھا رہوں تو کیا میری ماں چین سے کھانا کھا سکتی تھی، میں اپنی ماں کی آزمائش بن کر ان کے سامنے کھڑا ہوا تھا، میں جو دعویٰ کرتا تھا کہ میں اپنی ماں کی اک اک تکلیف اور دکھ کا گواہ ہوں میں اپنی ماں کو لئے جان بھی دے سکتا ہوں لیکن آج ایک معمولی سی لڑکی کے لئے اپنی ماں کو اک دوراہے پر لا کھڑا کیا۔

میں بھول گیا کہ ان کو مجھ سے بہت امید یں ہیں مجھے نظر آ رہا تو صرف یہ کہ وہ میری محبت کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہیں، مجھے اداس اور بہت چپ چپ سی پھرتی اپنی ماں نظر ہی نہیں آ رہی تھی نظر آتی بھی تو کیسے......؟

"حسن! ادھر آؤ ذرا۔"

آج میری احتجاجی مہم کا تیسرا دن تھا کہ امی نے ہارے ہوئے انداز میں مجھے آواز دی۔

"جی امی......"

"تو، تم نے کیا سوچا۔" امی سوال کر رہی تھی۔

"امی سوچنا تو آپ کو ہے میں تو اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں۔"

"ہوں۔" امی نے ایک لمبا سانس کھینچا۔

"بیٹا تم اپنی چچی کو جانتے ہو وہ ایک مغرور، بدتمیز اور احساس کمتری کا شکار ہوئی عورت ہے اور کہا جاتا ہے جیسی ماں ہوتی ہے ویسی ہی بیٹی

ہوتی ہے۔'' امی نے جیسے تمہید باندھی۔

''تمہاری چچی نے ہمیشہ میری کم حیثیتی کا مذاق اڑایا ہے اس عورت نے کوئی موقعہ ہمیں ذلیل کرنے کا کبھی نہیں گنوایا، شاید اس لئے کہ میں خوبصورت تھی پڑھی لکھی تھی اور یہ دونوں خوبیاں ہی تمہاری چچی کے پاس نہیں لیکن اپنے نصیب میں لکھی تنگدستی کو میں دور نہیں کر سکتی، میں سب کچھ سمجھتی تھی مگر خاموش رہتی کہ نہ میں تماشے پسند کرتی ہوں اور نہ تماشہ کا حصہ بننا پسند کرتی ہوں اور میری مصلحت اور چپ رہنے کو وہ ہمیشہ غلط مطلب دیتی رہی میں نے اپنی زندگی کے یہ شادی کے بعد پچیس سال یہ جملے سنتے اور سہتے گزار دیئے ہمیشہ یہی سوچتی تھی ابھی میرا وقت نہیں میرا میاں کمزور ہے تو کیا ہوا ابھی تو میں بھی اپنی اولاد کو بازو بنا کر کھڑی ہوں گی۔'' امی نے رندھی ہوئی آواز میں اپنی بات مکمل کی۔

''امی دیکھیں، وہ تو آپ کا اور چچی کا معاملہ تھا آپ کی اور ان کی رشتہ داری ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ اس رشتے میں ایسا کچھ ہوتا رہتا ہے لیکن امی عاتکہ ایسی نہیں ہے تھوڑی جھگڑالو ہے لیکن میں شادی کے بعد اسے سدھار لوں گا وہ آپ کی عزت کرے گی۔'' میں اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

''آپ ایک بار عاتکہ کو موقع تو دیں، چچی کی کیے کی سزا اس کی بیٹی کو مت دیں۔''

''ٹھیک کہا ہے تم نے، وہ میرا اور تمہاری چچی کا معاملہ تھا اور یہ تمہارا اور عاتکہ کا معاملہ ہے، میں پاگل خوانخواہ اپنا معاملات کو تمہارا معاملہ سمجھ رہی تھی، تم فکر مت کرو کل تمہاری چچی کے گھر چلیں گے ٹھیک ہے ناں۔'' امی نے جیسے سوال و جواب کا چیپٹر کلوز کر دیا اور میں مسکرا دیا، اس محاذ کو کامیابی سے سر کرنے کے بعد مسکرانا تو میرا حق بنتا تھا۔

☆☆☆

ہم کس قدر انجانے اور ظلم ہوتے ہیں کہ ذرا سا کچھ ہو تو سب سے پہلے اپنی احسان کرنے والی ماں کو ہی تکلیف دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنا اور اپنے رسول کا ذکر کیا وہی وہی ماں باپ کی فرمانبرداری کی تاکید کی اور ماں باپ کی نافرمانی سے ہم اللہ کے حکم سے سرکشی کے مرتکب ہوتے ہیں، آج خیال آتا ہے میں تو بہت فخر سے کہا کرتا تھا مجھے اپنی ماں سے بہت محبت ہے میں ماں کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں، وہ سب لفاظی تھا بالکل اسی طرح جس طرح میں نے اللہ سے وعدہ کیا کہ میں تیرا بندہ ہوں تیری عبادت کروں گا میں نے نہ اللہ سے کیا اپنا وعدہ پورا کیا اور نہ ہی اپنی ماں سے کیا وعدہ پورا کیا اور عہد شکن ہمارے دین میں منافق کہلاتا ہے میں بھی منافق تھا کہ جب میری آزمائش آئی تو میں سارے وعدے بھلا بیٹھا، تبھی تو میری اوقات کے مطابق مجھے ملا تھا، اللہ جانتا تھا میری اوقات ہی یہ ہے۔

امی میری ضد سے مجبور ہو کر میری خوشی کی خاطر عاتکہ کو بیاہ کرنے آئیں۔

شادی کے بعد ایک ہی دن میں احساس ہو گیا کہ یہ خسارے کا سودا ہے اور اس سودے میں نفع کیسے ہو سکتا ہے جو کسی کے دل کو تکلیف دے کر کیا ہوا اور دل بھی کسی اور کا نہیں ماں کا دل۔

جیسے جیسے دن گزرتے عاتکہ کے جوہر سب پر کھلنا شروع ہو گئے وہ ایک کڑوی زبان رکھنے والی ماں کی زبان دراز بیٹی تھی اور اس کی دی ہوئی ہر تکلیف اب مجھے برداشت کرنی تھی چاہے خوشی سے چاہے غمی سے کرنی تو تھی ہی۔

میری ماں نے خاموشی کی چادر تان لی تھی، عاتکہ کوئی کام کاج نہ کرتی، کوئی کچھ کہہ دیتا تو غصہ کرتی، سب کے سامنے میرے ساتھ بدتمیزی کرتی اور میری ماں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی انجان بن کر آنکھیں بند کیے تسبیح کے دانے گراتی رہتی کہ جن کا تعلق اللہ سے جڑ جائے تو ان کا دنیا سے کیا لینا دینا۔

اسی کشمکش میں دو سال بیت گئے ابھی تک میں اولاد کی نعمت سے محروم تھا، اسی عرصے میں میری ماں، میری نافرمانی، میری برباد زندگی کا دکھ لئے قبر میں جا سوئیں اور میں عاتکہ کو جھیلنے کے لئے اکیلا رہ گیا، اسی عرصے میں ثمینہ کی بھی شادی ہو چکی تھی، بابا کو پہلے کی طرح گھر سے کوئی سروکار نہ تھا۔

آج عاتکہ اپنی ماں کی طرف گئی ہوئی تھی ہمیشہ کی طرح خرچے پہ جھگڑ کر چلی گئی تھی، میرا دل بہت گھبرا رہا تھا اور میں اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا کیا کبھی مجھے عاتکہ سے محبت تھی، نہیں شاید کبھی نہیں تو پھر کیا تھا، وہ شارٹ کٹ تھی ہاں یہی سچ ہے میں اپنے باپ کے دیکھائے حسین سپنوں میں آ کر لالچی بن بیٹھا میں نے ہمیشہ گھر میں پیسے کی تنگی دیکھی تھی، مجھے زندگی میں حوصلہ ملا میری ضرورت سے کم اور میری خواہش کے برعکس ملا، بابا کے دیئے لالچ نے میرے اندر کی ہوس نے میری طلب کو بھڑکا دیا اور میں شارٹ کٹ کی تلاش میں مگن ہو گیا اور عاتکہ وہی میرا شارٹ کٹ تھی، چچا جان دولت مند انسان تھے، انہوں نے کبھی ہماری مدد نہیں کی تھی لیکن مجھے لگتا تھا اپنی بیٹی کے آرام کے لئے تو وہ ضرور کچھ دیں گے، اپنے بزنس میں مجھے بھی شامل کر لیں گے یا کچھ نہ کچھ تو مجھے دیں گے، ہمیشہ سے ایک شاندار کار، بڑی کوٹھی میری خواہش رہی تھی، اسی خواہش کے ہاتھوں میں عاتکہ کا انتخاب کیا اور اس وقت تو اصل بات میں خود سے بھی چھپائی تھی۔

میں خود کو بہت اچھا منصوبہ ساز سمجھتا تھا لیکن آج منہ کے بل گرا تھا اور پھر بندہ اپنی چال چلتا ہے اور اللہ اپنی چال۔

میں پڑھا لکھا سمجھدار ہوں مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں یہ بھول گیا کہ جو میرے نصیب میں ہے وہ مل کر رہے گا لیکن میں تو لالچ میں اندھا ہو گیا تھا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''تو کرتا وہ ہے جو تو چاہتا ہے، پر ہوتا وہ ہے جو میں چاہتا ہوں تو جب ہوتا وہی ہے جو میں چاہتا ہوں تو تو وہ کر جو میں چاہتا ہوں، پھر ہوگا وہ جو تو چاہتا ہے۔'' اور پھر اللہ کی چال کامیاب ہوئی اور شادی کے ایک سال بعد ہی میرے چچا یعنی میرے سسر فراڈ کیس میں گرفتار ہو گئے ان کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔

جن رشتوں کی بنیاد لالچ پر ہو، وہ کیسے سرسبز ہو سکتے ہیں آج میں برملا کہہ سکتا ہوں میں ایک لالچی مطلب پرست انسان ہوں جسے کسی سے بھی محبت نہیں ہے اگر میں کسی سے محبت کرتا ہوں تو وہ ہے پیسہ، جو ہمیشہ مجھ سے بھاگتا رہا ہے اسی تنگدستی سے تنگ آ کر گھر میں آئے دن فساد ہوتے ہیں، جیسے آج ہوا اور عاتکہ مجھے طلاق دینے کا حکم دے کر اپنی ماں کے گھر چلی گئی۔

میرے ساتھ یہی ہونا تھا میں اسی لائق ہوں اور یہ بربادی کرنی کا پھل ہے، اب مجھے اسی طرح جینا تھا، ناکام، نامراد، بے قرار، اپنی ماں کو دیئے دکھ کے ملال کے ساتھ میں گھٹنوں میں چہرہ گھسا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا کہ یہ اب روز کا معمول تھا اور میرا نصیب بھی۔

☆☆☆

بے نشان سپاہی

رافعہ اعجاز

کہتے ہیں بد سے بد نام برا، ایک گندی مچھلی سارے تالاب کو گندا کر دیتی ہے، پولیس کے محکمے پر بھی یہ محاورا صادر آتے ہیں، لوگ ہمیشہ تصویر کا منفی پہلو ہی دیکھنا چاہتے ہیں، میں بھی پہلے ایسا ہی سوچتا تھا کہ محکمے میں رشوت، حرام مال اور سفارش کے سوا کچھ نہیں، اپنا مسئلہ حل کروانے کے لئے پہلے پولیس کا رشوت سے پیٹ بھرو پھر کام ہوگا، سوچتا تھا کہ پولیس سے جائز کام کروانے کے لئے بھی ناجائز کا سہارا لینا پڑتا ہے، لیکن محکمے سے وابستہ ہونے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ نہیں تصویر کا ایک اور رخ بھی ہے جو پہلے رخ سے بالکل مختلف ہے، جو پہلے رخ کا الٹ ہے جو لوگوں سے چھپا ہوا ہے، جس سے لوگ ناواقف ہیں، کوئی بھی معاشرہ دو عناصر سے مل کر بنتا ہے بدی اور نیکی، یہ ایسی قوتیں ہیں جو ازل سے ساتھ ساتھ ہیں اور اب تک ساتھ ساتھ چلتی رہیں گی، یہاں بھی بدی نے اپنے پیر جمائے ہوئے ہیں لیکن یہ محکمہ بد سے زیادہ بدنام ہے، بہت سے سپاہی اپنے حصے کی قربانیاں دینے کے بعد خاک تلے جا سوئے اور گمنام ہو گئے، لوگوں کو سڑک کنارے رکشہ ڈرائیور کو تھپڑ لگاتا ہوا سپاہی تو نظر آ جاتا ہے لیکن جون جولائی کی شدید گرمی میں جنوری فروری کے سرد دنوں میں سڑک پر کھڑا وہ سپاہی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے جو موسم کی شدت کی پرواہ کیے بغیر اپنے پیاروں کے ساتھ وقت گزارنے کی بجائے اپنا قیمتی وقت انہیں دینے کی بجائے ٹریفک کے سیلاب کو کنٹرول کرتا ہے اور ایک موٹر سائیکل سوار اس کے روکنے کے باوجود سگنل کو توڑتے ہوئے چلا جاتا ہے، اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے جو اس کی حفاظت کے لئے ہی بنایا گیا ہوتا ہے دراصل یہ ہماری سوچ کا فتور اور نظر کا قصور ہے جو ہمیں کچھ اور سوچنے اور دیکھنے ہی نہیں دیتا۔

میں بڑا تو کیا چھوٹا سا لکھاری بھی نہیں ہوں، مجھے لفظوں کا ہیر پھیر نہیں آتا، آج سے پہلے میرا قلم کسی موضوع پر نہیں اٹھا، چوری، ڈاکہ، مہنگائی، رشوت، دہشت گردی غرض کوئی بھی موضوع میرے قلم کا موضوع نہیں بنا، لیکن ہارون ارشد ایک بہادر سپاہی جس کی بہادری نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس کی بہادری کو اپنے لفظوں میں خراج تحسین پیش کروں، اس کو وہ خراج دوں جس کا وہ حق دار ہے، میرے ضمیر نے گوارہ ہی نہیں کیا کہ میں گمنام رہنے دوں، میرے دل میں تو وہ میرے دل کے مردہ ہونے تک زندہ رہے گا لیکن اس ہیرو کو میں نے اپنی تحریر میں امر کر دیا ہے یہ سوچ کر کہ یہ ہیرا گمنام ہونے کے لئے نہیں ہے، وہ میری تحریر میں ہمیشہ زندہ رہے گا بقول روز ویلٹ ”لوگ مر جاتے ہیں کتابیں زندہ رہتی ہیں“

☆☆☆

”سر میں ہارون ارشد 540 میری آج کی ڈیوٹی ٹائمنگز کیا ہیں۔“ گیلے بالوں کو تولیے سے خشک کرتے ہوئے پوچھا، وہ ایک ہاتھ سے بال خشک کر رہا تھا، جبکہ دوسرے ہاتھ سے موبائل کان سے لگائے ہوئے تھا۔

”شام پانچ سے رات گیارہ بجے تک امام بارگاہ علی اکبر میں مجلس عزا پر ڈیوٹی ہے۔“

”Yes sir“۔ رابطہ منقطع کرتے ہوئے موبائل ڈریسنگ ٹیبل پر ایک طرف رکھا، گھڑی پر ٹائم دیکھا جو شام کے ساڑھے چار بجا رہی تھی اور بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔

”کھانا لاؤں۔“ ماں نے دروازے میں کھڑے پوچھا۔

''ٹھیک ہے لے آئیں۔'' اس نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا اور پھر بیڈ پر بیٹھ کر بوٹ پہننے لگا، ماں نے کھانے کی ٹرے باہر برآمدے میں کچن کے دروازے کے پاس پڑے ڈائننگ ٹیبل پر رکھی اور وہ ہاتھ دھو کر باہر ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا۔

''آلو بینگن۔'' کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے پلیٹ میں سالن دیکھا تو مسکرا دیا۔

''ماں آپ عام کھانے کو خاص کیسے بنا دیتی ہیں؟'' ہارون نے نوالہ توڑ کر سالن کے ساتھ کھایا تو بہت مزے کا لگا، اسے ماں کے ہاتھ کا کھانا بہت اچھا لگتا تھا۔

''کھانا عام ہی ہوتا ہے میرے بیٹے کو خاص لگتا ہے۔'' ماں نے جگ سے گلاس میں پانی ڈال کر بیٹے کے سامنے رکھ دیا۔

''شکریہ۔''

''اگر تمہاری بیوی کو کھانا پکانا نہ آتا ہوا تو؟''

''تو آپ سکھا دینا، ویسے کوئی چند ہزار روپوں کی تنخواہ والے عام سے سپاہی کو بیٹی نہیں دے گا اور پھر اس گھر میں۔'' اس نے ایک نظر خستہ حال گھر کو دیکھا جہاں سے سیمنٹ جگہ جگہ سے اترا ہوا تھا، رنگ نہ کروانے کی وجہ سے مکان اپنی عمر سے زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ کیا بات ہوئی کیا سارے سپاہی کنوارے رہتے ہیں اور پھر میرا بیٹا تو لاکھوں میں ایک ہے۔'' ہر ماں یہی سوچتی ہے خیر چھوڑیں ابھی تو بہت آگے جانا ہے، ابھی تو اپنی منزل کو پانا ہے، میں کون سا کہیں بھاگے جا رہا ہوں شادی بھی کر لوں گا۔'' وہ پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''پریشان کیوں ہوتی ہیں آپ کے لئے پرستان سے پریوں کی شہزادی بہو بنا کر لاؤں گا۔'' ماں کو فکر مند اور پریشان دیکھا تو ماں کی پریشانی کو دور کرنے کے لئے شرارتاً بولا تو ماں مسکرا دی۔

''ابو کدھر ہیں؟''

''محلے میں بارش کے بعد گندا پانی جمع ہو جاتا ہے اس کی درخواست لے کر یو سی گئے ہیں۔''

''جب آئیں تو انہیں میرا اسلام کہہ دیجئے گا۔''

''کہہ دوں گی۔''

''کھانا تو ٹھیک طرح سے کھاؤ۔''

''بس ماں کھا چکا۔'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''واپس کب آؤ گے؟'' وہ بائیک سٹارٹ کر رہا تھا جب ماں نے پوچھا۔

''رات گیارہ بجے ڈیوٹی ختم ہو گی شاید گیارہ بجے آپ کو انفام کر دوں گا۔''

''اللہ حافظ ماں۔''

''جا بیٹا فی امان اللہ۔'' بیٹے کے جانے کے بعد ماں نے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

''دو......ر......دو......ر...... دور سے کوئی آئے چپکے سے دل میں سما جائے ساجنا۔''

''دو......ر......دو......ر...... دور سے دل میں سمانے کے لئے۔''

''بعد میں کوئی آئے گا پہلے تو کل پاکستان سوچ لیگ کے راہنما قاضی محمد شہزاد جلسہ عام سے خطاب فرمانے کے لئے تشریف لا رہے ہیں، وائرلیس پر میسج آیا ہے، سیکورٹی سخت کی جائے۔'' چوکی انچارج نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے جلے کٹے انداز میں کہا۔

''لیکن سر میری ڈیوٹی تو ابھی ختم ہوئی ہے۔'' ہارون احتجاجاً بولا۔

''تم لوگ چند ہزار روپوں میں بک چکے ہو، احتجاج کا حق نہیں رکھتے ویسے بھی ڈیوٹی 24 گھنٹے ہوتی ہے۔''

''لیس سر! یہ تو ہے۔'' میں انچارج کی بات سے مکمل طور پر متفق تھا جب اپنے پر خود ہی شوق میں کاٹ لئے تو پھر پرواز کی خواہش گناہ ہے آخر سکون میں ایک فریق ہی رہ سکتا ہے۔

''الرٹ رہنا ہے سخت سیکورٹی کے آڈرز ہیں۔'' انچارج نے ایک بار پھر الرٹ رہنے کی تاکید کی تھی۔

''کتنی عجیب بات ہے عوام کی سیکورٹی اور عوام کے خادموں کی سیکورٹی میں اتنا فرق۔'' ہارون تاسف سے بولا۔

''ہمارے سیاستدان عوام کے خادم نہیں غیر ملکی خادم ہیں۔''

''لیکن سیاستدان ہیں تو ہم میں سے ہی۔''

''ہماری حالت ایسی ہے جبھی تو سیاستدان ایسے ہیں۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ دہشت گردی ہمارے ملک میں کیسے آ گئی۔'' ہارون اور انچارج کا موضوع بحث سیاست تھا لیکن میں انہیں دہشت گردی کی طرف لے آیا تھا جو سیاست کبھی پیچیدہ قسم ہے۔

''یہ جنگ ہماری نہیں ہے ہم پر مسلط کی گئی ہے، اس پرائی جنگ کو ہماری جنگ بنا دیا گیا ہے۔'' ساتھ بیٹھا علی بول اٹھا تھا۔

''نائن الیون ایک واقعہ ہی دہشت گردی کی جڑ ہے اس سے پہلے نہ کوئی دہشت گردی تھی اور نہ ہی القاعدہ اور اسامہ کا کسی کو علم تھا۔''

''نائن الیون کے بعد پتہ نہیں کتنے حملے ہو چکے ہیں لیکن معصوم لوگ تو صرف WTC اور پینٹاگون میں ہی موجود تھے، عراق، شام، فلسطین، میں تو سب واجب القتل انسان ہیں وہاں تو کوئی معصوم شہری نہیں رہتا، جہاں لاکھوں لوگ امریکا کی خود ساختہ جنگ کی نظر ہو چکے ہیں۔'' انچارج کے لہجے میں امریکہ کے لئے نفرت ہی نفرت تھی۔

''لیکن سر ہم سب سے بڑے دہشت گرد ہیں کیا ہمارا مذہب ہمیں زندگی گزارنے کے اصول نہیں سکھاتا، کیا ہمارے دوستوں اور دشمنوں میں فرق نہیں بتاتا؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا ایمان ہی بہت کمزور ہے اگر ہم قرآن پر عمل کرتے ہماری صفوں میں اتحاد ہوتا تو دشمن کبھی بھی ہماری صفوں میں چالاکیاں دکھانے نہ آتا۔'' اس نے کتنی گہری بات کی تھی لوگ تصویر کا اور رخ دیکھتے ہیں اور وہ اور رخ دیکھتا تھا، اسے لمحے مجھے لگا کہ اس کا ایمان بہت مضبوط ہے، جو باتوں سے زیادہ عمل پر یقین رکھتا ہے، مجھے لگا کہ وہ اپنے نفس میں جھانکتا ہے، دوسروں کی اصلاح کے لئے بھی پہلے اپنی اصلاح کرتا ہے۔

''سر چھوڑیں بڑی سخت بھوک لگی ہے۔'' منیب جو کافی دیر سے ہماری گفتگو سے لاتعلق بیٹھا بور ہو رہا تھا بالآخر بول ہی اٹھا۔

''بھوک واقعی ہی زوروں کی لگی ہے۔'' مجھے منیب کا گفتگو میں خلل ڈالنا اچھا تو نہیں لگا تھا لیکن بات اس کی بھی سولہ آنے سچ تھی، پیٹ اگر خالی ہو تو زیادہ دیر باتوں سے بھرا نہیں جا سکتا، سب سے بڑا عذاب پیٹ کا خالی ہونا ہی ہے۔

''اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔'' انچارج نے مسکراتے ہوئے کہا اور ملازم کو کھانا لانے کو کہا۔

☆☆☆

حساس مقامات پر پولیس نے ناکے لگا

رکھے تھے پورے شہر میں پولیس کے دستے تعینات کیے گئے تھے، بندقوں اور محافظوں کے سائے میں قاضی محمد شہزاد صاحب تشریف لائے تھے، سارا دن سخت ڈیوٹی کرنے کے بعد ہارون شام ہی گھر لوٹا تھا، کھانا کھانے کے بعد وہ ماں کی گود میں سر رکھے لیٹ گیا، یونیفارم کی شرٹ کا ایک کونا پینٹ کے اندر تھا جبکہ باقی شرٹ باہر تھی۔

''یونیفارم تو اتار لو۔''

''ابھی دل نہیں کر رہا۔'' ہارون تھکے تھکے انداز میں بولا۔

''سکول سے لے کر آج تک تمہاری عادت نہیں بدلی۔''

''ماں پرانی عادت ہے اور پھر نوکری بھی یونیفارم والی تلی ہے۔'' ہارون آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''میرا بیٹا تھک گیا ہے۔'' ماں نے بیٹے کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''جی ماں بہت تھک گیا ہوں۔'' ہارون نے تھکاوٹ کی وجہ سے آنکھیں موند لیں۔

''تم کوئی اور نوکری کیوں نہیں کر لیتے اور کچھ نہیں تو اپنے ابو کے ساتھ سٹور پر ہی بیٹھ جایا کرو چھوڑ دو یہ بے وقت کی نوکری۔''

''ماں یہ نوکری میرا شوق بھی ہے، یہ نوکری بری تو نہیں بس ذرا وقت کا پتہ نہیں چلتا، ویسے بھی ایف اے کے بعد میں سے اچھی نوکری ملنا مشکل ہے۔''

''خاک اچھی نوکری ہے جب ہمیں تمہاری ضرورت ہوتی ہے تو تم ہوتے ہی نہیں عید پر بھی تب آتے ہو جب لوگ عید منا چکے ہوتے ہیں۔''

''ہم عید نہیں مناتے اسی لئے تو لوگ عید مناتے ہیں اور جب لوگ عید منا چکے ہوتے ہیں تب ہم منا لیتے ہیں ایک ہی بات ہے بس پہلے اور بعد کا فرق ہے۔'' ہارون آخر میں مسکرا کر بولا۔

''ماں کل میں آپ کے لئے بہو پسند کرنے جا رہا ہوں۔''

''ہماری بہو ہمارا بیٹا پسند کرنے جا رہا ہے۔'' باپ سٹور سے لوٹا تو سامنے بیٹے کو لیٹا دیکھ کر مسکرا دیا۔

''السلام علیکم ابو!''

''وعلیکم السلام لیٹے رہو۔'' کرسی پر بیٹھتے ہوئے باپ نے بیٹے کو لیٹے رہنے کو کہا۔

''یہ کچھ پیسے ہیں ہمیں ہارون کی شادی تو کرنی ہی ہے لیکن اس سے پہلے سوچ رہا تھا گھر کی حالت کچھ ٹھیک ہو جائے۔'' انہوں نے والٹ سے ہزار کے چند نوٹ نکال کر بیوی کو تھما دیئے۔

''اور صاحبزادے کیسے ہو کیا ہو رہا ہے آج کل بہت کم گھر میں نظر آتے ہو۔''

''کچھ خاص نہیں وہی پرانے شغل ہیں۔''

''امی آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' ماں نے اس کا سر تکیے پر رکھا تو وہ بول اٹھا۔

''تم ابو سے باتیں کرو میں تھوڑے سے برتن ہیں وہ دھولوں۔''

''نہیں ماں آپ بھی ادھر ہی بیٹھیں میرا دل آپ دونوں سے باتیں کرنے کو چاہ رہا ہے۔'' ہارون نے ماں کو ہاتھ سے پکڑ کر وہیں بیٹھنے کو کہا۔

☆☆☆

''ہیلو شاہین چوکی۔'' فون پر بیل ہوئی تو چوکی انچارج نے فون اٹھاتے ہوئے کہا۔

''سر پلیز ہیلپ چوری ہو گئی ہے۔'' کال کرنے والا مکمل طور پر حواس باختہ تھا۔

''کہاں چوری ہوئی ہے پتہ لکھوایئے۔'' سب انسپکٹر نے کاپی اور پنسل پکڑے ہوئے کہا۔

''سر پلیز ہیلپ می کوئی میرا دل چرا کر لے گیا ہے۔'' بولنے والے کے لہجے میں روانی تھی۔

''نان سینس، بڑا فالتو ٹائم ہے ان کے پاس۔'' انچارج نے ریسیور کو گھورا اور کریڈل پر رکھ دیا۔

''سر کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں بس بکواس کرنے کی عادت ہے لوگوں کو بول رہا تھا چوری ہو گئی ہے کوئی میرا دل چرا کر لے گیا ہے۔'' انچارج کے کہنے پر میرا ہارون اور منیب کا زوردار قہقہہ بلند ہوا تھا، یقیناً ریسیور کے اس پار بھی کوئی ہنسا ہوگا، انچارج کے گھورنے پر ہماری ہنسی کو بریک لگ گیا تھا۔

''ویسے تو عوام کے پاس ہر چیز کی کمی ہے لیکن ایک چیز بہت وافر ہے۔'' انداز سخت ناراضگی والا تھا۔

''وہ کیا سر!'' منیب کو سمجھ کم ہی آتا تھا، اس کا مذاق چوکی کا ہر فرد اڑاتا تھا۔

''وقت۔''

''ویسے سر ہیلپ لائن پر بھی چارجز ہونے چاہیں۔''

''میرا بس چلے تو سب سے بھاری ٹیکس ہیلپ لائن پر لگاؤں یہ عوام نہیں سدھرنے والی۔'' چوکی انچارج تپ کر بولا۔

''خیر چھوڑو باقی سب لڑکے تو اپنی ڈیوٹیوں پر ہیں نا۔''

''جی سر!''

''وہ...... وہ...... دو ڈاکو محلہ شمس آباد میں ایک بوڑھے آدمی کو لوٹ رہے ہیں، مال نہ دینے پر اسے مار رہے ہیں۔'' ایک حواس باختہ شخص اندر داخل ہوا تو مین گیٹ پر تعینات سپاہی اسے اندر لے آیا تھا، اس کی پھولی ہوئی سانس اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ بھاگتا ہوا آیا ہے۔

''ایک اور جھوٹ۔'' منیب نے کرسی سے ٹیک لگا لی۔

''ہیری اپ جلدی جاؤ۔'' انچارج کے کہنے پر ہارون نے جلدی سے اٹھ کر بائیک سٹارٹ کی، انچارج کے گھورنے پر منیب ایس ایم جی لے کر پیچھے بیٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

موٹر سائیکل ایک سنسان گلی کے اندر رکا، گرمیوں کی دوپہروں میں گلیاں اکثر سنسان ہو جاتی ہیں، دو ڈاکو چہرے پر کالی چادر لپیٹے بوڑھے آدمی سے تھیلا چھیننے کی کوشش کر رہے تھے، پولیس کو دیکھ کر ڈاکو نے ہوائی فائر کیا، منیب خوف کے مارے واپس بھاگ گیا عمر نے مڑ کر دیکھا تو وہ اکیلا تھا، پینٹ پر ہاتھ پھیر کر پسٹل چیک کیا لیکن وہ پاس نہیں تھا، کوپ منیب کے پاس تھی جو کہ بھاگ کر جا چکا تھا، ہارون کو منیب کی بزدلی پر غصہ تو بہت آیا لیکن وہ وقت ضائع کیے بغیر ڈاکوؤں سے گتھم گتھا ہو گیا اور تھیلا واپس لینے کی کوشش کرنے لگا، ہارون نے ڈاکو کو دھکا دے کر تھیلا اس کے ہاتھ سے چھین لیا دوسرا ڈاکو ہارون کی طرف لپٹا تو ہارون نے ایک مکا اس کی ناک پر مارا جس کی وجہ سے ناک سے خون بہنے لگا تھا، دوسرا ڈاکو ہارون سے تھیلا چھیننے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا، بوڑھے آدمی نے نحیف ہڈیوں سے زور لگا کر ڈاکو کو ہارون سے الگ کرنے کی کوشش کی تو جواباً پہلے ڈاکو نے بوڑھے شخص کو پیچھے گرا دیا، جبھی ایک فائر کی آواز آئی، فائر نے ڈاکو کو ر

پر ہارون کی گرفت کو کمزور کر دیا تھا، پیٹ سے خون کی ندی بہنے لگی تھی ایک اور فائر کی آواز آئی، ہارون نے اپنے پیٹ سے بہتے خون کو دیکھا، تھیلا اس کے اتھ سے گر گیا تھا، ڈاکو نے اٹھانے کی کوشش کی تو ہارون نے پاؤں تھیلے پر رکھ کر اس کی اس کوشش کو بھی ناکام بنا دیا تھا، فضا میں پولیس کی گاڑی کے سائرن کے بجنے کی آواز آ رہی تھی، ڈاکوؤں نے تھیلا وہیں چھوڑا اور بھاگ گئے، ہارون بند ہوتی آنکھوں سے زمین پر گرا اور تھیلا بزرگ کی طرف کھسکا دیا، ہارون کے پیٹ سے بہتا خون دیکھ کر بزرگ کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے، ہارون نے آخری نظر بزرگ کے پاس پڑے تھیلے کو دیکھا اور پھر زندگی کے ساتھ جڑی آخری سانس بھی ختم ہوگئی، وہ نامراد ایک عظیم سپاہی کی جان لے کر بھاگ گئے تھے، خود کو جہنم کی آگ کا ایندھن بنالیا تھا، مال لوٹنے پر شاید خدا ان کو معاف کر دیتا لیکن ایک ماں کی آہوں کو کیسے نظر انداز کرے گا، خدا ایک باپ کی جھکی کمر کو کیسے بھول جائے گا، بوڑھے آدمی نے ہارون کو اٹھانے کی کوشش کی۔

''جاؤ یہ لے جاؤ کوئی اسے اٹھا دے۔''

بوڑھا آدمی لرزتی کپکپاتی آواز میں بول رہا تھا، آواز گلے سے بمشکل نکل رہی تھی، لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو چکا تھا جن میں بہت سے لوگ تھے جو ہارون کو ڈاکو سے لڑتے دیکھ کر کونوں میں چھپ گئے تھے، پولیس بھی پہنچ چکی تھی، سب انسپکٹر نے ہارون کی آدھ کھلی آنکھوں کو بند کیا اور اپنے سر سے کیپ اتار دی، اپنے اندر ہونے والی تکلیف پر قابو پاتے ہوئے لاش کو اٹھانے کا حکم دیا، کچھ دیر پہلے ہنستا ہوا ہارون اب لاش بن چکا تھا یہی زندگی کی حقیقت ہے۔

☆☆☆

اگلے دن اخباروں کی مقامی خبروں میں خبر چھپی تھی۔

''تیس تولے سونا لوٹتے ڈاکو کے ہاتھوں ایک پولیس اہلکار شہید۔'' اور پھر اس سے اگلے دن ایک اور نئی خبر ہمارے اخبار اس طرح کی خبروں سے بھرے پڑے ہیں لوگوں کے پاس چند گھنٹوں کے لئے چٹ پٹی خبر آئی اس کے بعد سب بھول گئے، منیب کی بزدلی نے پولیس کے محکمے پر ایک دھبہ لگایا تھا جسے ہاورن نے اپنے خون سے دھو ڈالا تھا، لیکن سب کی باتوں کا مرکز پولیس کی بزدلی تھی، اس کی بہادری چند گھنٹوں کے ذکر کے سوا کچھ نہیں تھی، ہماری مثال ایسے لوگوں جیسی ہے جو بظاہر دیکھتے اور سنتے ہیں لیکن پھر بھی دیکھتے اور سنتے نہیں ہمیں عادت ہو چکی ہے، ہارون نے کسی بڑے محاذ پر لڑتے ہوئے جام شہادت نوش نہیں کیا تھا، نہ ہی کسی بہت بڑے دہشت گرد کو پکڑتے ہوئے، وہ مقامی چوکی کا عام سا پولیس اہلکار جسے اس کی بہادری نے خاص بنا دیا تھا، جنت والوں نے اسے خوش آمدید کہا ہوگا، وہ یقیناً تصور میں اپنی ماں سے ملا ہوگا یہ بتانے کے لئے کہ اس کے اردگرد بہت سی حوریں اور پریاں ہیں جو اس کی آمد پر بہت خوش ہیں، علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

''مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔''

وہ ایک سچا اور پکا مومن تھا جس کا ایمان مضبوط تھا، وہ ڈر کر بھاگا نہیں تا، وہ اپنی جیت تک لڑا تھا، وہ کوئی عام نہیں تھا خاص تھا بہت ہی خاص اس کے لئے کہ وہ بہادر سپاہی تھا، اس لئے کہ وہ شہید تھا۔

☆☆☆

کتاب نگر

دور از کار افسانے

مصنف: زیب ازکار حسین

تبصرہ: سیمیں کرن

جدید افسانہ نگاروں میں زیب ازکار حسین اک صاحب طرز افسانہ نویس ہیں جن کا اپنا اک الگ تھلگ اسلوب ہے، اک خاص کیفیت میں لکھے یہ افسانے واقعی ''دور از کار افسانے'' کہلانے کے لائق ہیں۔

ڈاکٹر مشرف احمد اپنے تبصرے ''اردو کی زیب رنگ کہانیاں'' میں لکھتے ہیں۔

''جدید کہانی کے اختتامی دور تک پہنچتے پہنچتے یہ کہا جانے لگا کہ یہ سب کچھ عبوری مدت کی کہانیاں تھیں جو آئندہ لکھی جانے والی جدید علامتی کہانیوں وغیرہ کے لئے کھاد کا کام دیں گی اور غیب سے کوئی مرد خدا کہانی کے صنف میں نمودار ہونے والا ہے، زیب انکار کی کہانیاں پڑھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ یہی بات ان کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے پھر خیال آیا کہ ایسی تعریف ان کے شوق سفر میں مزاحم نہ ہو جائے البتہ اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ ان کی کہانیاں جدید ہوتے ہوئے بھی بھرپور سی کہانیاں ہیں''

زیب ازکار حسین اک نامور صحافی اور مستند افسانہ نگار ہیں، ان افسانوں کو پڑھ کر، اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ زیب ازکار حسین داخلی سطح پر جن تجربوں اور کیفیات سے آشکار و گرفتار ہوئے ان کا سجاؤ اسی علامتی اسلوب میں ممکن تھا کہ کیفیت درد کی طرح ہے اسے محسوس کیا جا سکتا ہے مشاہدہ بھی اس کا باطنی آنکھ سے ہی ممکن ہے، تیرہ افسانے، مختلف داخلی و خارجی تجربے لئے ہوئے اور ان کے عنوان اس سے بھی زیادہ چونکاتے ہوتے ہیں۔

پہلا افسانہ میں نے موضوع تبدیل کر دیا ہے، اک متوجہ کرتا عنوان اور مارشل لاء وہ اس معاشرے پر جہاں سیاسی بیماریاں اخلاقی بن گئی ہیں اور اک طویل ناختم ہونے والا سلسلہ ہے، یہ افسانہ اس معاشرے پر اک گہرا طنز ہے دیکھئے۔

''اس ملک کی بتی گل ہو جائے تو بھی لکھوں گا اس وقت تک لکھنے کی کوشش کرتا رہوں گا جب تک اس دنیا کی بتی......!

جب علامتوں کا استعمال ہے یوں لگتا ہے کہ تحریر خود سراپا احتجاج ہے، کہ ''نیلی روشنائی سے لکھی گئی عبارت سرخ روشنائی میں بدل گئی اور افسانے کے اختتام پر۔

''وہ کہتے ہیں لکھو، مگر لکھنے نہیں دیتے۔

اگلا افسانہ ''لے لام کی مشکل'' اک خاص انسانی کیفیت کا اظہار ہے ذہن انسانی کے اس کرب کا اظہار جب وہ کیفیت کے اس دائرے میں داخل ہو جاتا ہے جہاں لفظوں کا دم گھٹ کر ان کی صورت مسخ ہو جاتی ہے اور وہ اظہار یا Expression کا دباؤ سہارنے کے قابل نہیں رہتے، کہ

''لگتا ہے لفظ مشکل نہیں، ادائیگی مشکل ہے''

''بے زبان کا خواب'' اک ''کریزی'' نامی کتے کی داستان ہے جو گھر کے بچوں کی زیر تربیت لفظ بنانا سیکھ لیتا ہے اور لفظ ''ڈریم'' کا بنا

لینا دراصل اک ایسے خواب کی تعبیر ہے جو تیسری دنیا کے سسکتے انسان دیکھتے تو ہیں مگر حاصل کرنے کے لئے قابل نہیں۔

زیب ازکار حسین کے ہاں آپ کو خارجی دکھ ذاتی کیفیت میں ڈھلے نظر آئے گے جوان کے بے حساس اور نرم دل ہونے کی دلیل ہے، دیکھئے۔

''اماں چھوڑو یار تم تو ہر بات میں گھبرا جاتے ہو، کبھی کوئی کتوں پر بھی اپنا دماغ ضائع کرتا ہے اگر تم جیسا ذہین آدمی کسی اچھے کام پر اپنی صلاحیتیں صرف کرے تو معلوم نہیں کس درجے پر فائز ہو۔''

اگلا افسانہ ''دس پریشانیوں کی رخصتی اور بیس مسائل کی آمد'' آمد ہے۔

''دس پریشانیاں اچانک گم ہوگئیں میں ان کی تلاش میں مارا مارا پھرا، دس دن گزر گئے کوئی سراغ نہیں مل سکا۔''

اس افسانے کو پڑھ کر میرے ذہن میں جو سوال پیدا ہوا کہ وہ یہ تھا کہ پریشانی سوچ کی منتشر کیفیت ہے جو مسئلے کو جنم دیتی ہے یعنی علت معلو کا تناسب ہے جبکہ زیب ازکار نے گویا ان میں تصادم دکھایا ہے؟ یوں لگتا ہے کہ جیسے دو گروہوں کو تشخص دے دیا ہو، بے نام کردار معاشرے میں پریشانیوں اور مسائل میں گھرا انسان۔

''تین میں نہ تیرہ میں'' اک جملہ نہ لکھ کر صرف محاوروں کے استعمال سے زیب ازکار نے پوری کہانی بن دی، حرف ولفظ سے زیب ازکار کی عجب سنگت ودوستی ہے۔

''ناپسندیدہ وقت'' میں بھی زبان کا اک عجیب تجربہ ملے گا وہ زبان جو آپ کے گھر کے بچے بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ کوئی غیر ماورائی مخلوق بول رہی ہے تو اک ایسا گھر جہاں کسی مخلوق نے اس گھر کے بچوں کی زبان کو اوڑھ لیا ہے۔

''مزاج'' دکھ تکلیف و بیماری کی حالت میں جیسے اپنے بدن کی توانائی کو یا پھر ذہنی طاقت کو ناقدانہ نظر سے دیکھا ہے دیکھئے۔

''میں کون ہوں؟ مجھے اپنے بارے میں کیا معلوم ہے؟ اپنے بارے میں کیا سوچا جا سکتا ہے اور اپنے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے، اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا جا سکتا؟ اور اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

اک اور افسانہ ''خودکشی کے احترام میں'' دیکھئے اک چونکاتا عنوان اور اس سے زیادہ چونکاتا یہ مکالمہ ہے، جی یہ افسانہ دراصل اک مکالمہ اک خودنوشت ہے اس نفسیاتی اذیت و کرب کی جس سے وہ شخص گزر رہا ہے جب وہ زندگی کو رخصت دیکر خودکشی کا احترام کرنے لگتا ہے، وہ کرب واذیت اور حقیقتوں کا ادراک کہ آنے والے لمحے تصویر ہوگئے ہیں۔

''تم سو رہی ہو؟ سوتی رہو، گہری نیند سوتی رہو، تمہیں کچھ دیر کے بعد رونا بھی تو ہے، زیادہ رونا دھونا مجھے اچھا نہیں لگتا، دنیا کو دکھانے کے لئے ''رونا دھونا، ضروری تو ہوتا ہے مگر میرے کیس میں ایسا کرنا غیر ضروری ہے بلکہ میں اگر کہہ سکتا تو کہہ دیتا ''میری روح کو تکلیف ہوگی۔

اور پھر اک اعتراف اور منفی سوچ کی عکاسی بھی کیا خوب ہے جو اک خودکشی کا استقبال کرنے شخص میں پائی جاتی ہے۔

''یہ درست ہے کہ میں تمہاری باتوں کو توڑ مروڑ کر سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ میں نے اس میں تخیلاتی گرد و غبار شامل کر دیا ہے اور میں نے کسی حد تک منفی رخ کو ابھرتا ہوا محسوس کیا ہے۔''

اک ایسے حساس شخص کی روداد جو زندگی کے روزمرہ اور مروجہ دکھ درد سے بغاوت کر رہا ہے حساسیت کی وہ انتہا کہ روزمرہ کی معمولی باتیں بھی رنجش وغم کا باعث بن جائیں۔

''اک ضروری بات'' میں اگر زیب ازکار حسین مجھے اجازت دیں اور یہ اجازت ورخصت یقیناً اک ناقد کی نہیں اک سچے قاری کی ہے کہ اپنی کم علمی کا اعتراف ہے مجھے تو میں اسے افسانے کی بجائے اک خوبصورت انشائیہ کہوں گی جسے افسانوی رنگ میں لکھا گیا، طنزیہ پیرائے ہونے کے باوجود شائستگی نے دامن کہیں نہیں چھوڑا اور شائستگی، حساسیت خارجی دکھ ذات کا حصہ اپنے اور کہیں عجب روحانی کیفیات میں گھری تحریر یہ زیب ازکار حسین کی تحریر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

''اک ضروری بات'' کا آغاز زیب کیسے کرتے ہیں۔

''آج میں ایک ضروری بات بتانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے عام طور پر ''ضروری بات'' کے نام پر ''غیر ضروری'' باتیں سننا پڑی ہیں۔''

اور یہ کہ ''اصل میں میری خواہش تو یہی ہے کہ ''ضروری بات'' کوئی اور ہی کہہ دے پھر آخری افسانہ ''ٹنڈ منڈ تحریر'' بقول زیب ازکار ''عجب سے تحریر تھی مٹی مٹی رنگت، اڑے اڑے سے حروف کمزور لفظ اور حواس باختہ عبارت لگتا تھا اس عبارت کے حروف ٹنڈ منڈ درختوں کی صورت زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئے تھے۔''

یوں لگتا ہے کہ زیب ازکار داخلی سطح پر کسی ایسے تجربے سے دوچار ہوئے کہ مقام حیرت پر کھڑے ہیں، حیرت زہانت کا اعلیٰ مقام اور پھر اس سے آگے عشق کی سرحد شروع ہوتی ہے، اک ایسا انوکھا تجربہ جس میں انہیں حروف زخمی و مجروح نظر آئے ایسے مجروح کہ ان کے کچھ اعضاء ہی شکستگی کا شکار ہوگئے۔

حروف کی شکستگی کا ذکر یوں ہے کہ لگتا ہے ان کو شخصیت عطا کر دی گئی۔

شہر و ملک کے حالات نے زیب ازکار حسین کو اس طرح متاثر کیا کہ یہ اثرات ان کی تحریر میں بہت واضح ہوگئے، اک خوفناک حادثہ جیسے کہ مقام حشر ہو، کہ حروف نے اپنی ماہیت ہی بدل لی۔

حروف کی گفتگو ومکالمہ ملاحظہ فرمائیے یوں لگے گا کہ اپنے وقت کے نمرود گفتگو کر رہے ہیں۔

''دن بھر اس بات پر اکڑ اکڑ کر چلتے کہ ہم پیدائشی طور پر اپاہج پیدا ہوئے تھے اور ان کو دیکھو، ہاتھ پاؤں تڑوا کر شکر ادا کرتے ہیں۔''

یعنی غرور کی وہ انتہائی مکروہ شکل ہے کہ اپاہج پن وجہل خوبی بن جائے۔

چھوٹے افسانے، جہاں بے نام کردار عجب خود کلامی ومدہوشی سے عجیب کیفیت وکاف کی دنیا کا دروازہ کھولتے ہیں۔

☆☆☆

حاصل مطالعہ

تحریم محمود

قابل رشک

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ۔

''میرے دوستوں میں سب سے زیادہ قابل رشک میرے نزدیک وہ مومن ہے جو ہلکا پھلکا ہو (دنیا کے بکھیڑوں میں بہت زیادہ مشغول نہ ہو) نماز کا انتہائی شوقین ہو، رب ذوالجلال کی عبادت نہایت خشوع وخضوع سے کرتا ہو، تنہائیوں میں بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مصروف رہتا ہو، نیز عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو، اس کی طرف انگلیاں نہ اٹھتی ہوں، بقدر ضرورت اس کے پاس رزق ہو اور وہ اسی پر صبر کیا کرتا ہو۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''موت ایسے شخص کو جلد اپنی آغوش میں لے لیتی ہے، اس پر رونے والے کم ہی ہوتے ہیں اور وہ تھوڑا بہت ہی ترکہ چھوڑتا ہے۔''

سعدیہ جبار، ملتان

قطب

قطب دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو خاموش ہوتا ہے اور اس کے پاس کراماتیں ہی کراماتیں ہوتی ہیں وہ ہر کام خاموشی سے کرتا ہے اور سارے کام اللہ تعالیٰ کی منشاء کے مطابق کرتا ہے، دوسری قسم قطب ارشاد کہلاتی ہے جو ہر چیز کی وضاحت پیش کرتا ہے تاکہ لوگوں کے خیال میں گھٹن پیدا نہ ہوا اور خیال کو دھواں یا گرد نہ لگ جائے۔

آنسہ ممتاز، رحیم یار خان

نکات دانش

O اعتدال بہترین راہ ہے کیونکہ پاؤں آگ کے الاؤ میں ہوں یا برف کی سل پر، دونوں صورتوں میں تپش ہمارا مقدر بنتی ہے۔

O اہمیت دکھ کی نہیں بلکہ دکھ دینے والے کی ہوتی ہے جو کھیل کھیل میں زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔

O انسانیت نور کا دریا ہے، جو ازل کی وادیوں سے نکل کر ابد کی راہوں میں بہتا ہے۔

O جس کے ساتھ تم ہنستے ہو، اسے بھول سکتے ہو لیکن جس کے ساتھ روتے ہو، اسے بھولنا ممکن نہیں۔

O عقل مند اپنے خیالات میں تبدیلیاں کر سکتا ہے، مگر احمق میں اتنی لچک بھی نہیں ہوتی۔

O مہربانی سے ملنا، دعوت دینے سے اچھا ہے۔

O اگر تو آنکھ رکھتا ہے اور ایک عالم تیرے سامنے جلوہ گر ہے تو تجھے کسی معلم یا کسی کتاب کی کیا ضرورت ہے۔

O زندگی میں کوئی کل نہیں ہوتا، نہ آنے والا نہ گزر جانے والا، زندگی میں صرف آج ہوتا ہے۔

O کچھ کانٹے اپنے پاس رکھو کہ یہ پھولوں کی

یادگار ہیں اور باقی اپنے دل میں پیوست کر لو تاکہ دوسروں کا درد محسوس ہو۔

فریال امین، ٹوبہ ٹیک سنگھ

راہ کے دیپ

☆ قبرستان ایسے لوگوں سے بھرے پڑے ہیں جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کے بغیر یہ دنیا اجڑ جائے گی۔

☆ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کر دے۔

☆ خوشامد سے پرہیز کرو، یہ جہالت سے شروع ہوتی ہے اور ندامت پر ختم ہوتی ہے۔

☆ شہرت ایک بے وفا محبوبہ ہوتی ہے، لیکن اس کا حسن، اس کی ادائیں انسان کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس کے پہلو میں رہے گی۔

☆ دکھ کی دراڑیں چہروں سے تو رخصت ہو جاتی ہیں، لیکن وہ انسان کے اندر اتر کر اس ایک گوشے کو ویران کر دیتی ہیں، جو کسی ایک شخص کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔

☆ جب روزی ملنے میں دیر ہو تو استغفار میں جلدی کرو۔

نازیہ کمال، حیدرآباد

چار قسم کے دل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

''دل چار قسم کے ہیں۔''

۱۔ ایک تو پاکیزہ دل جو روشن چراغ کی طرح چمکدار ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا وہ دل جو غلاف آلودہ ہے۔

۳۔ تیسرا وہ دل جو الٹا ہے۔

۴۔ چوتھا وہ دل جو مخلوط ہے۔

پہلا دل تو مومن کا ہے جو نورانی ہے، دوسرا کافر ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں، تیسرا دل خالص منافقوں کا ہے جو جانتا ہے اور انکار کرتا ہے چوتھا دل اس منافق کا ہے جس پر ایمان اور نفاق دونوں جمع ہیں ایمان کی مثال اس سبزے کی طرح ہے جو پاکیزہ پانی سے بڑھ رہا ہے اور نفاق کی مثال اس پھوڑے کی طرح ہے جس میں پیپ اور خون بڑھتا ہی جاتا ہے، (تفسیر ابن کثیر جلد ۱)۔

مریم رباب، خانیوال

قطرہ قطرہ

O خدائے کریم کے تمام عطیوں میں سے حکمت سب سے بڑھ کر ہے اور حکیم وہ شخص ہے جس کے قول و فعل دونوں یکساں ہوں۔

O قطرہ دریا میں مل جائے تو قطرہ نہیں رہتا۔

O عقل ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی اس کے مقابلے میں عشق کی کوئی حد نہیں ہے یہ وہاں تک جاتا ہے جہاں تک انسان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

O کردار اور مالا ہے اگر اس کا ایک موتی بھی ٹوٹ جائے تو ساری مالا بکھر جاتی ہے۔

O حاکم وقت ایک دریا کی مانند ہے اور رعایا چھوٹی ندیاں اگر دریا کا پانی میٹھا ہو گا تو ندیاں بھی میٹھا پانی دیں گی اور اگر دریا کا پانی تلخ ہو گا تو لازماً ندیوں کا پانی بھی تلخ ہو گا۔

ام خدیجہ، شاہدرہ لاہور

انمول موتی

☆ زندگی صرف تین سانسوں پر مشتمل ہے، ایک گزر گیا، ایک لینا ہے جس کا یقین نہیں ایک وہ جو لے رہے ہیں، ورنہ تو یہ زندگی ایک

سانس ہی کی ہے۔

☆ اگر اندھیرا ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو زیادہ روشنی میں بھی سایہ ساتھ نہیں دیتا، فرق صرف اتنا ہے کہ غریبی میں لوگ ہمارا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور امیری میں ہم لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

☆ احساس کی بات ہے کہ جسم میں روح ہے تو آدمی اس سے نہیں ڈرتا اور جب جسم سے روح نکل جاتی ہے، تو آدمی اس کے ڈرتا ہے، حالانکہ مرا ہوا آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔

☆ چھوٹے چھوٹے اخراجات کا خیال رکھو، کیونکہ ایک چھوٹا سا سوراخ بہت بڑے جہاز کو ڈبو سکتا ہے۔

☆ اللہ کے ساتھ وابستہ ہونا زندگی ہے اور اس سے غافل ہونا موت ہے۔

☆ پتھروں سے واسطہ پڑے یا پتھروں سے زندگی کا سفر رکتا نہیں۔

☆ منفرد لوگوں کو ہمیشہ مار سہنی پڑتی ہے، طعنوں کی یا تنہائی کی۔

☆ دیواریں صرف کمروں کی نہیں ہوتیں، دل کے گرد بھی ہوتی ہیں۔

فرح عامر، جہلم

اشارات

نئی سحر کے بہت لوگ منتظر ہیں مگر
نئی سحر بھی جو کجلا گئی تو کیا ہو گا
غم حیات سے بے شک ہے خودکشی آساں
مگر جو موت بھی شرما گئی تو کیا ہو گا
شباب لالہ و گل کو پکارنے والو !
خزاں سرشت بہار آ گئی تو کیا ہو گا
جوان خون نئے کھیت کو مفید سہی
زمین فصل کو خود کھا گئی تو کیا ہو گا
وہ داستاں جو مصائب میں دفن ہے اب تک
زبان حلق پر آ گئی تو کیا ہو گا

فائزہ قسم، سکھر

جیل

جیل میں نو مہینے رہنے کی ٹریننگ تو اللہ ہر انسان کو دے کر زمین پر بھیجتا ہے اور اس دنیا کی پہلی جیل انسانی جسم ہے جس میں بند کر کے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا اس لئے جب انسان مرتا ہے جو کہا جاتا ہے کہ انسان آزاد ہو گیا آنکھیں اس جیل کی روشندان ہیں، جن سے انسان ساری عمر باہر جھانکتا رہتا ہے، زبان جیلر ہے جو جگہ جگہ پکڑواتی ہے پھر انسان نے پانے گرد ایک مصنوعی جیل تعمیر کی جو لباس کہلوائی۔

دیکھا جائے تو یہ دنیا بھی تو ایک جیل ہے جس میں آنے کے لئے اللہ کے حکم کی نا فرمانی کرنی پڑی، بلکہ ہم سب حوالاتی ہیں، جن کے مقدمے کا فیصلہ روز حشر سنایا جائے گا، جنت اور دوزخ بھی تو دو جیل ہیں، ایک میں بندہ خوشیوں کی قید میں ہے اور دوسری میں غموں کی۔

نعیم امین، کراچی

حادثے

حادثے اس طرح بھی ہوتے ہیں
کہ سرِ راہ یوں یہ رستے میں
اجنبی آنکھ کا سحر جاگے
بجلیاں بن کے
ذہن و دل پہ گرے
اور پھر ہوش کھو بیٹھیں

☆☆☆

تسنیم طاہر

فائزہ قاسم ---- سکھر

اب اس کی یاد سے اس کا بدن تراشتے ہیں
وہ خواب ہی تو نہیں تھا کہ ہم بھلا دیتے
اس کے واسطے محسن کہی ہے تازہ غزل
اب اس کی سالگرہ پہ ہم کیا دیتے

....

مٹی کی عمارت سایہ دے کر مٹی میں ہموار ہوئی
ویرانی سے اب کام ہے اور ویرانی کس کی یاد ہوئی
ہر پتی بوجھل ہو کے گری سب شاخیں جھک کر ٹوٹ گئیں
اس بارش سے ہی فصل اجڑی جس بارش سے وہ تیار ہوئی

....

تم کیا جانو ہم نے کس کس غم پر پردہ ڈالا ہے
کتنے درد سمیٹ کے لوگو ہونٹوں پہ آئی ہے ہنسی

نعیم امین ---- کراچی

ان کو ناموس بھی عزت بھی پذیرائی بھی
مجھ کو رونے کو میسر نہیں تنہائی بھی
اپنے ہی حال پہ ہنسنا کبھی ہنس کے رونا
میں بیک وقت تماشا بھی تماشائی بھی

....

جس قدر شور دل میں برپا ہے
اتنا خاموش ہو گیا ہوں میں

....

خون میں کسمسا رہا ہے جواب
کیا محبت پکارتی ہے مجھے

ہما رائے ---- قصور

جو عشق کے سیلاب بلا خیز کو روکے
ایسا ابھی دنیا میں کوئی بند نہیں ہے

ہاں گردش ایام کی زنجیر سے کہہ دو
خوشبو کا سفر وقت کا پابند نہیں ہے

....

اس شجر کی گلیوں میں صدا کر کے تو دیکھو
یہ رسم فقیری بھی ادا کر کے تو دیکھو
رہ جائے گی ہر بات تمہاری بھی ادھوری
تم خود کو کبھی مجھ سے جدا کر کے نہ دیکھو

....

ان کے دوش پہ رکھا گریز کا پتھر
گراں تھا بار سو ہم ناتواں اٹھا نے سکے
غم حیات کی پہنائیوں میں کھو گئے تھے
ہزار بار بھولنا چاہا مگر بھلا نہ سکے

نبیہ آصف ---- قصور

بے دلی کیا یوں ہی دن گزر جائیں گے
صرف زندہ رہے ہم تو مر جائیں گے
کتنی دل کش ہو تم کتنا دل جو ہوں میں
کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

....

لہو سے دل کبھی چہرے اجالنے کے لئے
میں جی رہا ہوں اندھیروں کو ٹالنے کے لئے
وہ ماہتاب صفت آئینہ جبیں محسن
گلے ملا بھی تو مطلب نکالنے کے لئے

....

اجڑ چکا ہے جو شہر وفا بسائے کون
انا کے تخت سے نیچے اتر کے آئے کون
کہاں کا عشق سبھی اپنے اپنے ساتھی ہیں
اداس شام یہاں ترا دکھ بتائے کون

ثمینہ رفیق ---- کورنگی کراچی
کوئی ملال کوئی آرزو نہیں کرتا
تمہارے بعد یہ دل گفتگو نہیں کرتا
کوئی نہ کوئی میری چیز ٹوٹ جاتی ہے
تمہاری یاد سے جب بھی وضو نہیں کرتا

....

رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے
کٹ گئی عمر رات باقی ہے

....

تمہیں دل لگی بھول جانی پڑے گی
محبت کی راہوں میں آ کر تو دیکھو
تڑپنے پہ میرے نہ پھر تم ہنسو گے
کبھی دل کسی سے لگا کر تو دیکھو
رمشہ ظفر ---- بہاول پور
ہوتا نہیں عیاں یہ کبھی ان کے موڈ سے
نیت خراب ہے یا طبیعت خراب ہے

....

شام فرقت ڈھلے ہم نہیں چاہتے
غم سے فرصت ملے ہم نہیں چاہتے
ہم ترے بعد اجڑے ہوئے ٹھیک ہیں
اب کہیں دل لگے ہم نہیں چاہتے

....

عید کی شب آخر نہ پوچھو کس طرح گزری
یہی لگتا تھا کہ ہر پل وہ ہمیں کچھ پھول بھیجے گا
عاصمہ سرور ---- وہاڑی
میں تجھے یاد بھی کرتا ہوں تو جل اٹھتا ہوں
تو نے کس درد کی صحرا میں گنوایا ہے مجھے

....

نہ ملتا نقد جاں دے کر بھی اک لمحہ محبت کا
گراں تھا اس قدر سودا کہ ہم بازار چھوڑ آئے

....

اپنا دکھ بس اپنا دکھ ہوتا ہے یہ جان لیا
اپنے آپ سے ساری باتیں کہنا سیکھ لیا
نئی نویلی تنہائی کے بانہیں ڈال کے بانہوں میں
رات گئے تک نہر کے کنارے بیٹھنے بنا سیکھ لیا
رابعہ ارشد ---- فیصل آباد
جب سے تیرے نام کر دی زندگی اچھی لگی
تیرا غم اچھا لگا تیری خوشی اچھی لگی
تیرا پیکر تیری خوشبو تیرا لہجہ تیری بات
دل کو تیری گفتگو کی سادگی اچھی لگی

....

نہ صرف بنی نہ گھر ہوئی یونہی جلتی بجھتی بسر ہوئی
کبھی زندگی کے چراغ کی نہ ہی شب ڈھلی نہ سحر ہوئی
میری خامشی میرے خواب تھے انہی آہٹوں کے سراب تھے
کئی راستوں سے گزر کے بھی جاہ جن کی گرد سفر ہوئی

....

سنتے ہیں اپنے ہی تھے گھر لوٹنے والے
اچھا ہوا کہ میں نے یہ تماشا نہیں دیکھا
یہ شہر صداقت بھی عجب شہر ہے شبنم
میں نے یہاں اک شخص بھی سچا نہیں دیکھا
مسرت مصباح ---- لاڑکانہ
تیری بے رخی کے دیار میں
گھنی تیرگی کے حصار میں
جلے کس طرح سے چراغ جاں
کرے کس طرح کا سفر کوئی

....

سر بزم جتنے چراغ تھے
وہ تمام رمز شناس تھے
تیری چشم خوش کے لحاظ سے
نہیں بولتا تھا مگر کوئی

....

پھر یوں ہوا کہ نکلے کسی کی تلاش میں
پھر یوں ہوا کہ خود کو نہ پائے تمام عمر
پھر یوں ہوا کہ اور کسی کے نہ ہو سکے

پھر یوں ہوا کہ وعدے نبھائے تمام عمر
ثناء حیدر ---- سرگودھا
میں اس کی شکل کو دل سے اتار دیتا ہوں
کبھی کبھی تو میں خود کو بھی مار لیتا ہوں
یہ میرا حق ہے میرا اسے تھوڑا دکھ بھی دوں
میں چاہت بھی تو اسے بے شمار دیتا ہوں

....

دیکھ اے نوح کی کشتی کے بچانے والے
آیا گرداب حوادث میں سفینہ اپنا
اس مصیبت میں اگر تو کبھی ہماری نہ سنے
تو ہم کس سے کہیں جا کے فسانہ اپنا

....

مسافتوں میں کبھی یوں بھی معتبر ٹھہروں
کہ دو قدم ہی سہی اس کا ہم سفر ٹھہروں
تمہی بتاؤ بھلا کس طرح یہ ممکن ہے
وہ تیرے شہر میں آئے اور میں بے خبر ٹھہروں
درثمن ---- میاں چنوں
شکستہ تحریروں کے میرے خط تم جلا دینا
جو ہو سکے زندگی میری مجھے تم بھلا دینا
تلخیاں پی پی کر زہر آلودہ نہ ہو جائیں کہیں
سکون دل کی خاطر میری جان تم ذرا سا مسکرا دینا

....

اچانک شاخ دل تیری کہیں ویران نہ ہو جائے
پرندے میری یادوں کے اڑا آہستہ آہستہ

....

میں تم کو چاہ کر پچھتا رہا ہوں
کوئی اس درد کا مرہم نہیں ہے
آسیہ وحید ---- لاہور
لڑکیاں ہوتی ہیں پرایا دھن
یہ کہاں سب کے پاس رہتیں

....

کی ساز باز وقت نے ایسی میرے خلاف
جدائیوں کا موسم میرے نام کر گیا

....

ہم تیری یاد سے کترا کے گزر جاتے مگر
راہ میں پھولوں کے لب سایوں کے گیسو آئے
آزمائش کی گھڑی سے گزر آئے تو ضیا
چشم نم جاری ہوا آنکھ میں آنسو آئے
جویریہ ناصر ---- گلبرگ لاہور
کیوں طبیعت کہیں ٹھہرتی نہیں
دوستی تو اداس کرتی نہیں
جس طرح تم گزارتے ہو فراز
زندگی اس طرح تو گزرتی نہیں

....

اس کو کیسے بھول جاؤں ناصر کیسی باتیں کرتے ہو
صورت تو پھر صورت ہے وہ نام بھی اچھا لگتا ہے

....

زمین کا سہارا تو اک دکھاوا ہے محسن
حقیقت میں میرا خدا مجھے گرنے نہیں دیتا
ام ایمن ---- گوجرانوالہ
لکھ رہے ہیں ہم محبت نفرتوں کے درمیاں
آنے والوں کو ہمارے یہ ہنر یاد آئیں گے
رفتہ رفتہ بھول جائیں گے سفر کی داستاں
مدتوں لیکن ہمیں کچھ رہ گزر یاد آئیں گے

....

محبت کا دھواں آنکھوں میں پانی چھوڑ جاتا ہے
کسی رستے سے غم گزرے نشانی چھوڑ جاتا ہے
موت بھی کم خوبصورت تو نہیں ہو گی
جو اس کو دیکھتا ہے زندگانی چھوڑ جاتا ہے

....

اپنے مزاج سے میں خوب واقف ہوں فراز
تھوڑے لوگوں سے ملتا ہوں مگر مخلص ہو کر

☆☆☆

بلقیس بھٹی

نوٹس

امریکہ کے ایک سینما میں ہیٹ پوش عورتوں سے تماشائی اور انتظامیہ دونوں تنگ آ چکے تھے، آخر منیجر نے یہ نوٹس پردے پر دکھایا۔

"انتظامیہ بوڑھی عورتوں کے آرام کا خیال رکھتے ہوئے انہیں مطلع کرنا چاہتی ہے کہ وہ بدستور ہیٹ پہنے رہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

کوئی عورت ایسی نہ تھی جس نے فوراً ہیٹ نہ اتار دیا ہو۔

ہما رائے، کراچی

ٹاس

ایک سنسان سڑک پر ایک راہ گیر نے ایک شخص کو روکا اور کہا۔

"کیا آپ ایک روپے کا سکہ عنایت کریں گے؟" وہ صاحب بولے۔

"ضرور ضرور مگر آپ کو اس وقت اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔" راہ گیر نے جواب دیا۔

"بات یہ ہے کہ میں اور میرا ساتھی ایک روپیہ کا سکہ اچھال کر یہ ٹاس کرنا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے کون آپ کا موبائل لے گا اور کون آپ کا بٹوا لے گا۔"

نبیلہ آصف، قصور

سانس لے رہا ہوں

ٹکٹ گھر کے سامنے لمبی قطار لگی ہوئی تھی، ایک دبلے آدمی کے پیچھے ایک بے پناہ موٹا شخص کھڑا تھا، اچانک دبلے آدمی نے مڑ کے موٹے آدمی سے کہا۔

"ارے بھئی دھکے تو نہ دیں۔"

"دھکے کہاں دے رہا ہوں، میں تو سانس لے رہا ہوں۔" موٹے آدمی نے جواب دیا۔

ثمینہ رفیق، کورنگی کراچی

تربیت

ایک صاحب نے طوطا پال رکھا تھا جو کہ گالیاں بہت دیتا تھا، یہ صاحب طوطے کی اس عادت سے بہت نالاں تھے، آخر وہ تنگ آ کر طوطے کو مولانا کے پاس لے گئے اور کہا۔

"اس کو اچھی عادات سکھا دیں۔" مولانا صاحب نے دو ماہ کے لئے طوطا اپنے پاس رکھ لیا اور اس کی تربیت کرنے لگے دو ماہ بعد وہ صاحب مولانا کے پاس گئے اور طوطے کے بارے میں دریافت کیا مولانا صاحب بولے۔

"ماشاء اللہ آپ کا طوطا گالیاں بکنا چھوڑ چکا ہے اگر آپ اس کی ایک ٹانگ اٹھائیں گے تو یہ بولے گا۔

"السلام علیکم!"

"دوسری ٹانگ اٹھائیں گے یہ تو بولے گا۔"

"اللہ حافظ۔" ان صاحب نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ مولانا کچھ کہتے، طوطا طیش میں آ کر بولا۔

"تو اٹھا تو سہی، میں تیرا ٹیٹوا دبا دوں گا۔"

ثنا حیدر، سرگودھا

ریل گاڑی

"بھائی خیر دین، بڑا دکھ ہوا، ریل گاڑی نے تمہاری گائے کو کچل دیا، اللہ تمہیں صبر دے گا، تمہاری گائے بہت پیاری تھی، بستی میں پھرتی رہتی تھی، وہ ریل گاڑی کے نیچے کیسے آ گئی؟"

"وہ ریل گاڑی کو دیکھ کر بھاگی۔" خیر دین نے کڑوے لہجے میں کہا۔

"اسے دیکھ کر انجن پٹری سے اترا، کھیتوں میں اس کا پیچھا کیا، میدان میں بھی اسے نہیں چھوڑا پھر ہانک کر پٹری پر لے گیا اور اسے کچل کر سیٹی بجاتا ہوا آگے چلا گیا۔"

در ثمن، میاں چنوں

سویرا

ایک لڑکے نے کالج میں پہلے دن ایک لڑکی سے پوچھا۔

"آپ کی تعریف؟"

"مجھے سب بہن کہتے ہیں۔" لڑکی نے شرارت سے کہا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" لڑکے نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے سب بہنوئی کہتے ہیں۔"

آسیہ وحید، لاہور

قابل رشک

ایک دکاندار نے اپنے ملازم سے کہا۔

"محنت اور ہوشیاری سے کام کرو گے تو ایک دن ضرور ترقی کرو گے مجھے دیکھو اس دکان پر ملازم بن کر آیا تھا اور آج مالک بنا بیٹھا ہوں۔" نیا ملازم آہ بھر کر بولا۔

"مگر جناب آپ کے سابق مالک جیسے بھولے بھالے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں۔"

جویریہ ناصر، گلبرگ لاہور

سیاست دان

ایک تقریب میں ایک صاحب کی ملاقات اپنے پسندیدہ سیاست دان سے ہوئی تو انہوں نے ازراہ عقیدت قدرے جوش و خروش سے کہا۔

"آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی میں نے آپ کے بارے میں اتنا کچھ سنا ہے۔"

سیاست دان بات کاٹتے ہوئے بولے۔

"ضرور سنا ہوگا، لیکن آپ اسے ثابت نہیں کر سکتے۔"

ام ایمن، گوجرانوالہ

خوب گزرے گی

دو صاحبان رات گئے ہوٹل میں کمرہ لینے پہنچے، دونوں کچھ زیادہ ہی ترنگ میں تھے اور انہیں اپنا ہوش نہیں تھا، ان کی باتیں ہوٹل کے استقبالیہ کلرک کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں، آخر ان میں سے ایک نے گویا سنبھل کر کلرک کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"یار اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی؟ ہمیں ایک بیڈ چاہیے جس میں دو کمرے ہوں۔"

کلرک نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نہایت تحمل سے کہا۔

"آپ شاید یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ کو ایک کمرہ چاہیے، جس میں دو بیڈ ہوں۔"

"ہاں...... ہم...... ہم یہی تو کہہ رہے ہیں؟" دوسرے صاحب فوراً منمنائے۔

کلرک نے انہیں دو بیڈ والا کمرہ دے دیا لیکن وہاں جا کر وہ دونوں ایک ہی بیڈ پر لیٹ گئے، تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک نے آنکھیں کھولے بغیر مخمور آواز میں اپنے ساتھی کو مطلع کیا۔

"یار! اس کمینے آدمی نے ہمیں ٹھیک کمرہ نہیں دیا، میرے بیڈ میں کوئی اور آدمی بھی گھسا ہوا ہے۔"

"میرے بیڈ میں بھی ایک آدمی گھسا ہوا ہے۔" دوسرے دوست نے ہچکی لے کر کہا۔

"چلو منحوسوں کو نکالتے ہیں۔" پہلے نے تجویز پیش کی، دوسرے نے اس سے اتفاق کیا، دونوں آپس میں زور آزمائی دھینگا مستی کرنے لگے، تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک نیچے گر گیا۔

اوپر والے نے ہانپتے ہوئے اپنے دوست کو مطلع کیا۔

"میں نے تو اس کمبخت کو نکال دیا، جو میرے بیڈ میں گھسا ہوا تھا۔"

"مگر یار میں کامیاب نہیں ہو سکا، میرے بیڈ میں جو گھسا ہوا تھا اس نے مجھے نیچے گرا دیا۔" دوسرے دوست نے روہانسے انداز میں اطلاع دی۔

"کوئی بات نہیں یار!" اس کے دوست نے فوراً تسلی دی۔

"تم آ کر میرے بیڈ پر میرے ساتھ لیٹ جاؤ۔" اس کے بعد وہ دونوں ایک ہی بیڈ پر آرام سے سو گئے۔

عابدہ سعید، گجرات

سوا سیر

مانگ تانگ کر شوق پورا کرنے والے ایک صاحب نے دوسرے صاحب سے کہا۔

"بھائی صاحب! ذرا ماچس دیجیے گا۔"

"یہ لیجیے۔" دوسرے نے بلا تامل کہا۔

"اوہو، میں تو سگریٹ کا پیکٹ بھی گھر بھول آیا۔"

پہلے صاحب جیبوں پر ہاتھ مار کو بولے۔

"یہ تو بہت برا ہوا لاؤ، میری ماچس واپس دے دو۔" دوسرے نے اطمینان سے کہا۔

رمشہ ظفر، بہاول پور

ایک سے بڑھ کر ایک

لیکچر کے دوران پروفیسر صاحب کی نظر ایک اسٹوڈنٹ پر پڑی، جو ڈیسک پر سر رکھے سو رہا تھا، پروفیسر صاحب کو بہت غصہ آیا، انہوں نے اس کے برابر والے لڑکے سے کہا۔

"اس احمق کو جگاؤ۔"

"سر! آپ نے سلایا ہے، آپ ہی جگائیں۔" اس لڑکے نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

فکر

ہیلو ڈاکٹر صاحب میں رضوان بول رہا ہوں، دروازے سے ٹکرا جانے کی وجہ سے میری بیوی کا جبڑا ٹوٹ گیا ہے وہ بے چاری بالکل نہیں بول پا رہی ہے، نہیں نہیں کوئی جلدی نہیں ہے آپ کا اس ہفتہ یا اگلے مہینے ہماری طرف سے گزر ہو تو ذرا اس دیکھتے جائیے گا۔"

☆☆☆

صائمہ محمود

عاصمہ سرور: کی ڈائری سے

جانتا ہوں کہ میرا دل مرے پہلو میں نہیں
پھر کہاں ہے جو ترے حلقہ گیسو میں نہیں
ایک تم ہو کہ تمہارے ہیں پرائے دل بھی
ایک میں ہوں کہ مرا دل مرے قابو میں نہیں
دور صیاد چمن پاس قفس سے باہر
ہائے وہ طاقت پرواز کہ بازو میں نہیں
دیکھتے ہیں تمہیں جاتے ہوئے اور جیتے ہیں
تم بھی قابو میں نہیں موت بھی قابو میں نہیں
حیف جس کے لئے پہلو میں نہ رکھا دل کو
کیا قیامت ہے کہ فانی وہی پہلو میں نہیں

رابعہ ارشد: کی ڈائری سے

ہر کسی کے چہرے میں
ایک ضیاء سی ہوتی ہے
رخ کے ایک حصے میں
حسن کے علاقے میں
اک اداسی ہوتی ہے
اس کو میں نے دیکھا تھا
گرم خو مہینوں میں
اک خوشی کی محفل میں
شہر کے مکینوں میں
اک طرف کھڑے تنہا
جس طرف کو رستے تھے
جن کے ساتھ گلیاں تھیں
جن میں لوگ بستے تھے
بے کشش مکانوں میں
جیسے چاند راتیں تھیں
اس کے سرد چہرے پر
خوشگوار آنکھیں تھیں

مسرت مصباح: کی ڈائری سے

ہاتھ دیا اس نے میرے ہاتھ میں
میں تو ولی بن گیا اک رات میں
عشق کرو گے تو کماؤ گے نام
تہمتیں بٹتی نہیں خیرات میں
عشق بری شے سہی پر دوستو
دخل نہ دو تم میری ہر بات میں
مجھ پہ توجہ ہے آفات کی
کوئی کشش تو ہے مری ذات میں
راہنما تھا میرا اک سامری
کھو گیا میں شہر طلسمات میں
شام کی گل رنگ ہوا ہو چلی
درد مہکنے لگا جذبات میں
ہاتھ میں کاغذ کی لئے چھتریاں
گھر سے نہ نکلا کرو برسات میں
ربط بڑھایا نہ قتیل اس لئے
فرق تھا دونوں کے خیالات میں

سعدیہ جبار: کی ڈائری سے

ان تڑختے نحیف کاندھوں پر
اپنے کنبے کا بوجھ ڈھوتا ہوں
اور جب دل کا بوجھ بڑھتا ہے
بیوی بچوں سے چھپ کے روتا ہوں
ضبط غم کی نہیں کوئی معیاد
بجھتی آنکھیں ستا ہوا چہرہ
یہی انجام سخت کوشی ہے

جوڑتا ہوں رقم کفن کے لئے
یہی اصل سفید پوشی ہے
ہر تگ ودو کی ہے یہی بنیاد
کہہ رہی ہے زبانِ حال مری
میں نے کی ہے ترقی معکوس
روز چھپتا ہوں قرض خواہوں سے
کیسے بنواؤں خوش نما ملبوس
ہر فرصت سے بانجھ بے ایجاد
اک پتھر ہے میرے سینے میں
یا دل ناصبور رکھتا ہوں
عید پر خوش لباس بچوں سے
اپنے بچوں کو دور رکھتا ہوں
آپ ہی صید آپ ہی صیاد
عید کے دن کہیں نکلتے نہیں
میں میری اہلیہ میری اولاد
اس لئے دوستوں کی خدمت میں
خوش رہیں سب بقدر استعداد

آنسہ ممتاز: کی ڈائری سے

میں بھی جھوٹا تم بھی جھوٹے
آؤ چلو تنہا ہو جائیں
کون مریض اور کون مسیحا
اس دکھ سے چھٹکارا پائیں
آنکھیں اپنی خواب بھی اپنے
اپنے خواب کسے دکھائیں
اپنی اپنی سوچوں میں سب
اپنے اپنے خواب سجائیں
اپنے اپنے کاندھوں پہ سب
اپنی اپنی لاش اٹھائیں
شاید لمحہ آئندہ میں
لوگ ہمیں سچا ٹھہرائیں

فریال امین: کی ڈائری سے

کبھی یاد آئے تو پوچھنا ذرا اپنی خلوت شام سے
کے عشق تھا تیری ذات سے
کسے پیار تھا تیرے نام سے
ذرا یاد کر کہ وہ کون تھا جو تجھے بھی عزیز تھا
وہ جو بھی اٹھا تیرے نام سے
وہ جو مر مٹا تیرے نام پہ
ہمیں بے رخی کا نہیں گلہ
کہ یہی وفاؤں کا ہے صلہ
مگر ایسا جرم تھا کون سا
کہ گئے ہم دعا سلام سے
نہ کبھی وصال کی چاہ کی
نہ کبھی فراق میں آہ کی
کہ میرا طریق بندگی ہے جدا طریق عام سے
کبھی یاد آئے تو پوچھنا
ذرا اپنی خلوش شام سے

نازیہ کمال: کی ڈائری سے

سب کاٹ دو
بسمل پودوں کو
بے آب سسکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو
بے کل پھولوں کو
شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو
یہ فصل امیدوں کی ہمدم
اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت، صبحوں، شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی
کھیتی کے کونوں کھدروں کی
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رات کی فکر کرو
جب پھر اک بار اجڑتا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک یہی کچھ کرتا ہے

مریم رباب: کی ڈائری سے

کچھ دے اسے رخصت کر، کیوں آنکھ جھکالی ہے
ہاں در پہ ترے مولا انشا بھی سوالی ہے
اس بات پہ کیوں اس کی اتنا بھی حجاب آئے
فریاد سے بے بہرہ کشکول سے خالی ہے
شاعر ہے تو ادنیٰ ہے عاشق ہے تو رسوا ہے
کس بات میں اچھا ہے کس وصف میں عالی ہے
تعظیم کو اٹھتے ہیں اس واسطے دل والے
حضرت نے مسخیت کی اک طرح نکالی ہے
آوارہ و سرگرداں، کفنی بہ گلو پیچاں
داماں بھی دریدہ ہے گدڑی بھی سنبھالی ہے
آوارہ ہے راہوں میں دنیا کی نگاہوں میں
عزت بھی مثالی ہے تمکیں بھی گنوالی ہے
آداب سے بے گانہ در آیا ہے دیوانہ
نے ہاتھ میں تحفہ ہے نے ساتھ میں ڈالی ہے
بخشش میں تامل ہے اور آنکھ جھکالی ہے
کچھ دیر پر ترے مولا یہ بات نرالی ہے
انشا کو بھی رخصت کی انشا کو بھی کچھ دے دے
انشا سے ہزاروں ہیں انشا بھی سوالی ہے

اُم خدیجہ: کی ڈائری سے

سن لیا ہم نے
سن لیا ہم نے فیصلہ تیرا
اور سن کر اداس ہو بیٹھے
ذہن چپ چاپ آنکھ خالی ہے
جیسے ہم کائنات کھو بیٹھے
دھندلے دھندلے سے منظروں میں مگر
چھیڑتی ہیں تجلیاں تیری
بھولی بسری ہوئی رتوں سے ادھر
یاد آتیں ہیں تتلیاں تیری
دل یہ کہتا ہے ضبط لازم ہے
ہجر کے دن کی دھوپ ڈھلنے تک
اعتراف شکست کیا کرنا
فیصلے کی کھڑی بدلنے تک
دل یہ کہتا ہے حوصلہ رکھنا
سنگ رستے سے ہٹ بھی سکتے ہیں
اس سے پہلے کہ آنکھ بجھ جائے
جانے والے پلٹ بھی سکتے ہیں
اب چراغاں کریں ہم اشکوں سے
یا مناظر بجھے بجھے دیکھیں
ایک طرف تو ہے ایک طرف دل ہے
دل کی مانیں کہ اب تجھے دیکھیں
خود سے بھی کشمکش سی جاری ہے
راہ میں تیرا غم بھی حائل ہے
چاک در چاک ہے قبائے حواس
بے رفو سوچ، روح گھائل ہے
تجھ کو پایا تو چاک سی لیں گے
غم بھی امرت سمجھ کے پی لیں گے
ورانہ یوں ہے کہ دامن دل میں
چند سانسیں ہیں گن کے جی لیں گے

فرح عامر: کی ڈائری سے

سنا ہے اس محبت میں
بہت نقصان ہوتا ہے
مہکتا جھومتا جیون
غموں کے نام ہوتا ہے
سنا ہے چین کھو کر وہ
صبح و شام روتا ہے
محبت جو بھی کرتا ہے
بہت بدنام ہوتا ہے
سنا ہے اس محبت میں
کہیں بھی دل نہیں لگتا
بنا اس کے نگاہوں میں کوئی موسم نہیں جچتا
خفا اس سے محبت ہو وہ جیون بھر نہیں ہنستا
بہت انمول ہے وہ دل

☆☆☆

حنا کی محفل

عین غین

سعدیہ جبار ---- ملتان

س: باہر کا موسم اندر کے موسم سے کب ملتا ہے؟

ج: دل کی مراد بھر آنے پر۔

س: اگلے موسم بہار میں بھلا ہم کہاں ہوں گے؟

ج: ''ایک شخص کی لڑکی گھر سے بھاگ گئی۔ دوسرے دن وہ افسوس کرنے والے لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ ایک بات ہے کہ میری وہ لڑکی بڑی اللہ والی تھی بھاگنے سے ایک رات پہلے وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ ابا دو دن بعد ہمارے ہاں ایک شخص کم ہو جائے گا۔'' اب تم؟

س: ہر شوہر کو بیوی اچھی لگتی ہے مگر دوسرے کی کیوں؟

ج: اسی کو تو کہتے ہیں کہ گھر کی مرغی دال برابر۔

س: آپ کو کبھی کسی نے دن میں تارے دکھائے؟

ج: کیوں تمہارا ارادہ ہے۔

س: اگر انسان ریموٹ کنٹرول سے چلنے لگیں تو؟

ج: لگیں تو کیا مطلب 'ابھی بھی چلتے ہیں یقین نہیں آتا تو کسی بھی شوہر کو دیکھ لو۔

س: نفرت کی زمین پر بھی پیار لکھنے والے لوگ کیسے ہوتے ہیں؟

ج: اس دور میں تو پاگل ہی ہوتے ہیں۔

س: کس موسم کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے؟

ج: جس میں اندر اور باہر کا موسم یکساں خوشگوار ہو۔

آنسہ ممتاز ---- رحیم یار خان

س: السلام علیکم! جناب کیا کر رہے ہیں؟

ج: آپ کے سوال پڑھ رہا ہوں۔

س: ہمیں تو حنا کی محفل سے محبت ہے اور آپ کو؟

ج: محفل والوں سے۔

س: کبھی غصہ آیا؟

ج: بے تکے سوال پڑھ کر۔

س: کس بات پر زیادہ غصہ آیا؟

ج: جس بات پر بھی غصہ آیا۔

س: زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟

ج: برا مان جاؤ گی پڑھ کر۔

س: کیا دوستی پیار ہے؟

ج: نہیں۔

س: کیا زندگی گزارنے کے لئے لو میرج ضروری ہے؟

ج: اچھے بچے ایسی باتیں نہیں سوچتے۔

س: میرے بی اے کے پیپرز ہونے والے ہیں۔ دعا کریں گے۔

ج: کس کے لئے؟ تمہارے لئے یا ممتحن کے لئے۔

فریال امین ---- ٹوبہ ٹیک سنگھ

س: آداب عین غین جی کیسے مزاج ہیں؟

ج: اللہ کا شکر ہے۔

س: میرے بغیر کیسا رہا؟

ج: سچ سچ بتائیں۔ برا تو نہیں مانوں گی۔

س: عین غین جی تو مائنڈ بتائیں؟

ج: بہت سکون رہا۔

س: کیا کہہ رہے ہیں ادھر دیکھیں؟

ج: دیکھ تو رہا ہوں۔ میں ناک پر رومال رکھ لوں۔

نازیہ کمال ---- حیدر آباد

س: محبت کیا صرف ایک بار ہوتی ہے؟

ج: جی ہاں بعد میں عادت بن جاتی ہے۔

س: مکمل تنہائی کسے اچھی لگتی ہے؟

ج: جسے محبت ہو گئی ہو۔

س: حسن کو چاند کیوں کہتے ہیں؟

ج: اس تک رسائی جو مشکل ہے۔

س: عام طور پر تو شادیاں ہوتی ہیں؟

ج: شادیاں عام طور پر ہی ہوتی ہیں۔

س: محبت کیا ہے؟

ج: کیا تمہیں نہیں معلوم؟

س: روشنی کیا ہے؟

ج: لو یہ بھی بتانا پڑے گا۔

س: محبت میں کامیابی کا راز؟

ج: محبت کیا ہے تمہیں معلوم نہیں اور کامیابی کا راز پوچھنے لگے ہو۔

س: کسی سے پیار ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے؟

ج: علاج اپنے ماں باپ کے پاس جا کر۔

مریم رباب ---- خانیوال

س: میری آنکھوں میں دیکھو؟

ج: تمہیں نیند آ رہی ہے۔

س: اپنوں کی جدائی کیوں برداشت نہیں ہوتی؟

ج: ان کی عادت سی جو ہو جاتی ہے۔

س: زندگی میں انسان کی ہار کب ہوتی ہے؟

ج: جب اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو۔

س: انسان اپنی بے عزتی کب برداشت کر لیتا ہے؟

ج: جب اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔

س: ایک عورت کے لئے زندگی کا سب سے بھاری بوجھ کون سا ہوتا ہے؟

ج: جب تمہارے جیسے نکمے خاوند کا بوجھ اٹھانا پڑے۔

س: محبت کرنے کے لئے کیا چیز چاہیے؟

ج: دل۔

س: دنیا کی خوبصورت کیا چیز ہے؟

ج: دنیا خود بہت خوبصورت ہے۔

س: زندگی کی اداس راہوں میں؟

ج: خوشیاں بکھیر دو۔

ام خدیجہ ---- شاہدرہ لاہور

س: آداب عین جی! تو پھر کیا اظہار ویلنٹائن پر؟ کیا تو کیا ملا؟

ج: روز۔

س: یوں زندگی کی راہ میں ٹکرا گیا کوئی...... اب وہ بیچ راہ میں کہہ رہا ہے ہمیشہ کے لئے ''گڈ بائے'' اب میں کیا کروں؟

ج: راہ بدل لو۔

س: ''گھٹیا'' لفظ کا معنی تو لکھ دیں کہ کیا ہے؟

ج: لغت سے استفادہ کر لو۔

س: کیا اپنی محبت کو گھٹیا کہنے والے محبت کر سکتے ہیں کسی سے؟

ج: محبت کبھی گھٹیا نہیں ہوتی۔

س: کیا آپ نے کبھی کسی کی محبت کی توہین کی ہے؟

ج: نہیں۔

س: جب کوئی پیار سے بلائے گا...... تم کو......؟

ج: ایک شخص بہت یاد آئے گا۔

☆☆☆

عبداللہ

کامیابی ہو تو ایسی

بالی ووڈ کی دنیا میں جہاں ہر روز ایک سے بڑھ کر ایک خوشنما چہرہ سامنے آتا ہے، وہیں اس چمن میں پچیس برس سے ایک ایسا پھول خوشبو بکھیر رہا ہے جس کی تازگی شادابی اور رعنائی کو کوئی بھی ماند نہیں کر پایا، جی ہاں بات ہو رہی ہے سلمان خان کی جو اپنی عمر عزیز کے اڑتالیسویں سال میں بھی اتنا مقبول ہے جتنا جو بیس سال کی عمر میں تھا، اس وقت انڈین فلم نگری میں سلمان خان کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، فلم نگری میں جہاں اس کا معاوضہ سب اداکاروں سے بڑھ کر ہے وہاں چھوٹی اسکرین پر بھی معرکے بڑے بڑے ہیں کیا آپ یقین کریں گے کہ بگ باس سیون کے لئے سلمان خان نے جو معاوضہ حاصل کیا ہے وہ ہے ایک سو تیں کروڑ، یعنی فی ایپی سوڈ پانچ کروڑ، اب ایسے میں کون ہو گا جو سلمان خان بننا نہیں چاہے گا۔

روشن ستارہ

پچھلے تین سالوں سے سیٹلائٹ چینلز کے سب سے نمایاں ایکٹر کے طور پر ابھرنے والے اداکار فیصل قریشی ہے فیصل قریشی سلور اسکرین پر تو کوئی جادو نہیں دکھا پائے، مگر چھوٹی اسکرین کو تو جیسے اپنے سحر میں جکڑ لیا، ایسے ایسے بے مثال کردار فیصل کے کریڈٹ پر ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے، فیصل قریشی نہ صرف اپنی اپنی عمر کے ہی نہیں اپنی عمر سے چھوٹے اور بہت بڑی عمر کے کرداروں میں بھی ایسے رنگ بھرے کہ حقیقت سے کہیں دور دکھائی نہیں دیے، بڑی اسکرین پر ناکام ہونے والے فیصل نے ثابت کیا کہ بھلے ہی باکس آفس کا وہ ستارہ نہ ہوں مگر آسمان فن پر چمکنے والا ایک بے مثال روشن ستارہ ضرور ہے۔

آف کورس

شو بزنس کی خبریں ہوں اور میرا کا ذکر نہ ہو یہ

کیسے ہو سکتا ہے؟ آئے روز وہ کچھ نہ کچھ ایسا کرتی ہے کہ خبر کا موضوع بنے بنا رہ ہی نہیں سکتی، اب جیسا کہ آپ اس خبر کو ہی دیکھئے۔

کیا آپ یقین کریں گے میرا کی والدہ شفقت بخاری کی سیاسی تربیت کے لئے امریکی سینٹر ڈربن بہت جلد پاکستان آ رہے ہیں، یاد رہے یہ وہی ڈربن ہے جنہوں نے اوبامہ کے کسی فنڈ اکٹھا کرنے کے پروگرام کے لئے میرا سے مدد کی درخواست کی تھی اور ہماری انگلش بولنے کی دیوانی میرا کی دلچسپی کی وجہ سے تھوڑے ہی وقت میں ڈربن نے دو ملین امریکی ڈالرز حاصل کر لئے تھے سو اظہار تشکر کے طور پر وہ اب پاکستان آ کر میرا کی والدہ کو سیاست کے داؤ پیچ سکھائے گے یہی پر بس نہیں بلکہ اوبامہ بھی دلی طور پر میرا کے شکر گزار ہیں لہٰذا اکتوبر میں ہونے والی ضیافت جو وائٹ ہاؤس میں ہو گی میرا کو مدعو کیا گیا ہے یوں اپنی میرا، وائٹ ہاؤس میں جا کر امریکیوں پر اپنی انگلش کی دھاک بٹھانے والی ہے۔

ابھی ایسی نوبت نہیں آئی

لالی ووڈ میں کام نہ ہونے کے باعث، میرا اور لیلیٰ نے اسٹیج پر خوب اپنے جلوے بکھیرے جبکہ ریشم کو اپنا ایسا زوال گوارہ نہیں، کہ وہ اسٹیج پر جا کر لوگوں کی ہوس بھری نظروں کا سامنا کرے، ریشم کا خیال ہے کہ فلم انڈسٹری چونکہ دوبارہ سے سانس لینا شروع ہو گی ہے اور بہت جلد وہ کامیابی سے اٹھ کھڑی ہو گی لہٰذا ریشم کے لئے بھی گنجائش نکل ہی آئے گی، نہیں تو چھوٹی اسکرین تو ہے ہی جہاں سے اس کا فنی سفر شروع ہوا تھا، جب ریشم سے سوال کیا گیا کہ اپنی ساتھی اداکاروں کی طرح وہ اسٹیج پر کام کرکے، پیسے کیوں نہیں کما رہی تو ریشم نے کہا، ابھی اس پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ وہ اسٹیج پر کام کرکے جس طرح کے اسٹیج ڈرامے ہو رہے ہیں اس سے بہتر ہے وہ صبر کرکے گھر بیٹھ جائے۔

حسن و صحت

بابر محمود

لڑکی خواہ کالی ہو یا گوری اس کو اپنے چہرے کی تعریف اور خوبصورتی اچھی لگتی ہے اور وہ پرکشش اور جاذب نظر چہرے کے ساتھ آنا چاہتی ہے اور ہر ملنے والے سے وہ اپنے چہرے کے بارے میں تعریف سننا چاہتی ہے کہ ماشا اللہ کتنی خوبصورت چہرے کے مالک ہے ایسے میں اگر چہرے پر ایکنی کیل مہاسے نکل آئیں تو بہت پریشانی ہوتی ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چاند کو گرہن لگ گیا

آپ کو صحیح رہنمائی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے ہماری تحقیق اور تجربہ حاضر خدمت ہے اس سے بھرپور فائدہ اٹھائیں اور اس روگ سے نجات پائیں اور چہرے کو چاند سا بنائیں۔

ایکنی کیا مہاسے ان میں سے کوئی ایک عمل سے ہو سکتی ہے۔

- رات کا کھانا کھا کر سونا، رات کو دیر سے سونا یا نہ سونا۔
- گرم پانی سے غسل کر کے ایک دم ٹھنڈے میں آنا۔
- کوئی بھی ورزش کر کے ایک دم ٹھنڈے میں آنا۔
- پسینے میں ٹھنڈا پانی پینا یا ٹھنڈے میں آجانا۔

چہرے پر ہاتھ لگانا یا مساج کرنا یا نوچنا یا دبانا۔

چہرے پر آئلی اشیاء کا استعمال کرنا۔

ایکنی کیل مہاسوں کو آئینے میں بار بار دیکھنا۔

رات کو میک اپ اتارے بغیر سو جانا۔

ابلے ہوئے پانی کو کم استعمال کرنا۔

زیادہ سوچنا غصے میں رہنا تناؤ میں رہنا۔

جسم کی ضرورت سے زیاہ کھانا اور مشقت کم کرنا۔

چہرے پر مضر کیمیکل اشیاء کا استعمال کرنا۔

چہرہ دھونے کے لئے صابن کا صحیح انتخاب نہ کرنا۔

دانتوں کی صفائی کا خیال نہ رکھنا۔

تیز مرچ مصالحے اور دیر ہضم اور تلی ہوئی اشیاء کو زیادہ کھانا اور رات کو کھانا۔

پھلوں اور سبزیوں کا استعمال کم کرنا۔

ایکنی کیل مہاسے ان اشیاء کے استعمال سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

آئس کریم، چاکلیٹ، کھٹی سلانٹی، کھٹے چپس، گول گپے، ٹاٹری، کھٹی املی، برف کے گولے، کلفی، فریج کی جمی ہوئی برف، پیک ہوئے جوس اور بوتلیں، بازاری پکوڑے، سموسے، غیر معیاری شوارمے، غیر معیاری برگر، غیر معیاری کیچپ، کھٹی چٹنی اور سکرین والی مشروبات ان اشیاء کے استعمال سے گلا اور معدہ خراب ہوتا ہے،

- اگر آپ نے چہرے کا رنگ صاف کرنا ہے تو بیسن دو چمچ میں دودھ حسب ضرورت شامل کر کے کریم بنا کر چہرے پر پانچ منٹ مساج کریں اور نارمل پانی سے چہرے کو دھو لیں۔
- اگر آپ نے چھائیاں کو ختم کرنا ہے تو ملائی

ایک چمچ خشک دودھ ایک چمچ شامل کر کے اچھی طرح مکس کر لیں اور رات کو چہرے پر دس منٹ تک مساج کریں اور نیم گرم پانی سے چہرے کو دھو لیں۔

اگر آپ نے بلیک ہیڈز کو صاف کرنا تو شہد دو چمچ خشک دودھ ایک چمچ شامل کر کے کریم بنائے اور بلیک ہیڈز والی جگہ پر پانچ مٹ مساج کریں پھر پانچ منٹ وقفہ دیں اور گیلے ہاتھوں سے دو منٹ مساج کریں اور نیم گرم پانی سے چہرے کو دھو لیں۔

اگر آپ نے ایکنی کیل مہاسے ختم کرنے ہوں تو ملتانی مٹی ایک ایک چمچ بیسن ایک چمچ پھٹکری پاؤڈر 1/2 چمچ شامل کریں اور دن میں تین بار بیس منٹ تک چہرے پر لیپ کریں پھر سادہ پانی سے چہرے کو دھو لیں۔

آنکھوں کے حلقے دور کرنے کے لئے چاولوں کا آٹا دو چمچ عرق گلاب حسب ضرورت شامل کر کے کریم بنا لیں اور پھر آنکھوں کی جلد کے اوپر لیپ کریں خشک ہونے پر ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔

گرمیوں میں میک اپ بیس کو دیر تک قائم رکھنے کے لئے انڈے کی سفیدی ایک عدد، ملتانی مٹی ایک چمچ، بیسن ایک چمچ اور ٹالکم پاؤڈر دو چمچ شامل کرے کریم بنا لیں پھر چہرے پر لیپ کریں اور خشک ہونے پر ٹھنڈے پانی سے چہرے کو دھو لیں اور چہرے کو خشک کر کے میک اپ کریں۔

- اگر آپ نے جسم کے گرمی دانے ختم کرنے ہیں تو ملتان مٹی ایک چمچ، بیسن ایک چمچ، چاولوں کا آٹا ایک چمچ، مہندی ایک چمچ، عرق لیموں حسب ضرورت شامل کر کے کریم بنا لیں اور پھر پورے جسم پر لیپ کر کے پانچ منٹ وقفہ دیں پھر ٹھنڈے پانی سے جسم دھو لیں۔

اگر آپ نے چہرے کے رنگ کو گورا کرنا ہیں تو بیسن ایک چمچ، خشک دودھ ایک چمچ اور عرق گلاب حسب ضرورت شامل کر کے کریم بنا لیں اور پھر چہرے پر لگا کر پانچ منٹ تک مساج کریں دس منٹ وقفہ دیں اور پھر چہرے کو دھو لیں۔

اگر آپ نے فیشل ماسک بنانا ہے تو ملتانی مٹی ایک چمچ، بیسن ایک چمچ، چاولوں کا آٹا ایک چمچ خشک پاؤڈر ایک چمچ، کھیرے کا رس دو چمچ، ٹماٹر کا رس دو چمچ، عرق گلاب حسب ضرورت شامل کر کے اچھی طرح تمام کو مکس کر کے کریم بنا لیں اور چہرے پر خشک ہونے تک لیپ کریں پھر ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔

اگر آپ نے جلد کو ٹائیٹ کرنا ہے تو ملتانی مٹی دو چمچ پھٹکری 1/2 آدھا چمچ عرق گلاب، حسب ضرورت شامل کر کے کریم بنا لیں اور چہرے پر لیپ کر کے خشک ہونے دیں خشک ہونے پر ٹھنڈے پانی سے چہرے کو دھو لیں۔

افراح طارق

عیدالاضحیٰ کے پکوان

کھانے کے بغیر کوئی تہوار مکمل نہیں ہوتا، ادھورا پن محسوس ہوتا ہے۔

موقع کوئی بھی ہو خواتین کی ذمہ داریاں ہر مقام پر بڑھ جاتی ہیں، عیدالاضحیٰ کے موقع پر بھی خواتین کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اس کے باوجود خاتون خانہ نت نئی تراکیب کے کھانے تیار کر کے گھر والوں کی تعریفیں وصول کرتی ہیں اور مہمانوں کی تواضع میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں اس لئے حسب روایت عیدالاضحیٰ کے موقع پر کھانوں کی مختلف تراکیب پیش کر رہے ہیں جسے بنا کر آپ اپنے دسترخوان کی رونق میں اضافہ کر سکتی ہیں۔

کوئیک فرائڈ بڑے کا گوشت اور ہری پیاز

اشیاء

پیاز — چھ عدد (کترا ہوا)
ویجی ٹیبل آئل — تین کھانے کے چمچے
چلی سوس — آدھا چائے کا چمچہ
دنبے کی ران کا گوشت — ڈیڑھ پاؤنڈ
کارن فلور — آدھا کھانے کا چمچہ
سویا ساس — تین کھانے کے چمچے
لہسن (پسا ہوا) — ایک گٹھی

ترکیب

گوشت کا باریک ٹکڑوں میں کاٹ لیں ان پر کارن فلور، سویا سوس، چلی سوس چھڑک کر گوشت میں ڈال دیں، بڑے فرائی پین میں تیل بگھاریں، اس میں گوشت، لہسن ڈال کر تیز آگ پر دو منٹ اسٹرافرائی کریں، ہری پیاز ڈال دیں، مزید ایک منٹ فرائی کریں، اب اسے گرم گرم پیش کریں۔

بھنی ہوئی کلیجی

اشیاء

سویا ساس — دو کھانے کے چمچے
کارن فلور — آدھا کپ
بیکنگ پاؤڈر — آدھا چمچہ
کلیجی — آدھا کلو
آئل — دو کپ
پانی — آدھا کپ

ترکیب

کارن فلور، پانی اور بیکنگ پاؤڈر کا آمیزہ بنائیں اور کلیجی کی بوٹیاں آمیزے میں ملا دیں فرائی پین میں تیل گرم کریں، اس میں کلیجی کی بوٹیاں چھوڑ دیں، انہیں فرائی کریں یہاں تک کہ بادامی رنگ کی ہو جائیں ان کو پلیٹ میں ڈال دیں اور ان پر گرم مصالحہ چھڑک دیں اور مزے سے پیش کریں، مزے دار بھنی ہوئی کلیجی تیار ہے۔

چائنز اسٹائل کلیجی

اشیاء

کلیجی — ایک کلو

پیاز (چوکور پرت کاٹ لیں) — دو عدد
شملہ مرچ (چوکور کاٹ لیں) — دو عدد
گاجر (چوکور ٹکڑے کر لیں) — دو عدد
بند گوبھی — آدھا کپ
ہری پیاز — آدھا کپ
سویا ساس — دو چائے کے چمچے
سرکہ — دو چائے کے چمچے
چلی سوس — دو چائے کے چمچے
کیچپ — دو چائے کے چمچے
ٹماٹو پیوری — آدھا کپ
ادرک (باریک کٹی ہوئی) — حسب ضرورت
لہسن (باریک چوپ کیے ہوئے) — دو جوئے
تیل — آدھا کپ
نمک — حسب ذائقہ
کالی مرچ پاؤڈر — حسب ضرورت

ترکیب

تیل گرم کر کے ادرک، لہسن ڈال کر ہلکا سا فرائی کریں، ساتھ ہی کلیجی ڈال کر اسے اچھی طرح بھون لیں، جب کلیجی نرم ہو جائے تو اس میں آدھا کپ ٹماٹر پیوری ڈال کر مکس کریں، اس کے بعد کیچپ، چلی سوس، سرکہ، سویا ساس اور ساری سبزیاں ڈال کر اچھی طرح مکس کریں، اچھی طرح پک جائے تو کالی مرچ اور نمک ڈال کر مکس کریں اور اتار کر نوڈلز فرائیڈ رائس کے ساتھ سرو کریں۔

بکرے کا بھنا گوشت

اشیاء

گن پاؤڈر سوس — آٹھ کھانے کے چمچے
نمک — ایک چائے کا چمچہ
گارنی خوشبو — حسب ضرورت
بکرے کا گوشت — ایک کلو
یخنی — چھ کھانے کے چمچے
لہسن — دوٹھی

ترکیب

گوشت کی بوٹیوں کو بھاری سوس پین میں ڈالیں اور پانچ منٹ پانی میں ابلنے دیں، آدھا پانی نکال دیں تمام اشیاء اور مصالحے ڈال دیں، گوشت کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے آدھا گھنٹہ پکنے دیں، اس کے بعد سرو کریں۔

کریم نلی گوشت

اشیاء

مٹن گوشت — آدھا کلو
مٹن نلی — پانچ عدد
کوکونٹ کریم پاؤڈر — ایک پیکٹ
مٹن یخنی کیوبز — ایک پیکٹ
ادرک، لہسن کا پیسٹ — دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ کا پیسٹ — دو کھانے کے چمچے
کارن فلور — دو کھانے کے چمچے
کالی مرچ پاؤڈر — ایک کھانے کا چمچہ
چائنز نمک — ایک چائے کا چمچہ
فریش کریم — سو گرام
تیل — ایک کپ
نمک — حسب ذائقہ

ترکیب

گوشت اور نلی میں ہری مرچ پیسٹ، ادرک، لہسن کا پیسٹ، نمک اور دو گلاس پانی ڈال کر اتنی دیر پکائیں کہ گوشت گل جائے، جب پانی خشک ہو جائے تو چولہے پر سے اتار لیں، اس کے بعد دو گلاس پانی میں کوکونٹ پاؤڈر، کارن فلور اور یخنی کیوبز ڈال کر اچھی طرح حل کر کے تقریباً پندرہ منٹ کے لئے پکائیں۔

تیل گرم کر کے اس میں پکے ہوئے مٹن کو

فرائی کریں، گولڈن براؤن ہونے پر اس میں کارن فلور کا آمیزہ، کالی مرچ پاؤڈر اور چائنز نمک ڈال کر پانچ منٹ کے لئے پکائیں، تیار ہو جائے تو فریش کریم ڈال کر سرو کریں۔

بوائلڈ مٹن لیگ

اشیاء

بکرے کی ران	ایک عدد
(چربی وغیرہ صاف کر کے دھولیں)	
پیاز (چھیل کر سلائس کاٹ لیں)	دو عدد
لہسن (چھیل کر چوپ کرلیں)	ایک پوتھی
لونگ	چھ عدد
ثابت سیاہ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پارسلے (چوپ کرلیں)	ایک گٹھی
پودینہ	ایک گٹھی
مکھن	چار کھانے کے چمچے
میدہ	چوتھائی کپ
مسٹرڈ پیسٹ	دو چائے کے چمچے
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
دودھ	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	حسب ضرورت
گاجر (چوپ کرلیں)	دو عدد

ترکیب

ایک بڑے پتیلے میں ران رکھیں اور اس میں پانی ڈال کر اسے پانی سے کور کردیں، پیاز، لہسن، گاجر، لونگ، ثابت سیاہ مرچ، پارسلے، پودینہ اور نمک ڈال کر ڈھکن ڈھک کر درمیانی آنچ پر تین سے چار گھنٹوں کے لئے پکائیں، گوشت گل جانے کے بعد چولہا بند کردیں اور دو کپ یخنی نکال لیں۔

ایک نان اسٹک سوس پین میں مکھن گرم کر کے اس میں مسٹرڈ پیسٹ اور میدہ ڈال کر چمچہ چلائیں، دو کپ الگ کی ہوئی یخنی ڈال کر مکس کریں، ابال آنے کے بعد اس میں سرکہ، دودھ اور سیاہ مرچ پاؤڈر شامل کریں، ران کو سرونگ ڈش میں رکھیں اور اس کے اوپر تیار کی ہوئی سوس ڈالیں مزے دار بوائلڈ مٹن لیگ تیار ہے، سلاد کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

مصالحے دار دہی والی چانپ

اشیاء

چانپ	ایک کلو
لہسن (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا (پسا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ
کالی مرچ (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
دہی	آدھا کلو
پیاز (پسی ہوئی بڑے سائز کی)	دو عدد
ادرک (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
گھی	ایک پاؤ

ترکیب

دہی کو اچھی طرح پھینٹ لیں، تمام پسے ہوئے مصالحے دہی میں ملا دیں۔

اب چانپ کو اچھی طرح دھولیں اور ان کو مصالحے ملے دہی میں ڈبو دیں، کم از کم آدھا گھنٹہ ان کو پڑا رہنے دیں تاکہ مصالحہ جات اچھی طرح چانپوں میں جذب ہو جائے، ساس پین کڑاہی میں گھی کو گرم کریں اور اس میں چانپیں ڈال کر تل لیں، لذیذ مصالحے دار دہی کی چانپ تیار ہے، سلاد اور چٹنی کے ساتھ تناول کریں۔

اچار کے مصالحے والا قیمہ

اشیاء

قیمہ (باریک)	ایک کلوگرام
نمک	حسب ذائقہ
لہسن (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر	آدھا کلوگرام
ہری مرچ (ثابت)	چھ عدد
ہلدی (پسی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
میتھی کے دانے	چھ عدد
سفید زیرہ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
ادرک (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
کلونجی	ایک چائے کا چمچہ
کڑی پتہ	چھ عدد
سرخ مرچ (پسی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
پیاز (درمیانہ باریک کٹی ہوئی)	دو عدد
تیل پکانے کے لئے	آدھی پیالی

ترکیب

دیگچی میں تیل ڈال کر گرم کریں، زیرہ، کڑی پتہ اور میتھی دانہ ڈال کر سیاہ کریں، جب سیاہ ہو جائیں تو پیاز ڈالیں اور ہلکی بادامی کریں، جب پیاز ہلکی بادامی ہو جائے تو اس میں ادرک، لہسن، مرچ اور ہلدی ڈال دیں، مصالحے کو ہلکا سا بھون کر قیمہ ڈال دیں، حسب ضرورت پانی ڈال کر قیمہ گلا لیں، اب اس میں کلونجی، ٹماٹر اور ثابت ہری مرچ ڈال دیں، ان سب کو اچھی طرح بھونیں اور اتار لیں۔

بھنا ہوا قیمہ ہرے مصالحے کے ساتھ

اشیاء

قیمہ (ہاتھ کا بنا ہوا)	آدھا کلو
سرخ مرچ پاؤڈر	کھانے کا ایک چمچہ
پیاز (باریک لچھے دار)	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
لہسن پیسٹ	آٹھ جوئے
ہرا دھنیا (باریک کترا ہوا)	آدھی گٹھی
گھی/تیل	آدھا کپ
دھنیا پاؤڈر	کھانے کا ایک چمچہ
پیاز (پسی ہوئی)	ایک عدد
ہلدی پاؤڈر	چائے کا چوتھائی چمچہ
ادرک (باریک لمبائی کے رخ کٹی ہوئی)	دو انچ کا ٹکڑا
ہری مرچ (لمبائی کے رخ باریک کتری ہوئی)	چھ عدد یا حسب پسند

ترکیب

گھی، تیل کو ایک دیگچی میں گرم کرلیں اور اس میں باریک کٹی ہوئی پیاز ڈال دیں، جب پیاز ہلکی بادامی ہو جائے تو نکال لیں، پیاز نکال کر اسی گھی، تیل میں تمام پسے ہوئے مصالحے ڈال کر بھونیں، ساتھ ساتھ پانی کا چھینٹا دیتے جائیں۔

جب مصالحہ اچھی طرح بھن جائے اور گھی، تیل چھوڑ دے تو اس میں قیمہ ڈال کر بھونیں، جب قیمہ اچھی طرح بھن جائے تو اس میں ایک کپ پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے دیں، جب پانی خشک ہو جائے تو قیمہ کو دوبارہ بھوننا شروع کریں، اگر قیمہ گل گیا ہے تو اس کو بھونتے رہیں ورنہ اس میں مزید تھوڑا سا پانی ڈال کر گلنے دیں، جب قیمہ گل جائے تو اس کو خوب بھونیں، جب قیمہ تیل، گھی چھوڑ دے تو اس میں تلی ہوئی پیاز، ادرک، ہری مرچ اور ہرا دھنیا ڈال کر اتار لیں اور سرو کریں۔

☆☆☆

فوزیہ شفیق

السلام علیکم!

اکتوبر کے شمارے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں آپ سب کی صحت وسلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔

آج ہم جس دور میں سانس لے رہے ہیں وہ تاریخ کا ایسا دور ہے جس میں ہر طرف خوف و دہشت کی حکمرانی ہے، ہم ذہنی خلفشار اور بے سکونی کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں، ہر فرد دوسرے سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہے خود کوئی بھی مسیحا بننے کی کوشش نہیں کرتا، ہر کوئی اپنے آپ کو محبتوں کا طالب وتشنہ سمجھتا ہے، ہمیں اپنے غم اور دوسروں کی خوشیاں بڑی لگتی ہیں اور دوسروں کے غموں اور اپنی خوشیوں کو ہم بہت حقیر خیال کرتے ہیں یہ سوچ کر کہ ہمیں ہمارا حق نہیں مل رہا، بس یہی مسئلہ ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حقوق کا پورا ہونا فرائض سے مشروط ہے، جب تک ہم دوسروں کا خیال نہیں کریں گے ہمیں حق کہاں ملے گا اور نہ ہی یہ معاشرہ انسانی طرز حیات کا نمونہ بنے گا۔

دوسرے کے جذبات کا احترام کریں یہ ہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے، اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے گا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ وامان میں رکھے آمین۔

آیئے اب آپ کے خطوط کی طرف چلتے ہیں یہ پہلا خط ہمیں سامعہ حیدر کا نارووال سے ملا ہے وہ لکھتی ہیں۔

ستمبر کا شمارہ ساتھ تاریخ کو ملا، ٹائٹل پر نیلم منیر بڑی پیاری لگ رہی تھی، سردار انکل کی باتوں پر غور کرتے آگے بڑھے اور حمد ونعت اور پیارے نبی کی پیاری باتوں سے مستفید ہوتے ہوئے انشاجی کے ساتھ برستی بارش کا لطف اٹھایا، نیلم منیر سے ملاقات پسند نہیں آئی تو ہم نے بوریت دور کرنے کے لئے فوزیہ غزل کی تحریر میں کھو گئے چونکہ اس وقت سے جب باقی آئندہ لکھا نظر آیا، واہ فوزیہ جی کیا کمال لکھتی ہیں آپ لفظوں کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے آپ کی تحریر میں، اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابیوں سے نوازتا رہے آمین۔

کنول ریاض کی تحریر ایک عرصہ بعد نظر آئی پہلے یہ بتائیں کہ آپ کہاں غائب تھیں اتنا عرصہ طویل ناول تھا آپ کا، آغاز بے حد اچھا کیا تھا آپ، لیکن افسوس کہ پلاٹ پر آپ کی گرفت کہیں کہیں خاصی کمزور تھی، ایسا کیوں؟ آپ کا شمار تو بہترین لکھنے والوں میں ہوتا ہے، فرحت عمران کا ناول بھی کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ سکا، ''کاسہ دل'' اس کی مرتبہ پھر غائب تھا، سندس جبیں اگر یونہی دو ماہ لکھ کر تیسرے ماہ غائب ہوں گی تو اپنا امیج خراب کریں گی، شاید وہ بھول رہی ہیں کہ کہانی میں تسلسل ہی تحریر کی کامیابی ہوتی ہے ایک ماہ کی بجائے جب دو ماہ کا وقفہ آجائے تو قاری بھی بھول بھال جاتا ہے، خالدہ نثار کا ناولٹ ''ہم ہیں آپ کے'' پسند آیا، افسانوں میں حمیرا خان، نسرین خالد کے افسانے بہترین تھے، جبکہ روبینہ سعید کا افسانہ اگرچہ موضوع کے لحاظ

سے پرانا تھا لیکن مصنفہ نے اچھا لکھا، روبینہ جی ایسا صرف افسانوں، کہانیوں کی حد تک ہوتا ہے حقیقت میں اگر ایک بار قدم گھر سے نکل جائے تو واپس پلٹنا ناممکن ہی ہوتا ہے، سباس گل کا افسانہ قطعاً پسند نہیں آیا، سباس جی عید خوشیوں کا موقع ہے کیا ضروری تھا کہ آپ اتنا تلخ لکھتی، خوشی کو انجوائے کیا کریں نا کہ؟ ثمینہ بٹ کی تحریر بھی بے حد اچھی تھی، یسی جی اس پر بانو قدسیہ کی ''راجہ گدھ'' کے ساتھ نظر آئیں، تبصرہ خاصا جاندار تھا، اس کے علاوہ بقیہ تمام سلسلے بھی اپنی اپنی جگہ بہترین تھے۔

آپی میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں اگر آپ نے اس محفل میں جگہ دی تو انشا اللہ آئندہ بھی حاضر ہوں گی۔

سامعہ حیدر اس محفل میں خوش آمدید، ستمبر کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ آپ کی تعریف و تنقید ان سطور کے ذریعے مصنفین کو پہنچائی جارہی ہے، ہم آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہے گے، شکریہ۔

ثمینہ بٹ: لاہور سے لکھتی ہیں۔

اس ماہ کا حنا کی شاندار، زبردست، بہترین، سردار سر کی باتیں بے مثال ہوتی ہیں، ان کی گہری نظر لحہ بہ لحہ بدلتے حالات پر ہوتی ہے اور وہ ہمیں بھی اس سے باخبر رکھتے ہیں، بہت شکریہ سر جی، اسلامیات والا حصہ ہمیشہ ہی بڑا، ایمان افروز اور دل کو چھونے والا ہوتا ہے، حمد ونعت، پیارے نبی کی پیاری باتیں، دل کو بے حد سکون بخشتی ہیں اور حنا کی شان، ''انشا نامہ'' ہمیشہ کی طرح شاندار نیلم منیر سے ملاقات بس ٹھیک ہی تھی اور جی پھر آگے سلسلے وار ناولز، ارے یہ کیا؟ یہ معاذ اور پرنیاں کے بیچ کیسا چکر چل گیا؟ اور جہان، زینب اور ژالے کا ٹرائی اینگل اب کس طرف جارہا ہے بڑا سپنس ہے بھئی اور دوسری طرف فوزیہ غزل، سعیہ اور اریبہ کی مشکلات جانے کب ختم کریں گے، بہرحال دونوں ناولز اپنے مخصوص رنگ اور رفتار کے ساتھ اچھے جارہے ہیں۔

افسانے اس بار سب ہی اچھے تھے مگر مجھے ''ایاک نعبدو'' سب سے زیادہ پسند آیا، گو موضوع پرانا تھا، مگر انداز بیان بہت خوبصورت اور دل پر گہرا اثر چھوڑ گیا، ''کاسہ دل'' کی کمی محسوس ہوئی اور باقی کے ناولز، ناولٹ ابھی پڑھے نہیں، یقیناً اچھے ہی ہونگے، تمام مستقل سلسلے بھی زبردست تھے اور ہاں عید سروے میں تمام مصنفین کے جوابات بہت مزے کے تھے، اوور آل اس بار کا حنا بھی زبردست رہا۔

یسی کرن اس بار ''راجہ گدھ'' لائیں، بانو آپا کی یہ کتاب میری موسٹ فیورٹ ہے اور میں نے بھی اسے کئی بار پڑھا اور واقعی ہر بار کچھ نہ کچھ نیا پایا، بہت خوب، یسی آپ کی سلیکشن ہمیشہ کی طرح لاجواب تھی، میں آپ سے فرمائش کروں تو آپ پوری کریں گی؟ آپ ایم اے راحت کی ''کالا جادو'' کرنل مشتاق یوسفی کی تصانیف اور صدیق سالک کی کسی کتاب پر اپنے انداز میں تعارف دیں، فوزیہ جی میری باقی تحریریں ''نصیب'' اور ''دیر لگی آنے میں'' کب جگہ پائیں گی حنا میں بتایئے گا ضرور پلیز۔

ثمینہ بٹ صاحبہ کیسی ہیں آپ؟ دعا گو ہیں کہ اللہ پاک آپ پر اپنی خاص رحمت کرے آمین، ستمبر کے حنا کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی تحریریں انشاللہ باری آنے پر شائع ہو جائیں گی، الیکشن کے حوالے سے جو تحریر لکھی وہ ضرور بھجوادیں اس میں اجازت والی کون سی بات ہے، مستقل سلسلوں میں اگلے ماہ آپ کی تحریریں

شامل کی جائیں گی، اپنا خیال رکھیے گا اور اس محفل کو رونق بخشتی رہیے گا شکریہ۔

ثمینہ شیخ: جڑانوالہ سے لکھتی ہیں۔

ٹائٹل پر ماڈل اپنی تمامتر دلکشی و رعنائی سمیت جلوہ افروز تھی "کچھ باتیں ہماریاں" میں سردار صاحب جو ملکی حالات پر تبصرہ کرتے ہیں، دراصل وہ تلخ حقیقتیں ہیں جن سے بچنے کے لئے ہم اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں کیونکہ ہر بار کی طرح اس بار بھی چناؤ غلط ثابت ہوا دیکھتے ہیں اب کے نئے حکمران پاکستان اور پاکستانیوں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبولؐ سے مستفید ہو کر پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھی ہر بار کی طرح پڑھ کر ایسے لگا جیسے ہم نے ابھی اسلام کا ایک ورق بھی نہیں پڑھا کیونکہ جتنا احادیث کا قرآن کا مطالعہ کریں تشنگی، جستجو اور تلاش مزید بڑھتی رہتی ہے ابن انشاء کے کالموں کے بارے میں کیا لکھوں انہیں پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے انہیں ہمارے آج کے زمانے میں ہونے والے واقعات، حادثات کے بارے میں الہام تھا کہ ان کی تحریر پڑھتے وقت محسوس ہی نہیں ہوتا وہ ان کے زمانے کی بات ہے یا موجودہ دور کی۔

نیلم منیر کے بارے میں انٹرویو پڑھ کر اچھا لگا مجھے اس کی مسکراتی آنکھیں بہت اٹریکٹ کرتی ہیں۔

اپنا فیورٹ سلسلے وار ناول "آخرہ جزیرہ" پڑھا اس دفعہ کی قسط تو بہترین تھی ہر منظر کو ام مریم نے یوں ڈیکوریٹ کیا کہ بار بار پڑھنے کا دل چاہا چاہے وہ گلابی گڑیا ژالے کا سوگوار سراپا ہو چاہے زینب بلیک جھلملاتی ساڑھی میں ملبوس ہو، پرنیاں بن جل مچھلی کی طرح معاذ کی بانہوں میں تڑپتی ہوئی یا جہان کی شخصیت کی سحر انگیزی ہو کہ معاذ کا بے مثل جمال ہو ہر کردار اور سین بہت جاندار تھا لیکن اس قسط کا اختتام بہت سے سوالیہ نشان چھوڑ گیا جن کے جواب ڈھونڈنے کے لئے اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا، بس آخری جملوں میں ایک نادیدہ سے نقصان کی بو آ رہی تھی، فوزیہ غزل نے اپنے ناول میں مذہب اسلام کے ٹاپک پر لکھ کر بہت اچھا کام کیا ہے فوزیہ جی ایک ناولٹ بھی لکھ کر دیں، بالکل ایسا لکھیں جب پہلے پہل لکھا تھا، ہلکے پھلکے مزاح پہ مبنی ناولٹ (ہم ہیں آپ کے) خالدہ نثار نے کھنی دھوپ میں سایہ کر دیا، ام ہانی کا کردار اکثر ہی ہمارے وڈیرہ شاہی نظام میں آپ کو نظر آئے گا، مگر قسم کی حرمت کا پاس کوئی کوئی رکھتا ہے، سائرہ غفار نے اپنے ہی معاشرے کی تلخ حقیقت سے پردہ اٹھا کر بہت اچھا کام کیا، کنول ریاض ایک منجھی ہوئی رائٹر ہیں ان کا مکمل ناول بھی ہمارے معاشرے کی تصویر تھا لیکن محبت کے رنگ بھر کر کنول نے تصویر کا دوسرا رخ خوبصورت بنا دیا۔

فرحت عمران کا "عیدرت" بہت خوبصورت ناول تھا انہوں نے بڑی خوبصورتی سے واضح کیا بلکہ نفع و نقصان بھی جتا دیا "کہ محبت انسانوں سے ہوتی ہے چیزوں سے نہیں رشتوں سے ہوتی ہے اسٹیٹس سے نہیں، روبینہ سعید کا افسانہ "بھٹکے ہوؤں کے لئے" چراغ کی مانند تھا، سباس گل "میٹھی سویاں" بہت اچھا تھا مگر مزاح سے بھرپور بھی کوئی تحریر ہمیں دیں، "کتاب نگر" سے سیمی کرن کا تبصرہ لفظوں کا ایک خوبصورت عالم ہوتا ہے مگر راجہ گدھ پہ تبصرہ بہت ہی شاندار اور جاندار تھا بے شک راجہ گدھ کے کردار بانو آپا ایسے تخلیق کیے ہیں کہ وہ ہر دور میں چلتے پھرتے نظر آئیں گے شکریہ۔

ثمینہ شیخ جی خوش رہیں، آپ کے جذبات کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں، ستمبر کا حنا آپ کے ذوق پر پورا اترا ہمارے لئے یہ بات باعث خوشی ہے، آپ لوگوں کی حوصلہ افزائی اور پسندیدگی ہمارا انعام ہے، قارئین کی تعریف و تنقید حنا کو مزید بہترین بنانے میں ہماری مددگار ثابت ہوتی ہے، آپ کی تحریر انشا اللہ جلد شائع کریں گے اپنی رائے سے آئندہ بھی اگاہ کرتی رہیے گا شکریہ۔

حنا مہر رجوعہ: سادات سے لکھتی ہیں۔

میرا پورا نام حنا مہر ہے اور میرے گاؤں کا نام رجوعہ سادات ہے، آپی میں ایک سچی کہانی لکھنا چاہتی ہوں کسی کے نازک سپنوں کی جو کہ اپنوں کی ہی ٹھوکروں سے ٹوٹ گئے اس لڑکی کا احوال لکھنا چاہتی ہوں جو کہ رشتوں پے یقین اور مان کرنے والی تھی مگر انہی رشتوں کی بھینٹ چڑھ گئی پلیز مجھے ایک موقع دیجیے گا، میں اپنی کہانی لکھنا چاہتی ہوں تا کہ کوئی اور میری طرح نہ ٹوٹ کے بکھرے نازک دل والی لڑکی کے نازب خواب جو کہ اس کی زندگی کا حاصل تھے کسی کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئے پلیز آپی حنا کو حنا میں جگہ ضرور دیجیے گا شکریہ۔

حنا مہر خوش آمدید حنا ڈیئر مستقل سلسلوں کے سلسلے میں اگر آپ کا انتخاب ہم تک پہنچا تو ضرور شائع ہوتا، آپ نے جو تحریر لکھی ہے وہ ہمیں بھجوا دیں قابل اشاعت ہوئی تو انشا اللہ ضرور شائع ہوگی اور ہاں ایک بات آپ کے لئے جہاں مایوسی کے اندھیرے ہو وہاں ہی امید کی کرن بھی پائی جاتی ہے بس بات صرف تلاش کرنے کی ہے انشا اللہ آپ کے حصے کی خوشیاں آپ کو ضرور ملے گی بس آپ خود کو پرامید رکھیں اپنا خیال رکھنا اور اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا شکریہ۔

عشنا بھٹی: ڈیرہ غازی خان سے لکھتی ہیں۔

سرورق پر دلہن کے روپ میں نیلم منیر غضب ڈھا رہی تھیں، شروعات ہمیشہ کی طرح "کچھ باتیں ہماریاں" سے کی جہاں انکل کی باتوں سے میں سو فیصد متفق ہوئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ملک کے حالات جوں کے توں ہیں۔

مہنگائی کا جن حد سے زیادہ بے قابو ہو گیا ہے، لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ بھی طویل ہو گیا ہے، اس کے باوجود بجلی کا بل دیکھ کر چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔

مرحومہ آنٹی کے لئے ڈھیروں دعائیں، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام فرمائے، آمین۔

پیارے نبی کی پیاری باتیں، سے مستفید ہو کر اپنی ہارٹ فیورٹ فوزیہ غزل کے ناول "وہ ستارہ صبح امید کا" میں انٹری ماری تو حق دق رہ گئی، یہ قسط سپنس سے بھرپور تھی، اریبہ کی حالت دیکھ کر آنکھیں چھلک پڑیں۔

کچھ بھی ہوتا اریبہ عزت جیسی انمول چیز کا سودا کبھی نہ کرتی،، میں سمجھتی ہوں لڑکیوں کے پاس یہی ایک قیمتی اثاثہ ہے جس پر کبھی بھی سمجھوتا نہیں کرنا چاہیے وہاج کا اتنی دیر سے پچھتانا ایک آنکھ نہ بھایا، صبا کی انٹری کوئی نیا گل کھلائے گی یقیناً، کہیں سعیہ کا کھائی میں گرنا اریبہ کے لئے فائدے مند تو نہیں؟

فوزیہ غزل جی لگتا ہے آپ کے دماغ میں کمپیوٹر فٹ ہے، جس طرح آپ واقعات کو تواتر اور شگفتگی سے بیان کرتی ہیں یہ آپ کا ہی خاصہ ہے، معاشرے کی عکاسی کرتی ایک منفرد تحریر ہے،

جس کا کوئی ثانی نہیں اس میں سیکھنے کو بہت کچھ ہے۔

سندس جبیں کو نا پا کر مایوسی ہوئی ''کیا ہے ڈیئر انتظار کی سولی پر چڑھا دیتی ہیں اور مجھ میں بھی بری عادت ہے کہ انتظار نہیں ہوتا۔''

مکمل ناول میں فرحت عمران ''عید رت آئی پیا'' کنول ریاض ''محبت لامحدود ہوتی ہے'' دونوں ہی پرفیکٹ ناول تھے میری جانب سے آپ دونوں کو مبارکباد۔

ام مریم کا ناول ''تم آخری جزیرہ ہو'' بھی کافی دلچسپی لئے ہوئے ہے، اب پرنیاں کی بے رخی یقیناً معاذ کو تڑپائے گی اور ثر...... ثرالے تو ایسے خاموش تھی جیسے کہ محترمہ کی بیٹری لو ہوگئی ہے مجھے بالکل اچھی نہیں لگتی۔

ام مریم جی یاد رہے نیلما ثرالے کی ممی تھیں، جس کو آپ نے نجانے کون سے کونے کھدرے میں ڈال دیا ہے، جلدی سے اس کی واپسی کریں، تیمور کی آوارگیاں مجھے زہر لگتی ہیں زینب کی اس سے جلدی سے جان چھڑائیں پلیز، سٹار پلس کا ریکارڈ تو آپ شاید توڑنے کا عہد کر چکی ہیں، کہانی کو طویل دے کر تو اینڈ ایسا کیجئے گا جو ہم سوچ بھی نہ سکتے ہوں ورنہ کوئی مزہ نہیں آئے گا۔

ناولٹ میں خالدہ نثار چھائی رہیں، افسانوں میں سباس گل کی ''میٹھی سویاں'' نے آنکھیں نم کر دیں۔

''ایاک نعبدو'' روبینہ سعید کی سبق آموز تحریر تھی، ایسی تحریریں معاشرے کی اصلاح کرتیں ہیں، ویری ویلڈن روبینہ جی۔

سائرہ غفار کی ''ام ہانی'' بھی اچھی کاوش تھی، چھوٹی سی بات کو انا کا مسئلہ بنا کر جہالت کا مظاہرہ کیا گیا، سنا ہے اس محبت میں حمیرا خان بھی تھی اچھا لگا، ثمینہ بٹ کی ''ہلچل'' اچھی لگی۔

نسرین خالد کا ''وہ اک لمحہ'' جس میں آپ نے قارئین کو متقید کرنے کی کوشش کی اور کامیاب رہی، ''کتاب نگر'' سے راجہ گدھ کا انتخاب کر کے سیمی کرن نے محفل ہی لوٹ لی۔

بیاض میں تمام بہنوں کے اشعار دل چھو لینے والے تھے، باقی تمام سلسلے بھی خوب تھے۔

فوزیہ آپی آپ کی باتوں سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے، ظل ہما آپ کی آمد اچھی لگی، شکریہ کی کوئی بات نہیں آپ اچھا لکھتی ہیں اور تعریف ڈیزرو کرتی ہیں، سارا نعمان ڈیئر آپ نے رس ملائی تو بنا ڈالی مجھے دعا بھی دی یا مفت میں تعریفیں سمیٹ لیں، اور یہ کیا آپ نے فوزیہ غزل کو ناول اختتام کرنے کی فرمائش کی ڈیئر یہی ناول تو پڑھنے کا نہیں بلکہ سمجھنے کا ہے، شاید آپ نے سمجھنے کی کوشش نہیں کی، فوزیہ آپی میں نے آپ کو دو تحریریں بھجوائی تھیں ان میں ایک بقرہ عید کے حوالے سے تھی پلیز ضرور شائع کیجئے گا۔

عشا بھٹی خوش آمدید ہمیشہ کی طرح اس ماہ بھی آپ نے حنا کی تحریروں پر بڑا زبردست تبصرہ لکھا، تمام مصنفین کی طرف سے شکریہ قبول کریں آپ کی تحریریں مل گئی ہیں انشا اللہ کوشش کریں گے کہ جلد شائع کریں عیدالضحیٰ کے حوالے سے تحریر کافی لیٹ ملی اس لئے شائع ہونے سے رہ گئی جس کے لئے ہم آپ سے معذرت خواں ہیں، اگلے ماہ آپ کی محبتوں کے منتظر رہے گے شکریہ۔

☆☆☆